جتنے پاس اتنے دور

دھیریندر سنگھ جفا

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 066

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں کے باعث انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ ملا ہے بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا گیا ہے جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے ہیں۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل اور ان کے خالق سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو بنیادی شاخیں ہیں۔ ایک باطنی علوم تو دوسرے ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس کتابوں اور پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، صوفی سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر ہے۔ تاریخ و فلسفہ، سیاسیات، اقتصادیات، سماجیات اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو نہ صرف پورے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل چکے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام و خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی

پوری توجہ صرف کی ہے۔

دھیریندر سنگھ جفا کی کتاب '' جتنے پاس اتنے دور'' کا ترجمہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کتاب کے مترجم جناب شاہد جمال کا میں شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کا سلیس و نفیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

قوی امید ہے کہ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ زیر نظر کتاب کے بارے میں قارئین کی آرا اور تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

ڈاکٹر علی جاوید
ڈائرکٹر

دو لفظ

یہ تخلیق سب سے پہلے انگریزی میں ''تھری کنٹریز: وَن پیپل — میلس فرام ٹو وارس''
کے عنوان سے بیسویں صدی کے اواخر میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ایرفورس کے اسکواڈرن
لیڈر مسٹر بی۔ڈی۔ ٹہانے بنگلہ میں ترجمہ بھی کیا جو اکیسویں صدی کے اوائل میں شائع ہوا۔ ادھر
کافی عرصے سے وہ احباب جنھوں نے یہ کتاب انگریزی میں پڑھ رکھی تھی، ہندی اور اردو دونوں
زبانوں میں اس کے ترجمے کا مسلسل اصرار کر رہے تھے، بہت دنوں تک تو میں ٹالتا رہا لیکن جب یہ
اصرار حد سے گزرنے لگا تو میں نے خود ہی اسے ہندی میں دوبارہ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے تو زمانہ
طالب علمی سے ہی انگریزی کے استعمال میں رہنے کی وجہ سے مادری زبان میں لکھنا پڑھنا تقریباً
بھول چکا تھا لیکن اس سلسلے میں میرے جوان العمر ساتھی سید مزمّل فدا نے قدم قدم پر میری
رہنمائی کی اور یہ مہم اپنے انجام کو پہنچی۔

ہاں! اردو میں اس تخلیق کا ترجمہ میرے لیے مسئلہ تھا۔ مجھے اس زبان کی شیرینی سے اس
قدر لگاؤ ہے کہ میری بول چال میں تو ے فیصد الفاظ اردو کے ہی ہوتے ہیں لیکن فارسی رسم الخط
سے ناواقفیت کی بنا پر میں یہ کام خود نہیں کرسکتا تھا۔ ویسے بھی ہندی سے اردو ترجمے کا حق سلیقے سے
وہی ادا کرسکتا ہے، جسے ہندی اور اردو دونوں پر خاصا عبور حاصل ہو۔ بھگوان کا شکر ہے کہ لکھے
پڑھے لوگوں سے ہمیشہ ہی ایک ربط خاص رہا ہے اور شاہد جمال بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی
ہیں وہ انھوں نے میری درخواست قبول فرمائی اور آج '' جتنے پاس اُتنے دور'' آپ کے سامنے
ہے۔ شاہد جمال نے میرے افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ میرے تجربات و مشاہدات کو اردو جیسی
سیکولر زبان کے حوالے کیا۔ یہ کوشش کیسی ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کو اور صرف آپ ہی کو کرنا ہے۔

دھیریندر سنگھ جفا

کچھ مجھ سے بھی......

مجھے افسوس کے ساتھ ساتھ یہ اعتراف بھی ہے کہ میں نے جناب دھیریندر سنگھ جفا کی ''جتنے پاس اتنے دور'' انگریزی میں نہیں پڑھی لیکن ان کی یہ کاوش جب میرے سامنے دیوناگری میں آئی تو میں اس قدر متاثر ہوا کہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگوں کے توسط سے موصوف نے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو جس سلیقے سے زبان عطا کی ہے کم سے کم ایک فوجی سے امید ہی نہیں کی جاسکتی۔ اس کتاب میں ایسے بہت سے واقعات پڑھنے کو ملے جنھوں نے مجھے صرف جھنجھوڑا ہی نہیں بلکہ رلایا بھی۔ سچائی یہ ہے کہ میں آج بھی پوری طرح اس کرب سے خود کو الگ نہیں کر پایا ہوں۔

جفا صاحب کا یہ بڑپن ہے کہ انھوں نے مجھ سے اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ حالانکہ میں نے کبھی خود کو ایسے کاموں کا اہل نہیں سمجھا لیکن محترم کی خواہش بھی میرے نزدیک وہ حیثیت رکھتی ہے جس کا احترام کرنے کے علاوہ دوسرا چارہ نہیں ہوتا۔ سو موصوف کی دعاؤں اور شفقتوں کی رہنمائی میں جو بھی ہو سکا، جیسا بھی بن پڑا، اس یقین کے ساتھ پیشِ خدمت ہے کہ یہ کتاب اپنے قارئین کو بہت سے تجربات سے دوچار کرنے کے علاوہ موجودہ سیاسی پس منظر میں ہند و پاک کے باہمی تعلقات کو مزید بہتر بنانے میں اہم ترین کردار ادا کرے گی۔

شاہد جمال

فہرست

باب ایک

موت تکلیف دہ نہ تھی

(تمہید)

دسمبر 1970

پاکستان کی سیاست میں اس وقت طوفان آیا ہوا تھا۔ جنرل یحییٰ خان ملٹری حکمراں کے طور پر حکومت کرر ہے تھے۔ ان سے پہلے جنرل ایوب خان کے دورِ اقتدار سے چلے آر ہے ملٹری رول سے جمہوریت کی بحالی کے لیے عوام جوجھ رہی تھی۔ آخر چار دسمبر 1970 میں یحییٰ خان کی رہنمائی میں پاکستان کے عام انتخابات ہوئے جس میں مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کے ایک سو سرسٹھ اور مغربی پاکستان کی پیپلز پارٹی کے صرف بیاسی ممبران نیشنل اسمبلی کے لیے چنے گئے۔ کثرتِ رائے کی بنیاد پر عوامی لیگ کے لیڈر مجیب الرحمٰن نے وزیر اعظم کے عہدے کے لیے دعویداری پیش کی لیکن مغربی پاکستان کی فوج وہاں کے زمینداروں اور تاجروں کے گٹ کی حمایت شدہ پیپلز پارٹی کو یہ بات ناگوار لگی، انھیں بنگالی قیادت قبول نہیں تھی۔ اس لیے بھٹو کی صلاح اور اکساوے پر یحییٰ خان نے مجیب کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دینے میں حیلہ حوالی شروع کردی۔ مشرقی پاکستان کے بنگالی صبر نہ کر سکے اور اپنے قانونی حقوق کی حصولیابی وغم وغصے کے اظہار کے لیے مظاہرے کرنے لگے۔

مارچ 1971

پنجابی اقتدار والی مرکزی حکومت کے رویے سے جھلائے ہوئے بنگالیوں کے احساسات اس قدر مجروح ہوئے کہ پرتشدد نافرمانیوں کی صورت میں بغاوت سر اٹھانے لگی۔ مذہب کی بنیاد پر بنے ہوئے اپنے ہی ملک میں اپنی حصے داری کا مذاق دیکھ کر بنگالیوں کے زخمی احساسات تیزی سے بھڑک اٹھے اور ان کی بغاوت دیکھتے دیکھتے دھماکہ خیز ہوگئی۔ اس بغاوت سے نمٹنے اور خصوصاً کمزور مجبور بنگالیوں کو سبق سکھانے کے لیے پنجابی جنرل یحیٰی خان نے 26/مارچ 1971 کو مشرقی پاکستان میں فوجی ''کریک ڈاؤن'' کا حکم صادر کردیا۔ پوربی جاگیرداری میں اٹھ کھڑی ہوئی اس ''عوامی مخالفت'' کو کچلنے کے لیے پنجابی فوج نے ظلم اور بربریت کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ انتقامی ظلم و جبر، اندھا دھند گرفتاریاں، کھلم کھلا قتل و غارت گری و عورتوں کی آبروریزی جیسے اندوہناک مظالم سے خوفزدہ و مجبور بنگالی سر چھپانے کے لیے پڑوسی ملک ہندوستان کی طرف کوچ کرنے لگے۔ ایسے انسانیت سوز حالات کے سامنے ہندوستان اپنے دروازے بند نہ کرسکا۔ نتیجتاً بے شمار بنگالی پاکستان سے ہندوستان میں داخل ہوگئے۔

ہندوستان کے مغربی بنگال میں ان پناہ گزینوں کے لیے بہت سے کیمپ لگوائے گئے جن میں ان کی تعداد دیکھتے دیکھتے ایک کروڑ کے اوپر پہنچ گئی۔

پناہ گزینوں کی اتنی بڑی تعداد سے اچانک سر پر آن پڑے اس اقتصادی، انتظامی اور معاشرتی بحران سے ہندوستانی حکومت گھبرا اٹھی۔ آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا، اقتصادی اعتبار سے بے حد غریب اور ترقی پذیر ممالک میں سب سے زیادہ دن تک سانس لینے والا جمہوری ملک ہندوستان اس مسئلے کو حل کرنے میں خود کو بے بس پاکر آنے والی انتہائی مصیبتوں کے اندیشے سے خوف زدہ ہوا تھا۔ ہندوستان کی وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی دنیا کی عظیم طاقتوں سے اپیلیں کرنے لگیں۔ انھوں نے دنیا کی تمام بڑی راجدھانیوں کا سفر کرکے وہاں کے رہنماؤں اور سربرآوردہ شخصیتوں سے درخواست کی کہ وہ سب مل کر پاکستان کو سمجھائیں کہ وہ اپنے ہم وطن بنگالیوں کے مسائل خود حل کرے اور اپنے اختلافات میں ہندوستان کو گھسیٹے نہ اس پر ناقابل برداشت بوجھ ہی ڈالے۔ اندراجی دنیا کے تمام طاقتور روزرائے اعظم اور صدور مملکت سے جا جا کر

التماس کرتی رہیں لیکن ان کی ان کوششوں کا کسی پر کوئی اثر نہیں پڑا اور انھیں رنجیدہ خاطر ہو کر خالی ہاتھ وطن لوٹنا پڑا۔ پاکستان کی پنجابی فوج کی دہشت اور ظلم و زیادتی نہتے بنگالیوں پر بڑھتی گئی اور حالات بد سے بدتر و بے قابو ہو گئے۔

آخر کار مجبور ہو کر اندرا گاندھی نے مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اور اس کی چھاپہ مار تنظیم ''مکتی واہنی'' کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ پاکستانی افواج کی زیادتیوں کا مقابلہ کیا جا سکے ساتھ ہی ہندوستان میں لٹے پٹے پناہ گزینوں کی آمد کے طوفان کو روکا جا سکے۔ اس کے علاوہ اگر مشرقی پاکستان کے بنگالی چاہیں تو پاکستان کے فوجی تسلط سے ان کی مادر وطن کو آزادی بھی دلائی جا سکے۔

رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان کی ''مکتی واہنی'' منظم ہوتی گئی اور اپنے آپ میں ایک بڑی چھاپہ مار طاقت بن کر سامنے آئی۔ اس نے مغربی پاکستان کی پنجابی فوج سے سیدھے ٹکر لینا شروع کیا اور پنجابی حکمران سمجھنے لگے کہ وہ زیادہ وقت تک اپنے قبضے میں بنگالیوں کی جاگیریں نہ رکھ پائیں گے۔

دسمبر 1971

اپنے معاشی، اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے کو محفوظ رکھنے کے لیے ہندوستان کے ذریعے ''مکتی واہنی'' کو دی جانے والی امداد کسی سے چھپی نہیں تھی لہٰذا ہندوستان کو سزا دینے کے ارادے سے پاکستانی حکمرانوں نے ہندوستان کے مغربی حصے پر 3/دسمبر 1971 کو چاروں طرف سے حملہ بول دیا۔ دوسرے دن ہندوستان کی فوج نے جوابی کارروائی شروع کی۔ ہندوستانی ایرفورس نے بھی مغربی پاکستان پر حملے کے لیے اپنے لڑاکو جہاز جھونک دیے۔

گھماسان جنگ کے دوران ایک روز چار ''سکھوئی۔ سیون'' جہازوں کا ایک بیڑہ، راکٹوں اور توپوں سے لیس مغربی پاکستان کے ایک فوجی ٹھکانے پر حملہ کرنے کی غرض سے اڑ چلا اور ——اسی بیڑے کی رہنمائی کرر ہا تھا......وکرم۔

—

☆☆☆

ریڈیو ان......آگ......آگ......آگ آپ کے جہاز میں آگ لگ چکی ہے۔ بیڑے

کے کمانڈر کے لیے تیسرے لڑاکو جہاز کے پائلٹ فرڈی کی ضد سے بھری آواز میں یہ پیغام جہاز کے ریڈیو پر آیا۔ یہ جہاز اس وقت دشمن کے ایک بڑے توپ خانے پر حملہ کر رہے تھے۔

ریڈ ون...... بیل آؤٹ...... بیل آؤٹ...... وکرم کے ریڈیو پر چوتھے جہاز کے پائلٹ موہن کی چیخ پکار بھی سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وکرم جہاز سے کود کر پیراشوٹ کے سہارے حفاظت کے ساتھ دھرتی ماں کی گود میں آجائے۔

"وکی، سر...... آپ آگ کی لپٹوں سے گھرے ہیں۔ بھگوان کے واسطے...... پلیز...... پیراشوٹ کا استعمال کیجیے، باہر نکلیے اور کود پڑیے۔ پلیز وکی۔" یہ آواز تھی جگو کی جو وکی کو فیصلہ کن قدم اٹھانے کے لیے آمادہ کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وکی کے جہاز میں ریڈیو پر پیغامات کی روانی ماند پڑتی گئی شاید آگ کے بری طرح پھیل جانے کی وجہ سے......

صرف ایک گھنٹے پہلے ہی وکرم دشمن کے ٹینکوں کی ایک ٹولی پر حملہ کر کے لوٹا تھا۔ ان ٹینکوں نے ہندوستانی فوج کی ایک بٹالین، جس میں تقریباً آٹھ سو جوان تھے، کو گھیر رکھا تھا اور ان کی گردنوں پر موت کا خوفناک پھندہ کستا جا رہا تھا۔ ان سے لڑنے کے لیے وکرم اپنے دو جہازوں کے بیڑے میں جگو کو ہی ساتھ لے گیا تھا۔ اس حملے سے لوٹنے کے بعد وکرم نے بیس کمانڈر کو فوری اطلاع دی تھی کہ جگو اور اس نے دشمن کے آٹھ میں سے پانچ ٹینکوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ اس کی تصدیق آرمی نے بھی کی تھی۔ اس سے ہمارے جوانوں کو تھوڑی سی راحت اور پھر سے منظم ہونے کا وقت مل گیا تھا۔

"ویل ڈن وکی" بیس کمانڈر نے وکرم کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا، "لیکن فوج پھر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔" پاکستان کی بھاری توپیں ہمارے امرتسر علاقے میں تباہی مچا رہی ہیں ہمارے جوان اپنی اپنی ٹرینچوں (میدان جنگ میں جگہ جگہ بنے ہوئے گڈھے جس میں چھپ کر دشمن پر حملہ کیا جاتا ہے) میں سر چھپائے پڑے ہیں اور بہت سے مارے بھی جا چکے ہیں۔ میں کیا بتاؤں ابھی تک تین بار جہاز بھیج چکا ہوں لیکن انھیں زمین پر توپ خانہ دکھائی ہی نہیں پڑتا۔ ہماری فوج تو اب ناامید ہوتی جا رہی ہے۔

اسی وقت فرنانڈیز آپریشن روم میں داخل ہوا۔ لڑائی کے دوران آپریشن روم ہی فضائی

جنگ کی نقل و حرکت کا محور ہوتا ہے، اور اس وقت اپنی مشن رپورٹ پیش کرنے کے علاوہ فرڈی یعنی فرنانڈیز کے پاس کمانڈر کے لیے کچھ بے حد قیمتی اطلاعات بھی تھیں۔

سر......فرڈی نے سنجیدگی سے کمانڈر کو مخاطب کیا،" میں جب اپنے مشن سے واپس لوٹ رہا تھا تب لاہور کے اتری علاقے میں میرے اوپر زمیں سے زوردار فائرنگ کی گئی۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہاں توپوں کی ایک لمبی قطار ہے۔ میرے پاس نہ ہی ضرورت کے مطابق ایندھن تھا اور نہ ہی راکٹ و بم ہی بچے تھے۔ اس لیے میں چپ چاپ واپس ہوگیا۔ کیا توپیں ہیں سر......!"

چونکہ اس وقت سب کے دماغ پر یہ توپیں ہی چھائی ہوئی تھیں اس لیے کمانڈر نے فوراً امرتسر علاقے میں دشمن سے برسرپیکار آرمی سے رابطہ قائم کیا اور اطلاع دی کہ فضائی افواج کی طرف سے انھیں پاکستانی توپوں کے خلاف فوراً مدد بھیجی جا رہی ہے......اور وکرم کی طرف مڑتے ہوئے انھوں نے کہا—" وکی بہتر ہوگا کہ اس محاذ پر تم خود جاؤ اور جسے چاہو ساتھ لے جاؤ اس کے علاوہ جتنی ضرورت سمجھو جہاز بھی لے جا سکتے ہو۔"

تیس منٹ کے اندر ہی جنگی ساز و سامان سے پوری طرح لیس چارلڑاکو طیارے فضا میں اڑے اور دھیرے سے مڑ کر لاہور کے اتری علاقے کی طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں فرڈی نے اپنے جہاز کے پنکھوں کو دائیں بائیں دبا کر صحیح راستہ بتانے کی کارروائی جاری رکھی۔ اس وقت ریڈیو کا استعمال کرنا اچھا نہیں تھا۔ کیونکہ دشمنوں کے سارے وائرلیس سٹ حملے کی بھنک پانے کے لیے بے قراری سے کان لگائے بیٹھے ہوں گے۔ توپوں کے ٹھکانے پر پہنچنے تک دشمن کے علاقے میں عجیب و غریب سناٹا تھا۔ نہ ہی کسی گاڑی میں حرکت ہو رہی تھی اور نہ ہی کہیں فائرنگ کے آثار۔ اتنے میں فرڈی نے اپنے طیارے کا بایاں پر کئی بار نیچے کی طرف دبایا۔ وکرم نے فوراً اپنی بائیں سمت نگاہ دوڑائی، نیچے پورا توپ خانہ موجود تھا۔

"اوکے......اٹیک،" وکرم کی آواز سب کے ریڈیو پر صاف سنائی دی۔ کیوں کہ اگلے کچھ ہی لمحوں میں جنگ کی شروعات ہونے والی تھی اس لیے اس وقت ریڈیو کے استعمال سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔

وکرم نے جہاز کو اوپر اٹھاتے ہوئے بائیں طرف موڑنا شروع کیا اور کچھ لمحوں میں وہ زمین کی طرف ڈائیو (DIVE) میں آ گیا۔ سامنے کی پہلی توپ اس کے نشانے پر تھی۔ مناسب اونچائی پر آ کر اس نے جوائے اسٹک پر بٹن دبایا اور چار طاقتور راکٹ اپنے لانچر سے نکل کر پاکستانی توپوں کی طرف بڑھنے لگے۔ وکرم نے ترنت جہاز کو ڈائیو سے نکال کر ہموار کیا۔ آگے نکلنے سے پہلے وہ دیکھ چکا تھا کہ پہلی توپ جہاں دکھائی دی تھی وہاں اس وقت صرف آگ اور دھوئیں کی حکومت ہے۔

حسب ترتیب بیڑے کے نمبر دو جگو، نمبر تین فرڈی اور نمبر چار موہن ایک ایک کر کے لگا تار حملے کرتے چلے گئے۔ دشمن فوراً تاڑ گیا کہ اس کی موجودگی اور اسلحوں کے ذخیرے پوشیدہ نہیں رہ گئے ہیں لہٰذا اس نے توپ خانے کی سبھی طیارہ شکن توپوں کو حملہ آور جہازوں کا نشانہ بنانے کے لیے نصب کر دیا۔ نیچے سے بے شمار گولیوں کی بوچھار اوپر آنے لگی ایسا لگ رہا تھا جیسے برسات الٹی رفتار سے ہونے لگی ہو۔ تڑتڑاتی کھوجی گولیاں اپنی روشنی سے آسمان میں یہ دکھا رہی تھیں کہ اصلی گولیاں کسے اپنا نشانہ بنانے جا رہی ہیں نیچے دھرتی پر توپوں کے بیچ آتش بازی کے انار پھوٹ رہے تھے۔ جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہندوستانی جہازوں کے نشانے بھی ٹھیک لگ رہے ہیں۔

فضا میں جہازوں کے اندر بے قرار سناٹوں کی حکومت تھی۔ ایک چپّی، کہیں کچھ بھی نہ ہونے کا احساس، صرف انجن کی ہلکی بکھر گھراہٹ، جو پائلٹوں کے ایرفونوں کو چیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہر دو منٹ پر اگلے حملے کو اکساتی ہوئی وکرم کی سنجیدہ آواز ریڈیو پر گونج اٹھی۔ ''گوئنگ اِن اگین''، یعنی ایک اور حملہ۔ اسی کے ساتھ ہر ڈائیو اور ہر حملے میں ایک اور گونج، ایک اور قیاس، نیچے سے آتی ہوئی دشمن کی گولیاں جو پٹ پٹ کر کے جہازوں کے نچلے حصے کو زخمی کر رہی تھیں۔ یہ گولیاں تو خوب خوب برس رہی تھیں لیکن زیادہ تر جہاز کے کم حساس حصوں میں ہی لگنے کی وجہ سے زیادہ خطرناک ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔

اور اب جہازوں کے خلاف فضا میں جگہ جگہ دغتے ہوئے آگ کے گولے، زمین میں متعدد جگہوں پر دھماکے، دونوں طرف خوفناک قسم کی قوت ارادی اور جنگ کی دھدکتی للکار، جانباز [illegible]ائے آسمان میں جانباز لڑاکے دھرتی پر، کھنچے جبڑے، دانتوں پر دانت چڑھے ہوئے، انگلیاں

ٹریگر پر، فی الحال زندگی ایک ہی احساس، ایک ہی امید، ایک ہی مقصد، مار ڈالنے پر مر جانے کا ٹس سے مس نہ ہونے والا فیصلہ۔

اسی دوران اچانک وکی کا جہاز ڈول اٹھا، بالکل اس طرح جیسے نیچے سے ان گنت پتھروں کی بوچھار ہو رہی ہو۔ اسی وقت کاک پٹ کے پیچھے حصے میں دبی سی آواز کے ساتھ ایک دھماکہ ہوا اور جہاز داہنی طرف جھک کر چکرانے لگا۔ قابو سے باہر تیزی سے اونچائی کھوتا ہوا۔ جلتے ہوئے جہاز کی ہر گردش کے ساتھ وکرم زمین کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ جہاں زبردست کریش لازمی لگتا تھا۔ نیچے سے دشمن کی گولی سے تباہ شدہ کل پرزوں والی اس مشین کو قابو کرنے میں پوری طرح قاصر، وکی صاف صاف سمجھ رہا تھا کہ اب وہ خوفناک حالات میں بری طرح پھنس چکا ہے۔

تبھی ریڈیو پر آوازوں کا ریلا، ......گیٹ آؤٹ ......بیل آؤٹ ......نکل آؤ ......باہر کودو ......تمہارے جہاز میں آگ لگ چکی ہے آگ ......آگ ......اب لپٹیں کاک پٹ کی چھتری (کینوپی) تک آ چکی تھیں، جہاز ایک جلتی ہوئی چتا بن چکا تھا اور اندر تھا قلابازیاں کھاتا ہوا۔ مجبور و بے بس وکرم، بالکل ہکا بکا۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ ایسے وقت میں بھی اسے خوف بالکل نہیں محسوس ہو رہا تھا اور اگر کچھ تھا تو ذہن میں صرف ایک طرح کا خالی پن، جیسے اگلی کارروائی کا احساس ہی نہ ہو پا رہا ہو۔

—پھر برسوں کی ٹریننگ اور یکا یک آنے والے حالات سے نپٹنے کی ڈرل کا بار بار یاد کرنا، رٹنا، زمین پر ہی بیٹھ کر جہاز میں اڑنے کی تصوراتی مشق کرنا۔ ذہن میں بار بار ان چیزوں کو لانے کی پابندی نے شعور پر قابو کر لیا تھا۔ ریڈیو پر ساتھیوں کی آوازیں اب سخت احکامات کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ پلک جھپکتے ہی اس نے اجکشن ہینڈل کو جکڑ کر جھٹکے سے اوپر کھینچ لیا۔ اسی کے ساتھ سیٹ کے نیچے نصب کیے ہوئے راکٹ درغ اٹھے اور سیٹ کو جلتے جہاز سے اوپر اٹھاتے چلے گئے۔ جلتا جہاز نیچے اور وکی اوپر خلا میں۔ پہلے ایک عجیب سے سنسنی، پھر اچانک سب کچھ ایک دم پرسکون گھور اندھیرا......نہیں، نہ اندھیرا نہ روشنی صرف ایک طرح کا خالی پن......وہ ہر طرف تھا اور کہیں نہیں تھا......فاصلے نہیں، وقت نہیں ......مادیت سے پوری طرح آزاد ......جیسے سکون میں انتہا میں غرق......صرف ایک زوال آمادہ سور......ایک احساس......ایک خیال

......موت تکلیف دہ نہ تھی۔

دماغ، موت کے خیال بھر سے مظلوم دماغ۔ موت سے جڑی نہ سہی جانے والی تکلیف اور تکلیف کے تصور سے ستم زدہ ذہن، اب یکا یک نجات پا چکا۔ ویتر نی کے اس پار......صرف ایک احساس، صرف ایک احسان مندی......موت تکلیف دہ نہ تھی۔

باب دو

ہمدردی اور بے رحمی

دنیا سے نجات کے خوبصورت احساسات سے مگن وکرم......اور پھر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جو تیز ہوکر اسے تھپیڑنے لگے۔ اس کے شعور میں مادّہ برہمی کا احساس ٹوٹنے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اصل میں وہ وہاں نہیں ہے۔ جہاں ہونے کا احساس اسے ابھی کچھ دیر پہلے ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلیں، بینائی واپس آئی۔ دھرتی کو تیزی سے اپنی اور آتے دیکھا اسے پیراشوٹ سے لٹکے ہونے کا احساس ہوا۔ اتنے میں وہ دھرتی پر گرا اور ہوا سے بھرا پیراشوٹ ایک طرف ڈھیر ہو گیا۔ پیراشوٹ کی ڈوریوں میں بندھا وکرم کسی بیٹھے ہوئے انسان کی صورت میں ہی زمین پر گرا۔ اور اسی حالت میں ٹھہر گیا۔

''ڈرل یاد کرو۔'' وکرم نے خود کو مخاطب کیا۔ ڈوریاں الگ کر کے پیراشوٹ کو کہیں چھپاؤ، بعد میں کام آئے گا۔ جلدی سے چھپنے کی جگہ تلاش کرو......چھپو، دشمن کی زمین پر جلد سے جلد چھپو، پھر سوچو اور سوچ کر بچ نکلنے کا ذریعہ تلاش کرو۔

وکرم نے پیراشوٹ کی ڈوریاں کھولنے کے لیے ہاتھ اٹھائے .... پر یہ کیا؟ ہاتھوں میں تو حرکت ہی نہیں۔ پیر بھی ہلانے سے نہیں ہل سکے۔ لیکن آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ دماغ پوری طرح بیدار تھا۔ یکا یک وکرم کو صاف صاف محسوس ہونے لگا کہ اس کے جسم کے بہت سے

حصے بیکار ہو چکے تھے۔ یہ الگ بات کہ دماغی طور پر وہ پوری طرح ہوش وحواس میں تھا۔لیکن جسمانی طور پر ہلنے ڈلنے میں پوری طرح قاصر۔وکرم کو یہ بھروسا ہو گیا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی زبردست طریقے سے زخمی ہے۔جس کی وجہ سے اس کا جسم پوری طرح مفلوج ہو چکا ہے۔اب کیا؟

اتنے میں ایک زبردست شور۔چاروں طرف سے "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے دیہاتیوں کے جھنڈ، لاٹھی ڈنڈوں سے لیس، اس سے قریب آ گئے۔وکرم کے ذہن کی اسکرین پر ایک منظر ابھرا۔پہلے لوٹ مار—اور پھر اس سے بھی نازک حالات کا سامنا، پھر آخر میں انھیں کے ہاتھوں شہادت۔تعجب ہے کہ مشترکہ خاندان کی روایتوں سے جڑے، لیکن اقتدار کی سازش سے تقسیم شدہ لوگ، ایسی زبردست تنگ مزاجی، اتنی گہری دشمنی، ایسی نفرت جو صرف جنگ کے مورچوں اور وردی دھاری لوگوں تک ہی محدود نہیں رہ گئی تھی، بلکہ مادرِ وطن سے عقیدت کے نام پر، دھرم کے نام پر، مذہب کے نام پر، غرض کہ ہر قیمت پر بچے سے بوڑھے تک اور آدمی سے عورت تک، سنگ دل بے رحمی کے ساتھ ہر طرف پھیل چکی تھی۔

یکا یک بیسیوں لوگ اس کی وردی کھینچنے لگے۔ان کے اتاولے ہاتھ اس کی جامہ تلاشی میں مصروف ہو گئے۔نہایت ہوشیاری اور چابکدستی کے ساتھ انھوں نے اس کی گھڑی، سگرٹ، لائٹر اور نقدی پر ہی ہاتھ صاف نہیں کیا بلکہ اس کے گلے سے بندھا مفلر اور دستانے تک اتار لیے۔ہر کوئی اسے کھینچنے کھانچنے اور توڑنے مروڑنے میں لگا تھا کہ کس طرح کچھ اور کامیابی حاصل ہو سکے۔وکرم کو ناقابلِ برداشت تکلیف ہو رہی تھی۔لیکن اس نے اپنے جبڑے اک دوسرے پر اس خوف سے جمائے رکھے کہ اندر کا کرب چیخ بن کر باہر نہ آ جائے۔اب دو ہاتھ جلدی جلدی اس کے بوٹوں کے تسمے (فیتے) کھول رہے تھے کہ اک دم سے سناٹا ہو گیا۔ہر ایک شخص جوں کا توں مبہوت کھڑا رہ گیا۔وکرم نے دیکھا کہ خاکی وردی میں کچھ لوگ اس بھیڑ کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ اس نے راحت کی سانس لی کیونکہ پاکستانی فوج کے سپاہی آ گئے تھے۔اس کی امید بندھی کہ اب شاید وہ محفوظ ہاتھوں میں آ گیا تھا۔فوجی لوگ اپنے فرائض کی ادائیگی بغیر کسی دباؤ کے کرتے ہیں، وہ نہایت بہادری سے لڑتے ہیں لیکن بغیر کسی بے رحمی کے۔دشمن فوج کے زخمی سپاہی کے ساتھ اصول کے مطابق برتاؤ کیا جاتا ہے۔متوقع حسنِ سلوک اور قدر و عزت کے ساتھ ٹھیک ویسا ہی

جیسا کوئی خود کے لیے امید کرتا ہے۔

لمبے، ہٹے کٹے، پٹھان فوجیوں نے وکرم کو گھیر لیا۔ کسی نے حاکمانہ انداز میں پوچھا۔ کیا تمھارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟

''میرے پاس ریوالور تھا، کسی نے نکال لیا ہوگا''۔ وکرم نے دیہاتیوں کی لوٹ پاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کہیں چوٹ آئی ہے؟'' پاکستانی افسر نے پوچھا۔

''لگتا ہے ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہاتھوں پیروں میں جنبش نہیں ہو پارہی ہے۔'' وکرم دھیمی آواز میں بولا۔

پاکستانی افسر نے اپنی زبان میں جوانوں سے کچھ کہا۔ وکرم کو لگا جیسے ''پشتو'' بول رہا ہو۔ جلدی سے اس کی تلاشی لی گئی پھر دو جوانوں نے اسے زمین سے اٹھالیا اور کسی گدڑی میں لپٹے ہوئے گڈے کی طرح سنبھال کر اٹھاتے ہوئے کھلے دیہاتی علاقے میں لگے ایک کیموفلاژ ٹینٹ (Camouflage tent) میں لے آئے۔ پھر آہستہ سے اسے کیمپ بیڈ پر لٹا کر اوپر سے کمبل ڈال دیا گیا۔ افسر اسی وقت ایک فیلڈ ٹیلی فون کی طرف گیا اور کسی سے باتیں کرنے لگا۔ آخر میں وکرم نے اسے انگریزی میں کہتے ہوئے سنا ٹھیک ہے، ہم اسے آپ کے پاس لیے آرہے ہیں۔

وکرم سمجھ گیا کہ وہ افسر اب اسے اس حالیہ مورچے سے پیچھے کی اور کہیں لے جائے گا۔ اور یہ بھی کہ اس کو ایسے لوگوں کے حوالے کیا جائے گا جن کے جسم پر فوج کی یونیفارم تو ضرور ہوگی لیکن دورانِ جنگ انھوں نے راکٹوں اور توپوں کی آوازیں شاید ہی کبھی سنی ہوں گی۔ ایسے لوگ جو مورچے سے الگ کسی محفوظ مقام پر بیٹھ کر جانباز اور لڑاکو فوجیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان پر آڑے سیدھے احکامات صادر کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ کچھ لوگ اپنی غیر موافقت اور کمزوری کی وجہ سے لڑائی کے مورچے سے دور بیٹھ کر ان لوگوں پر اپنی نفسیاتی جھنجھلاہٹ نکالتے ہیں جو مادرِ وطن کے لیے آگے بڑھ کر اپنے خون کے ایک ایک قطرے کی قربانی دیتے ہیں۔

خیر......وکرم سمجھ رہا تھا کہ جنگ بندی کے حکم کی اگنی پریکشا ہونے والی ہے۔

''انھیں چائے پلائیں''، افسر نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔ اگلے ہی پل ایک جوان

بھاپ نکلتی ہوئی چائے کا مگ لے کر آ گیا۔ لیکن وکی تو ہاتھ پاؤں ہلانے سے بھی قاصر تھا۔ سو چائے کا مگ اپنے ہاتھوں سے اٹھانے کا سوال ہی کہاں۔ فوجی سمجھ گیا اور ترنت ایک چمچہ لا کر بنا کچھ بولے وکرم کے منہ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ پر چائے ڈالنے لگا۔ چائے کی گرمی یا پلانے کا طریقۂ کار جانے کیا تھا، جو وکرم کو روح کی گہرائیوں تک چھو گیا اور اس کی آنکھیں جذبۂ احسان مندی سے نم ہو اٹھیں۔

''سگریٹ؟'' افسر نے پوچھا۔ وکرم نے پلکوں سے ''ہاں'' کہا۔ افسر نے خود ایک سگریٹ جلائی اور کش لینے کے لیے وکی کے ہونٹوں سے لگا دی۔ چائے اور سگریٹ سے تازہ دم ہوئے وکرم نے افسر کے پرکشش چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے ذہن میں یکا یک جانے کہاں سے یہ خیال دوڑ آیا۔ کیا ہم واقعی دشمن ہیں؟ یا کہیں کوئی غلط فہمی یا نا سمجھی ہے؟

آج جب وہ دشمن کی زمین پر، دشمن کے بنکر میں، دشمن کے کیمپ کاٹ پر، دشمن کے کمبل میں لپٹا دشمن کی ہی چائے سگریٹ سے خود کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا تو اس کا دھیان دو مہینے پہلے ہوئے ایک واقعے کی طرف چلا گیا۔ وہ ایرفورس کے سواری جہاز میں بنگلور اور دلی کے درمیان تقریباً بیس ہزار فٹ کی اونچائی پر اپنی کیبن میں آرام سے بیٹھا تھا۔ گلیارے کے دوسری طرف ایک سینئر افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایر کموڈور سندر راجن — ایک مشہور و معروف ہوائی انجینئر — جو اپنی ذاتی زندگی میں غیر معمولی روحانیت اور گہرے مذہبی عادات و اطوار سے پُر شخصیت کے طور پر بھی خاصے مشہور تھے۔

سندر راجن ایک کامیاب آبی محقق بھی تھے۔ ایک بار جب ایرفورس کے ایک ریگستانی علاقے میں پینے کا پانی کھوج نکالنے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں تب ان کی پکار ہوئی۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر جوتے اتارے، ہاتھ پاؤں دھوئے اور ادھر ادھر گھوم کر ایک ایسی ٹہنی، جو انگریزی کے حرف Y کی طرح تھی تلاش کر لائے۔ پھر کچھ دیر کی عبادت ریاضت کے بعد ننگے پاؤں ہی سارے علاقے میں گھومتے رہے۔ آخر میں انھیں کچھ فلکیاتی اشارے موصول ہوئے اور انھوں نے ایک جگہ کی نشاندہی کر دی۔ فوراً ہی وہاں بورنگ کا عمل شروع کیا گیا اور کچھ ہی دنوں میں ٹیوب ویل سے بڑھیا میٹھا پانی پھوٹ پڑا۔ جو آگے بھی کبھی کم نہیں ہوا۔

گلیارے کے ایک طرف بیٹھا وکرم یکا یک چونک اٹھا کیونکہ سندرراجن کی نگاہ اس پر ایک دم ٹھیری ہوئی تھی۔وہ مسحور کن روحانی شخصیت اسے ایک ٹک گھورے جا رہی تھی۔حالانکہ کچھ اچھا سا لگ رہا تھا، پھر بھی ان کی غیر متحرک نظروں کو ڈسٹرب کرنے کی غرض سے وکرم نے کہا۔سر! آپ کافی پینا پسند کریں گے؟ سندرراجن گھورتے ہی رہے جیسے کہ انھوں نے وکرم کو بولتے سنا ہی نہ ہو۔

دو مہینے ہاں دو مہینے، آخر کار سندرراجن بولے۔دھیرے دھیرے ان کی آنکھیں متحرک ہونے لگیں۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک طرح کے گہرے محسوسات سے باہر آ رہے ہوں۔

بھویں سکوڑتے ہوئے مضطرب سے نفسیاتی حالات میں وکرم نے پوچھا۔دو مہینے؟ دو مہینے میں کیا ہو جائے گا سر؟

سندرراجن اب پوری طرح نارمل ہو چکے تھے حالانکہ چہرے پر اب بھی گہری سنجیدگی تھی۔ بڑے ہی دلکش انداز میں بولے۔ساری وکرم— لیکن مستقبل میں تمھارے لیے کچھ پریشانیاں ضرور آئیں گی۔

شاید دو مہینے کے اندر۔لیکن فکر مت کرو۔بھگوان تمھاری رکشا کرے گا۔تمھیں پار لگائے گا۔کیا کسی حادثے کا امکان ہے؟ وکرم نے پوچھا۔

''ہاں۔''

کار، ہوائی جہاز یا کچھ اور؟

میں نہیں کہہ سکتا، میں نہیں جانتا۔

کیا میں بخیریت نکل پاؤں گا؟ وکرم نے اس سنجیدہ موضوع پر دوبارہ مطمئن ہونا چاہا۔

ہاں مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔مگر تم یہ ضرور سمجھ لو کہ کسی انہونی یا سانحے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ زبردست تکلیف، چوٹ، زخم، مشکلیں، پریشانیاں، لیکن اس سب کے آخر میں تمھارے لیے زندگی اور امید بھی دیکھ رہا ہوں۔

مستقبل کی جانکاری دینے والوں اور نجومیوں کی طرف سے وکرم ہمیشہ ہی مشکوک رہتا تھا۔یہاں تک کہ انھیں بڑی ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔لیکن جہاں تک سندرراجن کا سوال تھا تو وہ ایک الگ ہی شخصیت کے مالک تھے۔وکرم ان کی باطنی حق پسندی اور قوت وری کے ساتھ

ان کی ظاہری شہرت سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ان کا اخلاق، ان کا برتاؤ، نورانی چہرے پر حکومت کرتی گہری تسکین متوجہ آنکھیں، ہونٹوں تک آنے والا ایک ایک لفظ سنجیدہ اور بامعنی۔ ان تمام چیزوں کو سرسری طور پر نہیں لیا جا سکتا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک متزلزل و بے چین انسان جو پائلٹ کی حیثیت سے ہمیشہ ہی خطرات سے روبرو رہتا ہو، روزمرّہ کی زندگی میں اپنے اصول و نظریات اور فرائض کو کبھی بھی متاثر نہیں ہونے دیتا۔

وکرم نے کہا، ''بہت اچھا سر! اگر آخر میں زندگی ہے۔ امید ہے۔ تو کچھ ہڈیوں پسلیوں کے ٹوٹنے کی میں کبھی فکر نہیں کروں گا''۔ اور اب دشمن کی گرفت میں کیمپ کاٹ پر پڑے لاچار وکرم کو یکایک احساس ہوا کہ سندرراجن کی پیشین گوئی کا تو ایک ایک لفظ سچ ثابت ہو گیا۔

وکرم کی پرورش و نشوونما ایسے مذہبی خاندان میں ہوئی جہاں دن میں دو بار پوجا ارچنا ہی ضروری نہیں تھی بلکہ آئے دن طرح طرح کی مذہبی رسومات کی ادائیگی بھی فرض تصور کی جاتی تھی۔ لیکن بڑے ہوتے ہی اس کا ذہن لاعلمیت کا شکار ہو کر مذہب بیزاری کی طرف اس طرح مائل ہو گیا کہ بھگوان کا نام جھنجھلاہٹ اور غصّے کے عالم میں ہی اس کی زبان پر آتا تھا۔ پر اب کیا؟ خیر ـــــ فی الحال تو وہ زندہ ہے اور زندہ ہونے کی حقیقت ہی اسے مطمئن کر رہی تھی کہ وہ اس مشکل سے ایک نہ ایک دن چھٹکارا پا ہی لے گا۔ اس وقت یہی اطمینان اسے آنے والے تمام غیر معمولی حالات کا سامنا کرنے کے لیے حوصلہ اور قوت بخش رہا تھا۔

''چلیے ـــــ چلنے کا وقت آ گیا'' افسر نے کہا۔ موسم سرما کی جلدی شروع ہونے والی رات کا چاروں طرف بڑھتا اندھیرا شام کے جھٹپٹے پر بھاری پڑنے لگا تھا۔ دو جوانوں نے وکرم کو آہستہ سے اٹھا کر ایک جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھا دیا۔ اس کی پیٹھ کو سیٹ کے پچھلے حصے کا سہارا مل رہا تھا۔ ڈرائیور نے اپنی جگہ سنبھالی اور افسر وکرم کے دوسری طرف آ گیا۔ رائفلوں سے لیس دو فوجی پیچھے بیٹھ گئے۔

'' کچھ دور تک سڑک ناہموار اور اوبڑ کھابڑ ہے۔ اگر دھچکوں سے تکلیف زیادہ ہو تو بتا دینا،'' افسر نے کہا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پھر کہا، ''اگر مناسب سمجھو تو تھوڑا سا آرام کر لو۔ کیونکہ ایک بار میں نے تمھیں ان لوگوں کے سپرد کر دیا جو تمھارا انتظار کر رہے ہیں تو بات اور ہی

ہوگی اور ہاں ــــ اب مجھے تمھاری آنکھوں پر پٹی باندھنی ہوگی''۔ پیچھے بیٹھے سپاہی نے ایک لمبا سوتی کپڑا وکرم کی آنکھوں پر ڈالا اور اسے سر پر کئی بار لپیٹ کر ایک مضبوط گانٹھ باندھ دی۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ سب چلتے رہے اور پھر بائیں طرف مڑ گئے۔ تھوڑے گھماؤ پھراؤ کے بعد جیپ رکی، وکرم نے قریب آرہے کچھ آدمیوں کی آوازیں سنیں۔ افسر نیچے اترا اور وہاں اکٹھا لوگوں میں سلام دعا اور القاب و آداب کے تبادلے کے بعد اپنی حالیہ ذمہ داریوں کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر ایک ہندوستانی فائٹر پائلٹ اس کی قید میں تھا۔ وکرم کو لگا جیسے بہت سے جیپ کی چاروں سمت اکٹھا ہو کر دبی زبان میں کچھ باتیں کر رہے ہوں اور بعد میں آنے والوں کو اس کی جانکاری پہنچا رہے ہوں۔ اتنے میں ایک تیز ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ آنکھیں باقاعدہ ڈھکی ہونے کے باوجود بھی روشنی کی جھلک وہ اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی نایاب شے ہاتھ لگ گئی ہو۔ ان کی بات چیت کے ڈھنگ سے وکرم کو لگ رہا تھا کہ وہ سیویلنس کے بیچ ہے۔ شاید اس افسر کے اپنے ہی گاؤں میں، جہاں وہ فخر کے ساتھ خود سے بڑے عہدے کے ایک خاص جنگی قیدی کو نمائش کے لیے لایا تھا۔

لیکن یہاں ہمدردی اور رحم دلی بھی تھی۔ ایک گلاس دودھ کی چائے اور کچھ بسکٹ لائے گئے۔ افسر کے کچھ کہنے پر ایک شخص نے اپنے ہاتھ سے وکرم کو بسکٹ کھلائے اور چائے کی چسکیوں کے لیے کپ کو اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''شکریہ! آپ کا بہت بہت شکریہ''، وکرم نے جذباتی ہو کر کہا۔ کاش میں ان لوگوں سے مل سکتا اور نیچے اتر کر مصافحہ کر سکتا، ساتھ ہی اب تک کے ان نام نہاد دشمنوں کی ہمدردی، نیک نیتی اور دیانتداری پر ان کا شکریہ ادا کر سکتا۔ انھیں دکھا سکتا کہ وہ ایسا ہندوستانی درندہ نہیں جیسا ان کے لیڈران انھیں ایک مدت سے بتاتے آئے ہیں۔

تبھی یکا یک سبھی خاموش ہو گئے اور ایک آواز ابھر کر آئی۔ یہ کسی بزرگ کی آواز تھی۔ سنجیدہ، باعلم اور خود اعتمادی سے پر ــــ

''ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کو قیدی کی حالت میں زخمی دیکھ رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے حکمراں آپ کی دیکھ بھال اچھی طرح کریں گے اور ان کی نگہداشت و علاج سے آپ جلد

صحت یاب ہوں گے۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے آپ کی طرف پہنچنے ہمارے لوگوں سے نرمی اور خلوص کے ساتھ پیش آنے کی امید رہتی ہے۔ یہ واقعات افسوس ناک ہیں لیکن یہ جنگ ہے۔ میں تو صحیح کہہ سکتا ہوں کہ خدا کرے آپ کی پریشانیاں دور ہوں اور آپ جلد سے جلد اپنے عزیزوں اور دوستوں سے جا ملیں۔ خدا حافظ۔"

بزرگوار نے اس کے گھٹنے تھپتھپائے اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں کچھ دیر تک لیے رہے۔ وکرم کو بے پناہ حیرت ہو رہی تھی۔ جیپ جیسے ہی آگے بڑھنے لگی، اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ نہایت ہی جذباتی انداز میں زور سے چلایا— "خدا حافظ۔"

تقریباً ایک گھنٹے چلتے رہنے کے بعد جیپ کی رفتار پھر دھیمی ہوئی۔ سنتری کی روک ٹوک، ٹارچ کی روشنی، افسر اور پہریداروں کی سگبگاہٹ، سب ملا کر محسوس ہونے لگا کہ وہ ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ جیپ پھر آگے بڑھی۔ افسر نے وکرم کی کلائیوں پر جلدی سے ہتھکڑیاں کس دیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ "ساری"— مگر قاعدہ یہی ہے۔ جب آپ کو ان کے سپرد کرنا ہی ہے تو کیوں نہ قانون اور ضابطے کے ساتھ کروں۔

کچھ لمحوں میں جیپ پھر رکی۔ لوگ چل کر اس کی طرف آرہے تھے۔ فلش لائٹ اسی پر مرکوز تھی۔

"اسے باہر لاؤ" کسی کا پتھریلا حکم گونجا۔ اسکارٹ پارٹی کے جوان وکرم کو اٹھا کر باہر نکالنے لگے۔

"بدبخت کیا چل بھی نہیں سکتا؟" "تم لوگ اسے کیوں ٹانگ رہے ہو؟ پھر وہی خرخراتی ہوئی ڈراؤنی آواز۔

"یہ زخمی ہے سر" ساتھ آئے افسر نے کہا۔ اپنے آپ کھڑا نہیں ہو سکتا، اب تک دونوں جوان وکرم کو جیپ سے باہر نکال چکے تھے اور اپنے کاندھے کا سہارا دے کر اس کو کھڑا کیے ہوئے تھے۔

"حرامزادے کو چھوڑ دو" نیا باس پھر گرجا۔ میں دیکھتا ہوں اسے کیا ہوا ہے۔ جوانوں نے جیسے ہی اپنے کاندھے ہٹائے وکرم زمین پر گرنے لگا۔ دونوں جوان جلدی سے نیچے جھکے اور اسے پھر سے سیدھا کھڑا کر لیا۔

"سچ مچ زخمی ہے یا مکاری کر رہا ہے؟ میں دیکھتا ہوں....." یہ کہتے ہوئے وہ لمبا تڑنگا موٹا سانڈ وکرم کے پیچھے گیا اور "فلائنگ اوورآل" کے کالر کو پکڑ کر زور سے اسے جھنجھوڑنے لگا۔ درد کی

ایک جھلستی سی لہر وکرم کی پیٹھ کو چھوتی ہوئی اس کے پورے جسم میں سرایت کرگئی۔ ناقابلِ برداشت تکلیف سے امڑتی چیخ کو دبانے کی پوری کوشش اس نے کی، پھر بھی ایک دھیمی کراہ ہونٹوں تک آ ہی گئی۔

''اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوسکتا...... کیوں بے کمبخت ہندوستانی چوزے۔ ہم سے لڑنے آیا تھا۔ ہم بہادر پاکستانیوں سے؟'' وہ اپنے خرخراہٹ بھرے لہجے میں اسی طرح دیر تک ہندوستانیوں کے خلاف ہتک آمیز اور غلیظ گالیوں بھرے الفاظ اپنے منھ سے اگلتا رہا۔ وکرم نے من ہی من اسے ایسے فوجی افسروں کے زمرے میں شمار کرلیا جو وردی، بلٹ اور مختلف قسم کے بلوں سے تو ضرور لیس ہوتے ہیں لیکن بڑا سا پیٹ نکالے ادھر ادھر اینٹھتے اکڑتے چلا کرتے ہیں۔ کینٹین کے سامان اور مفت کے راشن میں زیادہ دلچسپی رکھنے والے یہ افسر عہدے اور حقوق کی گستاخ نمائش کرتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی بڑی ہوشیاری کے ساتھ خود کو جنگ کے مورچوں سے کوسوں دور بھی رکھتے ہیں۔ میدانِ جنگ سے دور دور رہنے والے یہ افسر اپنی یونٹوں میں تو ببر شیر بنے رہتے ہیں، لیکن دورانِ جنگ مرنے کھپنے والوں کو قاعدے قانون ہی نہیں سکھاتے بلکہ ان کے واجبات کو کسی نہ کسی اصول کے حوالے سے بے جا اور بے کار بھی ثابت کرتے رہتے ہیں۔ وکرم نے تکلیف اور مایوسی سے سوچا کہ ایسے لوگوں سے بچ کر نکل پانا ٹیڑھی کھیر ہے، کم سے کم تب تک ــــ جب تک کہ دوسروں پر رعب جھاڑ جھاڑ کر ان کا غرور تھک نہیں جاتا یا کوئی سینئر افسر بیچ میں آکر مداخلت نہیں کرتا۔

''اندر لے جاؤ اس حرامزادے کو۔'' اس دہاڑ کے ساتھ ہی اس نے وکرم کی گردن پر زبردست دوہتھڑ لگایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وکرم آگے کی طرف لڑکھڑا کر رہ گیا۔

وکرم کو آگے لے جایا گیا۔ ایک دو چوکھٹیں پار کرنے کے بعد اسے ایک کرسی دی گئی۔ لیکن کمر سیدھی نہ کر پانے کی وجہ سے وہ پیچھے دھنس گیا۔ آنکھوں کی پٹی اور ہتھکڑی کھول دی گئی۔ وہ ایک مدھم روشنی والے کمرے میں تھا۔ سامنے ایک لمبی سی میز پڑی تھی جس کے اوپر لٹکتا ہوا ایک ہلکا سا بلب جل رہا تھا۔ روشنی کا زیادہ تر حصہ اسی پر مرکوز تھا۔ دھیرے دھیرے اس کو احساس ہونے لگا کہ میز کے دوسری طرف کچھ لوگ پہلے سے بیٹھے ہیں۔ سب ملا کر تعداد میں دس۔ لیکن صرف ان کا

ہیولی ہی دیکھا جا سکتا تھا کیونکہ ان کے چہرے پوری طرح اندھیرے میں تھے تو اب شروع ہوتی ہے پوچھ تاچھ، وکرم نے گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔ کسی فوجی کی زندگی کا سب سے ناپسندیدہ اور ڈراونا پہلو، جنگ میں قیدی بننا، پوچھ تاچھ، لانچھن، گالیاں یہاں تک کہ لاتوں اور جوتوں تک سے گزرنا۔ کبھی کبھی تو مرنے سے بھی بدتر —— اور یہاں تو ابھی صرف شروعات تھی۔

—

باب تین

رازداری اور جاسوسی

''کیا نام ہے تیرا؟'' میز کے اس پار سے آواز آئی، پنجابی لہجے کی خرخراتی اردو میں۔
وکرم نے جلدی سے کچھ سوچا، پھر انگریزی میں جواب دیا۔'' مائی نیم اِز وکرم'' (میرا نام وکرم ہے) صرف وکرم؟ پھر اسی لہجے میں پوچھا گیا۔ نہ کمار، نہ سنگھ، نہ پنڈت۔
'' مائی نیم از وکرم سنگھ''، وکرم نے پھر انگریزی میں جواب دیا۔ میرا پورا نام وکرم ہے۔
''تمھارا گھر کہاں ہے؟ مطلب کہ تم کس صوبے کے رہنے والے ہو؟'' پھر اسی لہجے میں دوسری آواز۔
'' مائی ہوم اِز ان اتر پردیش'' وکرم انگریزی پر ہی اڑا رہا (میرا گھر اتر پردیش میں ہے)
'' آہ...........'' ایک تیسرے صاحب واقعی آہ بھرنے کے انداز میں میز کے اس پار سے بولے،'' تم لوگ غلام ہی رہے ہو............ ہمیشہ ہمیشہ سے......اور آگے بھی غلام ہی رہو گے۔ انگریز پچیس برس قبل تمھیں چھوڑ کر چلے گئے لیکن تم آج بھی ان کے غلام ہو۔ کم سے کم ان کی زبان کے غلام تو ہو ہی۔ شاید کسی نہ کسی طرح کی غلامی تمھارا مقدر بن چکی ہے بلکہ غلامی تمھارے خون میں شامل ہے کمبخت۔ صدیوں تم ہماری جوتی کے نیچے رہے اس کے بعد انگریزوں کی اور ان کے چلے جانے کے بعد بھی تم ان کے رتبے اور زبان دونوں کے غلام ہو۔''

حقارت بھرے اسی لہجے میں ایک اور آواز ابھری، ''تم اپنی زبان نہیں بول سکتے۔ تمھیں اپنے اور اپنی زبان پر ناز بھی نہیں ہے؟ تمھارے یہاں اتنی زبانیں ہیں کہ سمجھ ہی نہیں آتا کہ کون سی زبان استعمال کی جائے''۔ وکرم خاموش ہی رہا۔ بالکل خاموش۔

''ابے ہندی والے! بول، ہندی میں بول۔ یا تیرا باس کوئی اینگلو انڈین یا مدراسی ہے، جو تو ہندی بولنے سے ڈرتا ہے؟''

وکرم نے سوچا کہ یہ لوگ اس سے پوچھ تاچھ کے لیے بیٹھے ہیں، ضرور سب انگریزی بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ پھر زبان کے نام پر اتنی گرما گرمی کیوں۔ صرف زبان ان کا مقصد نہیں ہوسکتی۔ اصل میں یہ ایک سخت شروعات کررہے ہیں۔ چیخ کر۔ حقارت بھرا انداز اختیار کرکے۔ شاید اسے نفسیاتی طور پر کمزور کرنے کی کوشش کررہے ہیں، تاکہ وہ خوف زدہ ہوکر ان کے سارے سوالوں کا جواب فوراً دے دے۔

اچانک وکرم نے سوال و جواب کی سمت بدلنے کا فیصلہ کیا اور بڑی ہی معصومیت سے انگریزی میں ہی کہا، ''ایکسکیوز می! بٹ وہاٹ لینگویج آر یو جینٹلمین یوزنگ۔'' (لیکن معاف کیجیے گا جناب! آپ سب کون سی زبان بول رہے ہیں) وکرم کے اس جملے پر ایک صاحب برس پڑے اور آگ بگولہ ہوکر بولے، ''ابے یوپی والے! تجھے ہماری اردو سمجھ میں نہیں آتی؟ جب تیرے باپ دادا ہمارے قدموں میں اپنی ناک رگڑتے تھے تو کون سی زبان بولتے تھے؟ اور تو پوچھتا ہے کہ ہم کون سی زبان بول رہے ہیں۔''

''جناب والا''، وکرم نے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ ہندوستانی میں بولنا شروع کیا، ''میں علی گڑھ کے قریب کا رہنے والا ہوں، مگر پڑھائی لکھائی کی وجہ سے زیادہ تر لکھنؤ ہی رہنا پڑا ہے۔ اس لیے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی اردو ویسی نہیں ہے جیسی کہ میں نے زندگی بھر بولی اور سنی ہے۔ نہ تلفظ میں ہی اور نہ لہجے میں ہی۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی اور ہی زبان ہے جو شاید میرے بس کی نہیں۔ اسی لیے بولنے کی گستاخی نہیں کی۔ اگر آپ کو میری یہ زبان ٹھیک لگ رہی ہو تو میں اسی کا استعمال کروں؟''

اس طرح وکرم نے انھیں بتادیا کہ لکھنؤ اور دوسرے صوبوں میں بولی جانے والی اردو میں

وہی فرق ہے جو آکسفورڈ اور جاہلوں کی انگریزی میں۔لیکن اس سے زیادہ نہ اس نے کہا اور نہ ؟
اس کا ذہن کہنے کی جسارت ہی کر سکا۔اس کے بعد کچھ دیر تک ماحول میں جو سناٹا رہا اس سے وکرم کو لگا کہ کم سے کم نفسیاتی طور پر تو حساب برابر ہو چکا ہے۔آخر پوچھتاچھ حاضر جوابی اور لفظوں کے توڑ مروڑ کا ہی تو کھیل ہے......دیکھا جائے گا۔ویسے اس کے سامنے بیٹھے لوگ کم نہیں ہیں، وہ بھی اپنے کام میں ماہر ہیں۔اس لیے اسے بڑی ہی ہوشیاری اور حاضر دماغی کا استعمال کرنا ہوگا۔کسی بھی حالت میں اس کا رویہ منفی اور اڑیل قسم کا نہیں ہونا چاہیے۔شاید تبھی وہ ان کو ان کے اصل مقصد سے تھوڑا بہت گمراہ کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔

''تمھارا پوائنٹ؟''،تیزی سے سوال آیا۔

—

اچانک وکرم کا دھیان تقریباً دس سال پہلے کے ایک حادثے کی طرف گیا۔وہ وقت تھا ہندوستان اور چین کی جنگ کے کچھ ہی مہینوں بعد کا۔اس وقت بھی چین سے لگی سرحد پر بہت کشمکش چل رہی تھی۔بھارت کی چوکسی اپنی انتہا پر تھی۔ایک بہت ہی سینئر افسر وکرم کی یونٹ کا معائنہ کرنے آئے ہوئے تھے۔سب کچھ دیکھنے کے بعد وہ آخر میں پائلٹس کی آرام گاہ میں آئے۔ جہاں رسم کے مطابق ایر مارشل کو یونٹ کے افسروں کے ساتھ چائے پینی تھی۔چائے کی چسکیوں کے دوران میں ہی بات چیت کرتے ہوئے ایر مارشل نے پوچھا'' تو......بچو! میں تم لوگوں کو کیا بتاؤں؟ اگر تم لوگوں میں سے کوئی مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہو تو پوچھے۔''

عموماً ایسے مواقع پر ایر مارشل سے جونیئر افسر بھی کچھ ہلکی پھلکی رسمی باتیں کر لیا کرتے تھے، جیسے ان کے بیرونی دوروں کے بارے میں یا وہاں کے ایرفورس کی نقل و حرکت کے بارے میں۔ کیونکہ اس وقت چین کے حملوں نے طرح طرح کے شکوک وشبہات کا ایک پٹارہ کھول رکھا تھا اور ہر ایک فائٹر اسکواڈرن میں لگاتار نئے حملے اور بچاؤ کی تکنیک پر بحث چھڑی رہتی تھی، خاص طور سے ایسے موضوعات پر جن کا تعلق براہ راست لڑاکو جہاز اڑانے والوں سے ہو اور اس کی وجہ تھی ایرفورس کی لڑائی کی خاصیت — انجینئروں اور کارندوں کا کام تو ملک کے اندر ہی ہوائی اڈوں پر ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن صرف پائلٹ ہی ہے، جو اکیلا جہاز لے کر مورچے پر جاتا ہے اور اسے اپنی

منزل پانے کے لیے رہنمائی کے ساتھ ساتھ خاص ہدایات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ضروری نہیں کہ ایسی ہدایتیں یا رہنمائیاں صرف مرنے جینے جیسے حالات کا سامنا پر ہی کام آئیں بلکہ ان کی اہمیت اس وقت اجاگر ہوتی ہے جب کوئی جہاز دشمن کی گولیوں سے چھلنی ہو جائے اور پائلٹ کو پیراسوٹ سے برفیلے پہاڑوں یا کسی ایسی جگہ پر اترنا پڑے جہاں دشمن ملک کا قبضہ ہو۔

اکثر ایسے موقع پر جونیئر افسر کچھ پوچھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کہ کون اپنا سر اوکھلی میں ڈالے۔لیکن حالات کی کشمکش کے شکار ایک فوجی نے پوچھ ہی لیا،'' سر! چین کے مورچوں تک پہنچنے کے لیے ہم زیادہ تر پہاڑوں کے اوپر ہی اڑان بھریں گے۔ ہماچل کا پوربی اور اتری حصہ پوری طرح برف سے ڈھکا ہوا ہے۔اگر ایسی جگہ پر ہمیں پیراسوٹ سے کودنا پڑا تو ٹھنڈ سے بچاؤ اپنے آپ میں اچھا خاصہ مسئلہ ہوگا۔میرا ماننا ہے کہ ایسے حالات کے لیے کچھ خاص لباس ہونے چاہیے کیونکہ ہم لوگ جو سویٹر وغیرہ پہن کر اڑان بھرتے ہیں ان کے سہارے دو ایک گھنٹہ بھی زندہ رہنا آسان نہیں ہو پائے گا۔اس کے علاوہ صرف ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہی وہاں سے بچ کر نکلا جاسکتا ہے۔سر! اس طرح کی گفتگو اکثر ہم لوگوں میں ہوتی رہتی ہے اس لیے میں نے آپ سے کہنے کی ہمت جٹائی۔''

ایر مارشل موصوف فوجی کی باتیں سن کر کچھ دیر خاموش رہے۔ظاہر تھا کہ ایسی مشکلیں ابھی تک ان کی جانکاری میں تھیں ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت دیر کے بعد جب انھوں نے اپنے ہونٹوں کو تکلیف بھی دی، تو موضوع سے پوری طرح ہٹ کر ایک الگ ہی گفتگو شروع کردی۔

'' پہلے آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ اگر چینیوں نے آپ کو قید کر لیا تو آپ کیا کریں گے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ انھیں کیا بتائیں گے؟''، ایر مارشل نے زور دے کر پوچھا۔

سب خاموش! ہر آدمی اس انتظار میں کہ دوسرا کوئی ہی زبان کھول کر اپنی گردن پھنسائے۔

بولیں! بتائیں! ایر مارشل نے اصرار کیا۔آخر آپ لوگوں کو وہاں لڑنے جانا ہے تو آپ کو یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ ہم دشمن کو کیا کیا بتا سکتے ہیں اور کیا کیا نہیں۔

ایک نئی عمر کے فلائنگ افسر نے جھجکتے ہوئے کہا—'' سر! میں ان کو اپنا رینک، نام، سروس نمبر اور یونٹ بتاؤں گا......''

''نہیں نہیں نہیں''، ایر مارشل گرجے۔'' آپ صرف اپنا رینک، نام اور نمبر بتائیں گے۔صرف نام مع رینک اور نمبر۔اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں، کسی بھی حالت میں نہیں۔''

ایر مارشل اب یونٹ کے کمانڈنگ افسر کی طرف مخاطب ہوئے،'' کیوں؟ تمھارے پائلٹ ''جنیوا کنونشن'' کے بارے میں نہیں جانتے۔تم نے انھیں ایسی چیزیں نہیں بتائیں''، جھلاہٹ بھرے لہجے میں انھوں نے کہا، ''فوراً انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دشمن کو رینک، نام اور نمبر کے علاوہ کچھ نہیں بتائیں گے۔''

''جی ہاں سر''، کمانڈنگ افسر نے مستعدی سے کہا۔لیکن دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ یہ کمبخت ''جنیوا کنونشن'' آخر کون سی بلا ہے اور کہاں ملے گی؟

''مہمانِ خاص'' اپنی بات ختم کرتے ہی اٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔گرم کپڑوں اور ہیلی کاپٹر سے بچاؤ کے بارے میں کوئی گفتگو ہی نہیں ہوئی۔اور ہوتی بھی کیسے؟ وہ ایک ایسے ملک کی فوج کے سینئر افسر تھے جہاں چین کے حملے کے پہلے ہی بہت سنجیدگی سے کچھ عظیم دانشور یہ صلاح دے رہے تھے کہ ہندوستان کو عدم تشدد کی سمت غیر معمولی قدم اٹھاتے ہوئے اعلان کر دینا چاہیے کہ ہم کسی سے نہیں لڑیں گے۔ہمیں فوج کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

''جینوا کنونشن......مائی فٹ''، ایک نوجوان افسر طیش میں آ کر بولا۔''ذرا رینک، نمبر اور نام بتا کر تو دیکھیے۔دشمن آپ کو اتنے پر ہی چھوڑ دے گا؟''

دوسرے نے کہا،'' جب تھرڈ ڈگری کا استعمال شروع ہوگا تب دیکھوں گا کہ کون کتنا چپ رہ سکتا ہے۔''

ایک افسر نے پرسکون لہجے میں کہا،'' مگر ہمارے پاس انھیں بتانے کے لیے رہے گا ہی کیا؟ اگر ہمارا جہاز مار گرایا جاتا ہے تو اس کا پرزہ پرزہ وہ خود ہی دیکھ لیں گے۔ویسے بھی جہاز کے کل پرزوں کا معائنہ کرکے وہ ''جینس۔دنیا کے ہوائی جہاز'' (Janes-The Air Craft of The World) نام کی کتاب میں چھپے اعداد و شمار کی تصدیق ہی تو کریں گے۔رہا سوال اونچے درجے کے اصولوں اور جنگ کی تعمیر کا، تو ہمیں اس کے بارے میں پتہ ہی کیا ہے۔''

''گونگے گدھے کی طرح کیا بیٹھا ہے؟ تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔کون سا یونٹ ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟ یا ہمیں کسی اور طریقے سے اگلوانا پڑے گا؟'' دیر سے جواب نہ ملنے پر ڈانٹ اور دھمکی ایک ساتھ آئی۔

''ایک منٹ جناب!'' وکرم نے دبی زبان میں کہا۔'' ذرا رُکیے۔ تکلیف کچھ زیادہ ہی ہو رہی ہے۔'' درد کی وجہ سے واقعی پریشان تھا اور کرسی میں کسی طرح ایڈجسٹ کر کے پیٹھ کو آرام پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

—

وکرم کا ذہن پھر لڑائی کے کچھ روز پہلے کے ایک واقعے کی طرف چلا گیا۔ ایک دن ایرفورس کے مرکزی دفتر میں اس کے سامنے ایک اشد ضروری فائل آئی، جسے اعلیٰ افسروں تک فوراً پہنچانا تھا۔ وکرم نے جلدی سے فائل کھول کر چار صفحات کا مضمون پڑھا، جس کا عنوان تھا—

''پاکستان ایرا یچی کے ذریعے سب ملکوں کے ملٹری اٹیچیوں کو دی گئی آج صبح کی بریفنگ۔''

پاکستان کے ذریعے کیے گئے اس خلاصے میں خاص بات یہ تھی کہ ہندوستانی ایرفورس کی لڑاکو یونٹوں کے ٹھکانے بہت ہی تفصیل سے دیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ جو یونٹ پوربی پاکستان کے مورچے پر دکھائی گئی تھی۔ پورب کی لڑائی ختم ہونے پر ان کے پچھمی مورچے کے متوقع ٹھکانے بھی بتائے گئے تھے۔ وکرم حیرت زدہ تھا کہ پاکستان کو ہمارے پلان کی ایک ایک بات معلوم تھی اور اب یہ اس سے یونٹ پوچھ رہے ہیں۔ اب کیا پوشیدہ رکھا جائے اور کیا نہیں؟

—

''نمبر چھبیس اسکواڈرن''، وکرم نے بے جھجک بتا دیا۔ جب پوچھا گیا کہ یہ اسکواڈرن کہاں تعینات ہے۔ اس نے صحیح جگہ بھی بتا دی۔ جب آپس میں دشمنوں کی زمین پر ایک دوسرے کے سینکڑوں جاسوس کام کر رہے ہوں۔ جہاں خلا میں اڑتے جہاز اور سٹیلائٹ لگاتار فوجوں کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھ رہے ہوں۔ جب امریکہ اور روس جیسی عظیم طاقتیں چاروں طرف جاسوسی کا جال بچھائے ہوئے ہوں، تو کس سے کیا پوشیدہ رہ سکتا ہے، سمجھ سے پرے ہے۔ کم سے

کم تو پیں، ٹینک، بحری اور ہوائی افواج کے جہاز اور ان کے اسلحے تو چھپے رہ ہی نہیں سکتے کیوں کہ یہ سب کسی نہ کسی دوسرے ملک سے ہی خریدے جاتے ہیں۔ باقی بچی ہوئی چیزیں جاسوس پتہ لگا لیتے ہیں۔ غالباً حملہ کرنے کے مختلف طریقے اور پائلٹوں کی صلاحیت وغیرہ ہی کچھ ایسے موضوعات ہیں جنھیں کچھ وقت کے لیے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ایسے خاص پروگرام جیسے رڈار کا پہلے پہل استعمال یا ایٹم بم کا حملہ وہ مسائل ہیں جو ہمارے معاملات میں بے مطلب اور بے کار ہیں۔

تمھارا کمانڈنگ افسر کون ہے؟

تمھارا اسٹیشن کمانڈر کون ہے؟

تمھارے اسکواڈرن کے پائلٹوں کے نام کیا ہیں؟

''آخر نام میں کیا رکھا ہے؟'' وکرم نے سوچا۔ ایچ سنگھ یا وائی تیواری۔ ڈی کمار یا اے۔ یو۔ خان کیا فرق پڑتا ہے؟ شاید تبھی جب بہادری کے لیے تمغہ پانے والوں یا شہیدوں کی فہرست میں نام درج ہونا ہو۔ وکرم نے نام بتانے شروع کر دیے۔ کچھ صحیح، کچھ فرضی اور بیچ بیچ میں بلا وجہ رک رک کر وکرم سب کا تھوڑا بہت وقت بھی برباد کرتا رہا۔ ویسے بھی وہ اس دن علی الصبح اٹھ کر پاکستان پر تین حملے کر چکا تھا اور اس سب کے بعد ایسی شدید چوٹیں، جیپ کا تکلیف دہ سفر اور مسلسل ذہنی تناؤ سب مل کر اسے اندر ہی اندر کمزور کرتے جا رہے تھے۔ اس کے جواب اس طرح رک رک کر آنے لگے، جیسے آواز اپنے آپ دھیمی ہوتی جا رہی ہو۔ وکرم کی آواز جیسے جیسے دھیمی ہونے لگی پوچھ تاچھ کرنے والے اور زوروں سے چلانے لگے۔ آخر کار وکرم اپنی کرسی میں کچھ زیادہ ہی دھنسنے لگا اور بے ہوشی اس پر پوری طرح غالب ہونے لگی۔

اسے لگ رہا تھا، جیسے اسے اٹھا کر کہیں لے جایا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو تیز روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ زمین پر پڑا تھا اور الگ وردیوں میں کچھ لوگ اس کے پاس کھڑے تھے۔ ایک کوتاہ قد، بھاری جسم اور سفید بالوں والا افسر وکرم کے گرد چہل قدمی کر رہا تھا۔

اپنا بوٹ زمین پر پٹخ کر اچانک وہ چلایا، ''اسلام ہمیں دشمن کا سر فوراً قلم کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں ایسا کرنے سے کیوں روکا جا رہا ہے۔''

غصے سے لال پیلا وہ شخص وکرم کے گرد کچھ اس انداز سے گھوم رہا تھا کہ جیسے اس کا دل اور

دماغ دونوں کسی خاص کرب میں مبتلا ہوں۔

"الٹا ہم سے کہا جارہا ہے کہ اس کمبخت کی دیکھ بھال کرو، اس کا علاج کراؤ، اسے کھانا کھلاؤ۔ لاحول ولاقوۃ۔ ہم کتنے بدل گئے ہیں؟" وہ زور سے چلایا۔ "خیر اس حرامزادے کو یہیں پڑا رہنے دو۔"

یہ کہہ کر وہ جلاد وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد لوہے کا دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ وکرم کنکریٹ کی فرش پر ہی پڑا رہا۔ صرف اپنے سوتی فلائنگ اوورآل، انڈرویر اور بنیائن میں۔ نہ کوئی کمبل اور نہ کچھ اور ہی۔ موسمِ سرما کی ٹھنڈی ہوائیں کھلے کھڑکیوں سے اندر آرہی تھیں۔ وکرم کو تیز کپکپی ہونے لگی۔ دوبارہ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے دماغ میں ایک ہی خیال ابھر رہا تھا کہ اب وہ دوسرے دن کا سورج شاید ہی دیکھ سکے۔

باب چار

اسپتال اور علاج

اگلی صبح آفتاب کی کرنیں جیل کی سلاخوں سے جھانک کر وکرم کے چہرے پر اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ وکرم نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور دل ہی دل میں سوریہ دیوتا کی اس مہربانی پر اپنا سر جھکا دیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے ساری کائنات اسے زندگی کی طرف بڑھنے کے لیے متحرک کر رہی ہے۔

کچھ ہی لمحوں میں آہنی دروازہ کھلا اور ایک سنتری ہاتھ میں پلیٹ اور مگ لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے یہ سامان وکرم کے پاس رکھ دیے۔ وکرم نے دیکھا پلیٹ میں دو روٹیاں اور ایک چمچہ بھر دال رکھی ہوئی تھی جب کہ مگ میں آدھا کپ چائے...... سب کچھ ٹھنڈا، پرانا...... سوکھا سہا..... اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور...... یہ کیا ہاتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس کا مطلب کہ ہاتھوں میں پھر سے حرکت آ گئی تھی۔ وکرم نے پیر اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکام ہی رہا۔ اس کی کمر سے نیچے کے حصے ابھی مفلوج ہی تھے اور ہلانے ڈلانے پر بھی ان میں درد ہوتا تھا۔ خیر! اس نے روٹی اٹھائی اور محنت کے ساتھ دانتوں سے کاٹ کر چبانے لگا۔ اس کے پیٹ کو پوری خوراک ملے چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے۔ اس کے جسم کو غذا کی سخت ضرورت تھی جب کہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ آئندہ کھانا اسے کب اور کہاں ملے گا۔ اس لیے جو کچھ نصیب ہوا وکرم نے فوراً چٹ کیا اور ٹھنڈی ہی سہی،

چائے اپنے حلق میں انڈیل لی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وکرم نے اپنے آپ کو پوری طرح کھسکا کر دھوپ کے حوالے کر دیا تھا کہ سورج سے زیادہ سے زیادہ توانائی حاصل کی جا سکے۔

تقریباً دو گھنٹے اسی حالت میں وکرم پڑا رہا۔ اسے تعجب تھا کہ ابھی تک کوئی اس سے پوچھ تاچھ کرنے نہیں آیا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ پھر کھلا اور تین چار عدد فوجی اندر آئے جن میں سے ایک نے پاکستانی ایرفورس کے کارپول کی وردی پہن رکھی تھی۔ بغیر کچھ کہے اس نے وکرم کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہی نہیں پہنائیں بلکہ ایک ٹوپی نما کپڑا بھی اس کے سر پر ڈال دیا۔ وکرم اب باہر کی طرف کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے اٹھا کر پھر ایک جیپ کی اگلی سیٹ پر بٹھادیا گیا۔ باقی لوگوں کے بیٹھنے کے ساتھ ہی جیپ چل پڑی۔ وکرم کی کمر میں بے حد تکلیف ہو رہی تھی، وہ لگاتار کراہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وکرم کی طرف سے سیٹ پر ادھر ادھر سرک کر درد کی شدت کچھ کم کرنے کی کوشش بھی جاری رہی۔ آخر کسی نامعلوم منزل پر پہنچ کر اسے ایک دوسری جیل کی سیل میں فرش پر ہی ڈال دیا گیا۔ فرش کنکریٹ کی بنی ہوئی تھی، ہاں اس بار اسے ایک کمبل ضرور نصیب ہو گیا تھا۔

دیر رات تک وکرم اور اس کی تکلیفوں کی شدت کمبل میں ایک دوسرے سے لپٹے پڑے رہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے بار بار خود سے غافل ہونے کی وجہ اس کی نیند تھی یا پھر ......بیہوشی۔ وقت کا احساس بالکل ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ہوش اور بے ہوشی کے درمیان درد سے بے چین وکرم کا دل و دماغ ایک عجیب سے خالی پن میں کھویا ہوا تھا کہ اتنے میں ایرڈفنس سائرنوں کی فلک شگاف آوازیں سنائی دینے لگیں جو غالباً ہوائی جہازوں کے متوقع حملوں سے فوج کو خبردار کر رہی تھیں۔ تبھی آئے وہاں ز......و......و......و......ں......ں کرتے ہوئے ہوائی جہاز اور کچھ ہی لمحوں میں بم پھٹنے کی دھماکہ دار آوازیں۔ وکرم سمجھ گیا کہ ہندوستانی ایرفورس کے جہاز رات کے حملے پر آئے ہیں۔ وہ خود بھی ان خاص پائلٹوں کی ٹریننگ سے بخوبی واقف تھا۔ دلیش مکھ، برار، اور قدم وغیرہ...... یہ پائلٹ رات کے اندھیرے میں دشمن کے ہوائی اڈوں کو تلاش کر کے ان پر حملے کرنے میں ماہر تھے۔

ان حالیہ حملوں کی ہی وجہ سے وکرم سمجھ گیا تھا کہ اسے کسی ہوائی اڈے کے قریب ہی لایا گیا تھا۔ اس کا جہاز لاہور کے اتر میں تقریباً بیس کلومیٹر دور گرا تھا اور غالباً پہلی رات اسے لاہور

کے ہی کسی علاقے میں رکھا گیا تھا۔ وہاں سے تین چار گھنٹے جیپ کا سفر ثابت کر رہا ہے کہ اب وہ راولپنڈی پہنچ چکا ہے۔

ہندوستانی جہازوں کے حملے رات بھر جاری رہے۔ دوسرے دن بھی وکرم وہیں پڑا رہا۔ لیکن دیر رات اسے پھر کہیں لے جایا گیا۔ ہتھکڑیوں کے ساتھ جب اس کی آنکھوں کی پٹی کھولی گئی تو اس نے خود کو ایک ایسے کمرے میں پایا، جہاں روشنی ہلکی ہونے کے باوجود ہر طرف ایک طرح کی شائستگی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ صاف ستھرے اور ملائم بستر پر لیٹے ہوئے وکرم نے دیکھا کہ دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں اور ایک رائفل بدست سنتری بھی دروازے پر کھڑا ہے۔ ان دو تین دنوں میں پہلی بار اسے کافی مقدار میں تازہ کھانا نصیب ہوا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جیسے ہی اس نے آرام دہ بستر سنبھالا، نہ چاہتے ہوئے بھی فرش پر گزارے ہوئے لمحات یاد آگئے جن کا اسے اگر کچھ ملال تھا بھی تو صرف اس وجہ سے کہ، ان حالات میں درد کی شدت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی جب کہ آرام دہ بستر مل جانے سے کافی راحت محسوس ہو رہی تھی۔

حملے بدستور جاری رہے۔ سائرنوں، ہوائی جہازوں اور بموں کی دھماکہ خیز آوازوں کے درمیان اسے کچھ لوگوں کی چیخ پکار اور کراہیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پہلے اس نے سوچا ـــ شاید حملوں سے زخمی لوگ چیخ رہے ہیں لیکن بعد میں اسے محسوس ہوا کہ یہ آہیں اور کراہیں ان زخمیوں کی ہیں جو غالباً جنگ کے مورچوں سے کسی اسپتال میں لائے گئے ہیں۔ دھیرے دھیرے اسے یقین ہونے لگا کہ وہ شاید لاعلاج ہی اس دنیا سے نہیں اٹھے گا۔

اگلی صبح وکرم ابھی پوری طرح نیند سے بیدار بھی نہیں ہوا تھا کہ کچھ لڑکیوں کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوئیں۔ آنکھیں کھولیں تو پانچ چھ عدد خوبصورت دوشیزائیں نرس کی سفید شفاف پوشاکوں میں چاروں طرف دکھائی دیں۔ ان کی کھلکھلاہٹ اور زیر لب گفتگو، ان کی حسین دوشیزگی، ان کا اشتیاق اور ان کے چہروں کی معصومیت اس قدر خوفناک ماحول میں بھی وکرم کو مسرت اور توانائی کا احساس دلا رہی تھیں۔

ایک لڑکی چونکتے ہوئے بولی، ''ارے! یہ تو وہی ہے جس کی تصویر کل اخبار میں دکھائی دی تھی۔''

"لیکن اخبار میں اس کے زخمی ہونے کے بارے میں تو کچھ نہیں لکھا تھا، پھر اسے یہاں کیوں لے آیا گیا ہے،" دوسری بولی۔

دھیرے دھیرے نرسوں کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ گفتگو کے ساتھ ساتھ جب ان کے قہقہے بھی شدت اختیار کرنے لگے تو سنتری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ دہاڑا۔

"خاموش۔" "آپ لوگ فوراً کمرے سے باہر نکل جائیں۔ میں نے صرف قیدی کو دیکھنے کی اجازت دی تھی لیکن آپ لوگ تو اسکول کے بچوں کی طرح ہنسی مذاق پر اتر آئیں۔

لڑکیاں اپنی حرکتوں سے شرمسار ہو کر خاموشی سے ایک ایک کر کے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی وکرم نے گہری سانس بھری۔ اس کے قید ہونے کی خبر مع تصویر اخبارات کی زینت بن چکی تھی، اس کا مطلب پاکستانی اسے ہلکے پھلکے ڈھنگ سے مار کر کنارے نہیں لگا سکتے کیونکہ معلوم نہیں کتنے قیدی گرفت میں آتے ہی مار کر پھینک دیے جاتے ہیں۔ جن کا نہ تو کوئی شمار ہوتا ہے اور نہ ہی ریکارڈ۔ دشمن کی قید میں محفوظ رہنے کا اطمینان صرف ایسی ہی حالت میں کیا جا سکتا ہے کہ قیدی کے نام کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے اور یہ بھی اکثر کچھ خاص قیدیوں کے ساتھ ہی کیا جاتا ہے اور وہ بھی خاص سیاسی وجوہات کی بنا پر۔ وکرم خوش قسمت تھا۔ اب اگر اس کو کچھ ہو بھی جاتا ہے تو اس کا بے جان جسم موت کی جائز وجوہات کے ساتھ اس کے ملک کو لوٹانا ضروری ہوگا اور اگر ایسا نہ ہوا تو اس کے ڈپلومیٹک اور "جیسے کو تیسا" جیسے "نتائج" ضرور سامنے آئیں گے۔ خیر دشمن کی قید میں زندہ رہنے کی امیدیں اب بڑھتی جا رہی تھیں۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد وکرم کو اسٹریچر ٹرالی پر لٹا کر ایک ایسے کمرے میں لے جایا گیا جہاں کئی طرح کی ایکسرے مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ راستے میں ایک ڈاکٹر ایسے پرسکون انداز میں کھڑا دکھائی دیا جیسے مریضوں کی چیخ پکار اور ان کے رونے بلکنے کا اس پر کوئی اثر ہی نہ ہو۔ ٹرالی بالکل ایسی جگہ روکی گئی جہاں اپنی جگہ سے ایک آدھ انچ کھسکے بغیر بھی وہ مریض کا معائنہ بخوبی کر سکے۔ اسی پرسکون انداز سے اس نے وکرم کو ایک کروٹ دلائی اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کو جگہ جگہ سے دبا کر دیکھنا شروع کیا۔ ڈاکٹر نے وکرم کے کراہنے سے ہی اندازہ کر لیا کہ چوٹ واقعی کس

جگہ ہے۔ اسی مخصوص جگہ سے اوپر ہوا میں ہاتھوں سے کچھ اشارے کیے گئے، جسے یکا یک نمودار ہونے والی نرس نے غور سے دیکھا۔ بغیر ایک لفظ بولے ڈاکٹر صاحب وہاں سے چلے گئے۔ اب نرس نے ٹرالی کو دھکیل کر ایک ایکسرے پلیٹ فارم پر پہنچا دیا اور وکرم کو وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ ایکسرے ٹکنیشین نے اپنا کام پورا کیا۔ نرس واپس ہوئی اور بغیر کچھ کہے سنے اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ یہ کمرہ بھی مختلف قسم کی مشینوں سے لیس تھا۔ ہاتھ میں بغیر سوکھا ہوا ایکسرے لیے ڈاکٹر دوبارہ حاضر ہوا اور نرس کو ایکسرے فلم دکھاتے ہوئے کچھ ہدایتیں دینے لگا۔ وکرم نے اسے نرس سے پلاسٹر کاسٹ لگانے کے لیے کہتے ہوئے سنا۔

"سر!" وکرم نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ "میری چوٹیں کیسی ہیں؟ میرا مطلب ہے سر! کتنی؟"

"زیادہ ہیں۔ ریڑھ کی ہڈیوں میں سے چار بری طرح مجروح ہوئی ہیں اور چھ میں کچھ ہلکی چوٹیں ہیں،" ڈاکٹر نے بتایا۔

"آپ مجھ کو سیدھا کر کے کسی تخت پر رکھیں گے یا پلاسٹر میں؟" دراصل وکرم کو تھوڑا بہت علم تھا کہ ایسی حالت میں مریض کو پلاسٹر چڑھانے کے بجائے ہلنے ڈلنے کے پرہیز کے ساتھ تخت بستر پر بھی علاج کے لیے رکھا جا سکتا ہے۔

پہلی بار ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بولا، "آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں مگر جن حالات میں آپ کو ان دنوں رہنا ہے، میرے خیال میں پلاسٹر ہی بہتر رہے گا۔"

وکرم نے کچھ تعجب اور ڈھیر سی احسان مندی کے ساتھ ڈاکٹر کے چہرے کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ ظاہر تھا کہ ڈاکٹر نے وکرم کی حالت دیکھتے ہوئے خود ہی رائے قائم کر کے پلاسٹر لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ قیدیوں کے کیمپ میں مریضوں کی تیمارداری کتنے اچھے ڈھنگ سے ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں پلاسٹر کم سے کم ہڈیوں کو جکڑ کر تو رکھے گا ہی۔ وکرم کو اطمینان ہوا کہ کرنل حسن نے اسے صرف ایک بیمار کی ہی طرح دیکھا تھا اور ایک قابل و باصلاحیت ڈاکٹر سے جیسے علاج کی امید کی جا سکتی ہے ویسا ہی علاج شروع کرنے کی ہدایت بھی انھوں نے دی تھی۔ بعد میں وقتاً فوقتاً اسپتال لائے جانے کے دوران وکرم کی ملاقات پاکستان کے ایسے سپاہیوں سے بھی ہوئی جو کبھی ہندوستان کے فوجی اسپتالوں میں زیر علاج رہ چکے تھے۔ وہ سب ہندوستانی فوج

کے ڈاکٹروں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ وکرم کو محسوس ہوا کہ دونوں قوموں کے درمیان صرف نفرت یا ایک قسم کی تنگ مزاجی ہی نہیں بلکہ انسانیت کی بنیاد پر نیک خواہشات اور ایک دوسرے کے تئیں ہمدردیاں بھی باقی ہیں۔

وکرم ایک دراز قد نرس کے حوالے کیا گیا تھا۔ جس نے ایک معاون کی مدد سے وکرم کو دو میزوں کے درمیان الٹا لٹکا دیا، یوں سمجھیے کہ اس کی ٹھڈی ایک میز پر اور پیروں کے انگوٹھے دوسری میز پر۔ لگ رہا تھا کہ اسے دونوں طرف سے بری طرح کھینچا جا رہا ہو۔ اس کے جسم کو بار بار اٹھایا اور دبایا جا رہا تھا۔ آخر میں کرنل حسن انگلیوں سے ریڑھ کی صحیح حالت کا اندازہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ درد سے کراہتا وکرم اب اس پہلوان صفت نرس کے رحم و کرم پر تھا۔

''روتا ہے؟ چلاتا ہے؟ چیختا ہے؟ ارے واہ فائٹر پائلٹ! اپنی قوم کا کیا بہادر ہے؟'' نرس نے طعنہ زنی کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا سی چوٹ کیا آ گئی روئے ہی جا رہا ہے،'' کہتے ہوئے اس نرس نے وکرم کی پیٹھ پر ٹیوب سے کسی قسم کی کریم پھیلائی اور احتیاط کے ساتھ بہت ہی نرم ہاتھوں سے ملنے لگی۔ وکرم کو اس قدر بھلا محسوس ہو رہا تھا کہ بار بار اس کا جی چاہتا کہ مڑ کر دیکھ لے، آخر یہ وہی عورت ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے خالص جھگڑالو انداز میں اسے طعنے دے رہی تھی۔

''تو کیا سمجھتا ہے؟ ہم سے جیت پائے گا؟......ہم سے؟''، وہ پھر دہاڑی، جیسے ہزاروں کے مجمع سے خطاب کر رہی ہو، ''ہم پٹھان ہیں، جانتا ہے؟ ہم نے تیرے جیسے ہندؤں کو ہزاروں بار پیٹا ہے، ہرایا ہے۔ ہم پھر تمھیں ختم کر کے ہی رہیں گے۔''

پھر یکا یک بڑے ہی معصوم لہجے میں اس نے دریافت کیا، ''درد زیادہ تو نہیں ہو رہا ہے؟'' اور وکرم کے چہرے پر درد کے آثار پڑھ کر پیار سے بولی، ''گھبراؤ نہیں۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ دھیرے دھیرے درد کم ہو جائے گا۔''

وہ ہلکے ہاتھوں سے وکرم کی پیٹھ میں ایک خاص قسم کی پٹی باندھ رہی تھی۔ پٹی کے اوپر لیپ چڑھا کر پلاسٹر باندھتے باندھتے اچانک وہ رکی اور اپنا داہنا ہاتھ اوپر اٹھا کر اس نے پھر دہاڑنا شروع کیا، ''ہم مسلمان ہیں۔ ہم تمھارے لال قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ زیادہ غفلت میں نہ پڑو۔ ہم مرنے والے لوگ ہیں۔ ہم نے ہمیشہ ہی فتح حاصل کی ہے۔ ہم تمھیں بھی

ایک دن دکھادیں گے۔''

اس پر جب بھی یہ کیفیت سوار ہوتی، وکرم یہ سوچ کر سہم اٹھتا کہ اس کا پارہ اگر کچھ اور چڑھ جائے تو یہ مجھے بھی توڑ پھوڑ کر رکھ سکتی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر میں پھر وہی شفقت بھرا برتاؤ، وہی معصوم سی تیمارداری اور بیچ بیچ میں یہ پوچھتے رہنا کہ درد زیادہ تو نہیں ہے یا پٹی سخت تو نہیں ہو رہی ہے۔

''ارے ہم لوگ حکومت کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ انشاءاللہ تمھارے ملک کی باگ ڈور ایک دن پھر ہمارے ہاتھوں میں ہوگی۔ ہم تمھیں خاک میں ملا دیں گے۔ اگر ہمارے مشرقی برادران نے دھوکا نہ دیا ہوتا تو اب تک ہم ہندوستان کو نیست و نابود کر چکے ہوتے۔''

وکرم کو اس عورت پر بے پناہ تعجب ہو رہا تھا۔ اپنے کام میں اس قدر ماہر، چست درست، فراخ دل اور اپنی سوچ اور اپنے خیالات میں اتنی مستحکم، اتنی سخت کہ کسی زاویے سے بھی کوئی لوچ نہ برداشت کرنے والی اور نہ ہی کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے والی عورت۔ یہ اور بھی تعجب کی بات تھی کہ اس کی دوہری شخصیت کا ایک پہلو کبھی دوسرے پہلو پر حاوی نہیں ہوا۔ وکرم کو جہاں ایک طرف اس کی ہمدردیوں سے ایک خاص قسم کا لگاؤ سا تھا، وہیں دوسری طرف اسپتال سے باہر اس کا سامنا کرنے کی جرأت بھی اس میں نہیں تھی۔ وہ گھڑی کے پنڈلم کی طرح ایک طرف بے انتہا مہربان اور خدمت گزار تو دوسری طرف اپنے روایتی دشمن کے لیے شدید غصہ اور بغیر کسی رحم کے اس کو خاک میں ملا ڈالنے کی زبردست خواہش۔

پلاسٹر سوکھنے لگا تو اس کے چہرے پر اطمینان و سکون کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ اس نے دھیرے سے وکرم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ''خدا کرے تم جلدی صحت یاب ہو اور اپنے عزیزوں دوستوں سے جا ملو۔''

اور پھر ایک آخری دہاڑ.......... ''مگر یاد رکھنا۔ ہم ایک دن تمھارے ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے ضرور کریں گے۔''

اگلے کئی مہینوں تک وکرم کو چیک اپ کے لیے اسی اسپتال میں لایا گیا۔ وہ جب بھی یہاں آتا اس کی آنکھیں اپنی ''اسپیشل نرس'' کو ادھر ادھر تلاش کرتی رہتیں۔ کئی بار تو سنتریوں کے سخت پہرے کے باوجود وکرم نے کئی نرسوں سے مل کر اس کے بارے میں پوچھ تاچھ بھی کی۔ تاہم نہ معلوم

ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی دشواری ہورہی تھی۔ وکرم نے کئی ڈاکٹروں سے اس کا حلیہ بتا کر اس سے ملنے کی ضد بھی کی، مگر کچھ بات نہ بن سکی۔ کاش! وہ اس سے ایک بار پھر مل پاتا اور بتا سکتا اس نے اسے اپنے ذہن ودل میں آج بھی ایک "ماں" کی حیثیت دے رکھی ہے۔ ایک ماں ہی تو ایسی ہوتی ہے، جس میں ایک طرف بے انتہا رحم، بے پناہ شفقت، ایثار وقربانی جیسے جذبات ہوتے ہیں تو دوسری طرف مضبوط اخلاقیات اور پختہ افکار وخیالات کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور تمنا۔

وکرم نے من ہی من پرارتھنا کی — اسے لمبی عمر ملے۔ خوش رہے۔ خدا کرے۔

—

باب پانچ

کچھ غلط فہمیاں کچھ خوش فہمیاں

صبح کے علاج سے پوری طرح تھکا ہوا وکرم جب اپنے بستر تک پہنچا تو نیند اور تکان کے ملے جلے اثرات اس پر فوراً حاوی ہو گئے اور وہ اپنے پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ ابھی دو ایک گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ پلاسٹر کی جکڑ اور سخت ہو گئی اتنی کہ تناؤ اسے کروٹیں بدلنے پر مجبور کرنے لگا۔ یکایک کچھ قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ وکرم نے باقاعدہ آنکھیں کھول کر دیکھا تو لال فیتوں سے لیس فوجی وردی میں ایک سینئر افسر کمرے میں داخل ہو چکے تھے، ساتھ میں ایک جونیئر ڈاکٹر بھی تھا جو انھیں وکرم کی چوٹوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر ڈاکٹر کی باتیں سنتے رہنے کے بعد آفیسر نرم لہجے میں بولے، ''آل رائٹ، یو مے کیری آن۔'' یعنی آپ جا سکتے ہیں۔

اپنی ہلکی توند پر وردی کو ٹھیک کرتے ہوئے آفیسر ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے اور وکرم سے پوچھنے لگے، ''علاج ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟'' وکرم نے دیکھا کہ داہنی جیب کے اوپر عموماً لگی رہنے والی نام کی پلیٹ غائب تھی۔ شاید کرنل صاحب کے لیے اپنا نام پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔

''جی ہاں،'' وکرم نے سادگی سے جواب دیا اور اس نئے حریف کے بارے میں طرح طرح کے قیاسات لگانے لگا۔ آفیسر کے پیچھے کھڑے دو لوگ اور ان کی تشریف آوری سے پیدا شدہ ہنگامہ آرائیاں ثابت کرتی تھیں کہ وہ اپنی رینک سے زیادہ اہمیت رکھنے والے لوگ تھے۔

"آپ کو ہمارے بیچ کسی طرح کی پریشانی تو نہیں ہے یا کسی قسم کی اور کوئی ضرورت؟"
انھوں نے رسمی طور سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ حالات کے دیکھتے ہوئے.........سب ٹھیک ہی ہے"، وکرم نے جواب دیا۔

کرنل کچھ کہتے کہتے رکے۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد دوبارہ بولے،" آپ کو کس دن گرایا گیا تھا؟ ہاں شاید دس تاریخ کو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو اپنے ان ساتھیوں کے بارے میں معلومات نہیں ہوگی جنھیں ہم نے بعد میں انجام تک پہنچایا ہے۔"

وکرم ابھی کرنل صاحب کی بات چیت اور آنے والے سوالات کا اندازہ ہی کر رہا تھا کہ اپنے ساتھیوں کے ذکر نے اسے بے چین کر دیا۔

"آپ نے ہمارے کتنے جہازوں کو نقصان پہنچایا اور ان کے پائلٹس کا کیا ہوا؟" وکرم نے جلدی جلدی دریافت کیا۔

"صحیح اعداد و شمار تو میں نہیں بتا سکتا لیکن شاید ہی کوئی جہاز ہو جو واپس جا سکا ہو"، کرنل صاحب وکرم کی طرف دھیان سے دیکھتے ہوئے بولے،" ....اور پائلٹس ......مجھے افسوس ہے کہ سب کے سب ہلاک ہوئے۔"

وکرم کو کرنل صاحب کے اس بیان پر شک ہوا۔ وہ شاید کچھ زیادہ ہی بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ گفتگو کا دائرہ بڑھاتے ہوئے وکرم نے پوچھا،" اور سر.........لڑائی کیسی چل رہی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ ہم میں سے کون کہاں پہنچا؟"

" آپ اس لڑائی کے بارے میں کیا امید کرتے ہیں؟" کرنل نے وکرم کے سوال کے جواب میں سوال کیا۔" ہاں آپ ہی بتایئے؟ جنگ کیسی چلنی ہے، کب تک چلنی ہے اور اس کا انجام کیا ہو گیا؟"

وکرم نے معصومیت سے کہا،" سر! میں تو ایک معمولی سپاہی ہوں، بے شک ہوائی سپاہی۔ لڑائی کی ٹھیک ٹھیک صورتِ حال کے بارے میں مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے؟ میں تو صرف یہ جاننے کا خواہش مند ہوں کہ کس مورچے پر کون کہاں تک پہنچا ہے، کون آگے بڑھا اور کون پیچھے؟"

"خیر آپ لوگوں کو جنگ جیتنے کی امید تو نہیں ہی رہی ہوگی اور انشاء اللہ آپ جیتیں گے بھی نہیں"، کرنل نے غرور کے ساتھ کہا، "شاید آپ اس غلط فہمی میں تھے کہ آپ کو فتح حاصل ہوگی۔"

وکرم نے جذباتی انداز میں جواب دیا، "بھلا وہ کون سا سپاہی ہے جو جنگ میں یہ سوچ کر شریک ہوتا ہو کہ اسے ہارنا ہے؟ چاہے ہم ہوں یا آپ کی فوج۔ ہر سپاہی جنگ جیتنے کے ارادے سے ہی میدان میں اترتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو لڑائی ہوگی ہی کیسے؟ میدانِ جنگ میں کچھ لوگ پیٹھ دکھا کر بھاگ رہے ہوں گے اور کچھ لوگ سینہ سپر ہو کر انھیں للکار رہے ہوں گے۔"

"بالکل"، کرنل نے خوش ہو کر کہا، "بالکل یہی آپ کی فوجیں مشرق میں کر رہی ہیں۔ آپ کے سپاہی سامنے آ کر لڑتے ہی نہیں بلکہ دن میں مورچہ تیار کرتے ہیں اور رات میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بھلا بتایئے اگر اس طرح کی آنکھ مچولی ہی کھیلنی تھی تو یہ حالات پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"کیا! ہم نے حالات پیدا کیے؟" وکرم نے تعجب سے پوچھا۔ تین دسمبر کو ہمارے ہوائی اڈوں پر زور و شور کے ساتھ بمباری کر کے جنگ کا آغاز تو آپ ہی نے کیا تھا۔"

"ہم حملہ کرنے پر مجبور تھے۔ ہمیں بتانا تھا کہ آپ مشرقی پاکستان کے معاملات میں دخل اندازی نہ کریں ورنہ اس کی قیمت آپ کو کہیں اور چکانی پڑے گی۔"

"معاف کیجیے گا سر! ساری دنیا جانتی ہے کہ پوربی پاکستان کی مصیبت آپ نے خود مول لی ہے آپ کی اپنی پالیسیاں ہی ان حالات کی ذمے دار ہیں۔ اور ہم؟ ہمارے اوپر تو آپ نے دس کروڑ بنگالی مہاجرین کا بوجھ ڈال دیا۔ وہ بھی دس کروڑ تو جولائی اگست تک ہی آ گئے تھے جب کہ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے۔"

"اور آپ ان نامراد بنگالیوں کو کھلے عام شہ دے رہے تھے۔ ارے بنگالی................ یہ بد بخت بنگالی..... صرف نعرے بازی کے لیے ٹھیک ہیں۔ جوشیلی تقریریں کر سکتے ہیں۔ جلوس نکال سکتے ہیں بس۔ ہاں کبھی کبھار ایک آدھ ہتھ گولہ بھی پھینک سکتے ہیں۔ مگر لڑائی.....اور وہ ہم سے؟ ارے آپ کچھ بھی کر لیں بنگالی ہم سے لڑ پائے گا۔ بھلا ہم پنجابیوں سے؟"

وکرم دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ بات چیت کا دور کافی دلچسپ ہو چلا تھا۔ نہ کہ وہی گھسے پٹے سوال..... آپ کا یونٹ؟ کتنے پائلٹ؟ کتنے جہاز؟ وغیرہ وغیرہ گفتگو کا یہ سلسلہ ٹوٹ نہ

سکے اس لیے وکرم نے بڑی ہی مہارت سے کہا، "سر! آپ کہہ رہے تھے کہ پوربی پاکستان میں ہماری فوجیں سیدھی لڑائی سے کترا رہی ہیں؟"، "بالکل یہی....." کرنل بولے...... "یہی ہو رہا ہے مگر اس طرف مغرب میں آپ بچ کر نہیں نکل سکتے۔ وہاں بنگال میں ہر مورچے پر آپ کی تیاری تو نظر آتی ہے مگر رات کے اندھیرے میں آپ کی فوجیں ڈر کر کھسک لیتی ہیں۔"

"شاید ہماری فوجیں ڈھاکہ کی طرف کھسک رہی ہوں سر"، وکرم نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس کو ہندوستانی حملوں کے طریقۂ کار کا کچھ علم ضرور تھا، اس نے لڑائی کی تیاریوں کے سلسلے میں ہونے والے بہت سے مباحثوں میں حصہ لیا تھا۔ ہندوستانی فوج کو معلوم تھا کہ مشرقی بنگال میں پاکستان نے جگہ جگہ بڑی زبردست مورچہ بندی کر رکھی ہے۔ اور بعد میں ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ ہندوستان نے کتنی ذہانت سے اپنی پالیسی بدل کر ان پاکستانی مورچوں اور چھاؤنیوں کو جوں کا توں چھوڑتے ہوئے بغل سے نکل کر چاروں طرف سے ڈھاکہ کی گھیرہ بندی شروع کی تھی۔ ڈھاکہ...... پوربی پاکستان کی مشہور راجدھانی، ان کی جنگی کوششوں اور تیاریوں کا محور، پاکستانیوں کے نظریے سے ایک ناقابلِ شکست قلعہ۔

"ہو سکتا ہے"، کرنل بولے، "مگر ہمیں صرف پلٹنا ہی ہے، کسی بھی وقت ہماری فوج پلٹ کر آپ کو دونوں طرف سے دبوچ لے گی۔ بالکل سروتے کی طرح۔" کرنل صاحب جس انداز سے باتیں کر رہے تھے اس سے لگ رہا تھا جیسے پاکستان کی تمام جنگی پالیسیاں انھوں نے ہی ترتیب دی ہوں۔ وکرم کو مخاطب کرتے وقت وہ ایسا انداز اختیار کرتے تھے جیسے ان کے سارے کے سارے دشمن ایک وکرم کی ہی ذات میں سمائے ہوئے ہوں۔

کرنل صاحب کچھ پل اپنے خیالات میں ڈوبے رہے۔ پھر کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ، کچھ ناامیدی اور غصے بھرے لہجے میں بولے، "یہ حرام زادے بنگالی! ناشکرے۔ یہ کسی کے ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ اسلام کے بھی سگے نہیں ہیں۔ اپنے ہی بھائیوں سے غداری۔ ہندوستانی فوجوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ انھیں ندیوں اور بارودی سرنگوں سے پار کرواتے ہیں۔ مسلم برادران کے خلاف ہندوستان کی گود میں گھسے بیٹھے ہیں حرام زادے ان کو تو ہم ٹھیک کر ہی لیں گے۔ پہلے ذرا آپ سے نپٹ لیں۔"

''ہم سے؟ یہاں؟ اس پچھمی مورچے پر؟''، وکرم نے یکا یک پوچھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ جنگ کی اصل حالت کرنل صاحب کو اچھی طرح معلوم تھی اور مورچے پر ہوئی اپنی ہار سے پیدا جھنجھلاہٹ ان کے چہرے پر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اب وہ بلاوجہ کی اکڑفوں کا سہارا لے رہے تھے۔

''ہاں، ہم اس مورچے پر آپ کو ختم کر دیں گے''، وہ طیش میں بولے۔'' پنجاب اور سندھ میں تھوڑا بہت آپ آگے آ گئے ہوں لیکن یہ سب پلان کے تحت ہے۔ آپ کے اندر آتے ہی ہم چاروں طرف سے گھیر کر آپ کو نیست و نابود کر دیں گے۔ اس کے بعد دلی کا راستہ صاف۔

کرنل صاحب کچھ پرسکون ہوئے۔ لگتا تھا جیسے دلی کے تصور نے انھیں کافی توانائی بخش دی ہو۔ کیونکہ پاکستان کے زیادہ تر لوگ اسی تصور میں کھوئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان اور دلی ہی ان کی زندگی، ان کا خواب اور ان کے حکمرانوں اور فوجیوں کا خاص مقصد۔

کرنل صاحب نے برٹین کی بنی پلیر (Player) سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگائی۔ وکرم گزشتہ کئی دنوں سے سگریٹ نوشی سے محروم تھا۔ پورا کا پورا پیکٹ دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔

''سر! میں بھی ایک سگریٹ لے سکتا ہوں؟''، اس نے مانگ ہی لیا۔ سگریٹ ہونٹوں کی طرف لے جاتے ہوئے کرنل کا ہاتھ ہوا میں ہی رک گیا، انھوں نے پلٹ کر وکرم کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشمکش دکھائی دے رہی تھی۔ آخر ان کے حاکمانہ رتبے پر انسانیت حاوی ہوگئی اور انھوں نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر وکرم کی طرف بڑھا دیے۔ وکرم نے ایک سگریٹ جلائی اور لمبا سا کش کھینچتے ہوئے خوشی اور مسرت سے لیٹ گیا جیسے اس کی روح کو سکون نصیب ہوگیا ہو۔

فوج کے افسروں میں اس طرح کی بے تکلفی روزمرّہ کی بات ہوتی ہے۔ دورانِ جنگ بے شک ایک دوسرے کو پناہ نہ دیں لیکن سگریٹ، شراب یا ایسی دوسری چیزوں کے سلسلے میں بے جھجک ایک دوسرے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وکرم کی جانکاری میں دنیا کے تمام ممالک کے افسر تقریباً ایک ہی جیسی ٹریننگ پاتے ہیں اور اکثر اسی حساب سے ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ بھی کرتے ہیں۔ اس

کے علاوہ دشمنی کی جڑیں چاہے جتنی گہری ہوں یا تعلقات جتنے بھی خراب ہوں لیکن ہندوستان اور پاکستان کے لوگ آپس میں کم سے کم نازیوں اور یہودیوں جیسے تو نہیں ہو سکتے۔

وکرم نے آہستہ سے کہا، ''سر! آپ پچھمی فرنٹ کی بات کر رہے تھے۔ لڑائی دس دن سے چل رہی ہے، کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کی فوج تو آگے بڑھی ہی ہو گی چاہے آپ کی چاہے ہماری۔''

''ہاں بڑھت تو ہونی ہی ہے''، کرنل بولے۔ ''میں بتاتا ہوں لیکن تم جان کر بھی کیا کر سکتے ہو؟ بہت جلد ہم ایسا حملہ کرنے جا رہے ہیں کہ ہندوستان پچھم سے پورب تک آدھے میں کٹ جائے گا اور اتری حصہ پوری طرح ہماری گرفت میں ہو گا۔'' کرنل اپنی مٹھیاں اس طرح جکڑ رہے تھے جیسے ہندوستان کا گلہ گھونٹ رہے ہوں۔

''جیسا آپ نے انیس سو پینسٹھ میں کرنے کی کوشش کی تھی''، وکرم نے چٹکی لی۔ ''ایسا نہیں ہے۔ دراصل 65 کی جنگ ''کھیم کرن'' مورچے پر ہمارے ٹینکوں کے ایکسپرٹ کچھ گمراہ ہو گئے تھے۔ لیکن اس بار ایسی غلطی نہیں ہو گی۔''

''سر، آپ کا مطلب ہے کہ ابھی تک ہماری فوج اور ایرفورس کی مشترکہ کوششوں سے ہم لوگ کسی خاص جیت کی طرف نہیں بڑھے ہیں؟ اب تک تو ہماری فوجیں آپ کے کسی خاص علاقے پر حاوی ہونے کی حالت میں ہونی چاہیے تھیں۔''

کرنل ایک دم چوکنا ہو گئے۔ شاید یہ بے وقوف نوجوان ہندوستانی پائلٹ جنگ کے کچھ خاص پہلوؤں سے پردہ ہٹا دے۔

''بے شک!'' کرنل سادگی سے بولے، ''آپ لوگوں نے کوئی پلان تو بنایا ہی ہو گا، خاص طور پر کہ آپ کو ہمارا کون سا علاقہ حاصل کرنا ہے۔'' کرنل صاحب پھر بدک گئے۔ ''مگر آپ ہم سے جیت بھی کیسے سکتے ہیں۔ یہ بنگال نہیں ہے میاں، پنجاب ہے۔ آپ پنجابی مسلمانوں سے بھڑے ہیں جناب۔ خواب دیکھتے رہیے۔ کمزور انسان طاقتور کے خلاف صرف خیالی پلاؤ ہی پکا سکتا ہے۔ سو آپ بھی یہی کیجیے۔''

اگر کرنل صاحب کا مقصد وکرم کو مشتعل کر کے اس سے کچھ اگلوانے کا تھا تو وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو چکے تھے۔ وکرم کی بھنویں چڑھ گئیں۔ اس کے نتھنے پھولنے لگے۔

جبڑے کھنچ گئے۔اسے آج تک ملے تمام پاکستانیوں کی باتیں رہ رہ کر یاد آنے لگیں۔واقعی سب میں ایک ہی طرح کی اینٹھن، پنجابی مسلمان ہونے کا ایک ہی جیسا گھمنڈ، اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھنے کی وہی پرانی اکڑ۔ایک طرف سے سب کے سب جھوٹے، بناوٹی اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے والے۔جیسے ہارتا ہوا انسان بڑی بڑی باتیں کر کے اپنی عزت آبرو بچانے کی کوشش میں مصروف ہو۔

''مجھے تعجب ہے۔آپ نے جو کچھ کہا وہ اصلیت سے بہت دور ہونا چاہیے،'' وکرم نے حوصلہ اور خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔

''کیا مطلب؟ آپ اپنی فوج سے کیا امید رکھتے ہیں''، کرنل بولے۔

''میں بتاتا ہوں''، وکرم نے طیش میں آ کر کہا۔'' آپ نے تو پچھم سے پورب ہی جانے والے ہیں اور نہ ہی ہندوستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا آپ کے بس کا ہے۔آپ پہلے بھی کوشش کر چکے ہیں 1965 میں۔کرنل صاحب! خواب آپ دیکھیے ہم خواب نہیں دیکھتے۔دیکھیے گا دس دن میں ہندوستانی فوجیں راولپنڈی میں مارچ کرتی دکھائی دیں گی۔'' وکرم خود پر قابو نہ رکھ سکا، دراصل وہ ایسے فوجیوں سے عاجز آ چکا تھا جو میدانِ جنگ سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے، لیکن لڑائی کے عنوان پر باتیں کرنی ہو تو زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں۔

''کیا؟ کیا کہا؟ دس دن میں تمھاری فوج راولپنڈی میں! جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ دیکھ رہے ہو— واہ کیا بات ہوئی...... کتنی جرأت رکھتے ہو ہمارے خلاف؟ ہم پنجابی بلوچ اور پٹھانوں کے خلاف؟ ہمارے جیسے مارشل ریس کے خلاف؟ تمھیں شاید معلوم نہیں ہے کہ ساری دنیا ہماری ہمت، ہمارے حوصلے اور ہماری جنگی صلاحیتوں کی دہائی دیتی ہے اور تم ہو کہ...... تمھاری فوجیں دس دن میں راولپنڈی پہنچ کر مارچ کریں گی؟''

پھر وہی ہینکڑی، وہی گھمنڈ۔وکرم پھر مشتعل ہو اٹھا۔اس نے بے وجہ پھیلی ہوئی ایسی تمام غلط فہمیوں کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''مارشل ریس؟ کون سی مارشل ریس؟ آپ کس غلط فہمی کے شکار ہیں؟'' وکرم نے بھنویں سکوڑتے ہوئے پوچھا۔'' آپ لوگ پنجابی بلوچ اور پٹھان، صرف آپ ہی لوگ بہت

بڑے لڑاکے ہیں؟ صرف آپ ہی؟ اور ہماری گورکھا، سکھ، ڈوگرا اور مراٹھا جیسی رجمنٹ بیکار ہے۔ ارے چھوڑیے! آپ کے لڑاکوں سے دس گنا زیادہ بہتر لڑاکے اور جانباز سپاہی ہماری قوموں میں ہیں۔''

''جی نہیں۔ یہ سب ''مارشل ریس'' کہلانے کے حقدار بالکل نہیں ہیں۔ ان کو انگریزوں نے ایک زمانے میں ''مارشل ریس'' کا درجہ دیا ضرور تھا، لیکن صرف اپنا مطلب نکالنے کے لیے۔ انھیں بڑھا چڑھا کر ان کی قربانی لینے کے چکر میں،'' کرنل نے اپنی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب ہم ان مراٹھوں، جاٹوں اور ڈوگروں کو بار بار ہرا چکے ہیں اور رہی بات راجپوتوں کی تو ان کی بساط ہی کیا.....وہ صرف اسی قابل ہیں کہ وقتاً فوقتاً اپنی خوبصورت بہو، بیٹیاں ہماری خواب گاہوں تک پہنچاتے رہیں۔ اب بچے سکھ، تو یہ کون سی بلا ہیں۔ ہمیشہ سمجھوتہ کرنے والے، پیروں کے تلوے چاٹنے والے، چاہے ہمارے، چاہے انگریزوں کے۔ نہیں مسٹر! ''مارشل ریس''، اصلی لڑاکے یا فتح حاصل کرنے والے جانباز یہیں رہتے ہیں ہمارے علاقوں میں، آپ کو تاریخ پھر سے پڑھنی ہوگی۔''

''بہت اچھا۔ اگر آپ تاریخ کی بات کرتے ہیں تو بتائیے۔ وہ کون سے ہندوستانی تھے جن کو انگریزوں نے اپنی زمینی فوج میں سب سے پہلے بھرتی کیا تھا؟ ان سپاہیوں کا تعلق کس علاقے سے تھا اور وہ کن قوموں کی پیداوار تھے؟'' وکرم نے پوچھا۔

''چلیے آپ ہی بتا دیجیے، ذرا ہم بھی ڈور کی طرح الجھے ہوئے آپ کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کریں،'' کرنل بولے۔

''تو سنیے!'' وکرم نے آسانی سے کہا۔ ''مجھے جہاں تک معلوم ہے۔ فرنگی حکومت کے شروعات کے دنوں میں سپاہیوں کو ''پوربیا'' کہا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سپاہی پچھمی بہار اور پوربی اتر پردیش سے بھرتی کیے گئے تھے۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستانی فوج کے پہلے سپاہی تھے۔ ان میں صرف تین ذاتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی لڑائی کے لیے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ٹھاکر، برہمن اور پٹھان جبکہ یہ پٹھان بھی اصلیت میں راجپوت ہی تھے جو بعد میں مسلمان ہو چکے تھے۔ اس میں کوئی شک یا کسی قسم کے شبہے کی گنجائش نہیں ہے سر!''

''نہیں شک کی کوئی بات نہیں،'' کرنل نے کہا۔ ''جس طرح انگریزوں نے ہندوستان

میں کلکتہ سے بڑھنا شروع کیا تھا۔ ایسا ''رکروٹمنٹ''(Recruitment) تو ہونا ہی تھا۔ مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''سر! میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ.......... جنھیں آپ اور ہم کمزور، غریب اور بیچارہ سمجھتے ہیں، انھیں ''پوربیوں'' کی مدد سے فرنگیوں نے بھارت میں اپنے قدم جمانے کی شروعات کی۔ انھیں لوگوں نے سارے ہندوستان کو فتح کرکے انگریزوں کی جھولی میں ڈال دیا۔ انھیں ''پوربیوں'' نے بکسر میں مغل فوجوں کو روندا، انھوں نے ہی ''روہیلوں'' کو خاک میں ملایا، اتنا ہی نہیں تین لڑائیوں میں سکھوں کو نانی یاد دلانے والے بھی یہی تھے۔ یہ سب تو چھوڑیے، آپ کی ''مارشل ریس'' کہے جانے والے پنجابیوں بلوچوں اور پٹھانوں کو روندتے ہوئے افغانستان تک پہنچ جانے والے بھی یہی ''پوربی'' ہی تھے اور تو اور ان ''پوربیوں'' نے انگریزوں کو پورا افریقہ فتح کر کے دے دیا اور چین تک گھستے چلے گئے۔ اگر سوچا جائے تو اصل میں انھیں ''پوربیوں'' نے، ''جنھیں آپ حقارت سے ''نان مارشل'' کہتے ہیں، برٹش کی اتنی عظیم حکومت قائم کی جس میں سورج کبھی غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔''

''نہیں! یہ سب اتنا آسان نہیں تھا، جتنا آپ سمجھ رہے ہیں اور مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ برٹش سلطنت کی توسیع صرف ایک ہی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی اور بھی وجوہات تھیں۔'' وکرم سمجھ رہا تھا کہ کرنل صاحب بھی اس کی دلیلیں اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ یہ دلیلیں کس سمت کو جا رہی ہیں۔ مگر وہ ان شکوک وشبہات سے پیچھا چھڑانے میں قاصر تھے جو ان کے خون کے ایک ایک قطرے میں رچا بسا ہوا تھا۔

''مگر اس سے ایک بات تو ظاہر ہوتی ہی ہے سر!'' وکرم روانی میں کہتا ہی چلا گیا۔ ''کوئی بھی جماعت کیوں نہ ہو اگر اس کو اچھی ٹریننگ دینے کے ساتھ ساتھ بہترین تربیت میں بھی ڈھال دیا گیا ہو تو وہ کبھی نہ کبھی ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھر کر ضرور سامنے آتی ہے۔ انگریزوں نے اکثر پرسکون علاقوں سے زیادہ مارکاٹ پر بھروسا نہ کرنے والوں کو لے کر بہترین ملٹری ٹریننگ دی اور با صلاحیت انگریز افسروں کی رہنمائی میں انھیں ایک طاقتور فوج کی صورت میں ڈھالا۔ یہ الگ بات ہے کہ 1857ء کے غدر کے بعد انگریزوں نے ان لوگوں کو نا قابلِ اعتماد ہی نہیں سمجھا بلکہ ان

کی جنگی صلاحیتوں پر سوالیہ نشان لگا کر انھیں فوج سے نکال بھی دیا اور اس کے بعد 57 کے غدر کو کچلنے کے لیے جن ذاتوں اور برادریوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا، ان کی چاپلوسی میں انگریز انھیں ''مارشل ریس'' کا درجہ دینے لگے۔ جیسے ''سکھ'' اور ''آپ''۔ کرنل صاحب کچھ بول نہیں پار ہے تھے اور وکرم تھا کہ ان کی ''مارشل ریس'' کی دھجیاں ہی اڑا ڈالنا چاہتا تھا، ایک ایسے بناوٹی اور بے بنیاد پروپیگنڈے کے بل پر کچھ خاص ذاتوں اور برادریوں کے لوگ خوامخواہ مونچھوں پر تاؤ دیے پھرتے ہیں اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی کوشش میں مصروف رہا کرتے ہیں۔

''سر! ہم دونوں کی فوجیں ایک ہی طرح سے ٹرینڈ کی گئی ہیں، ساتھ ہی ان کے ضابطے اور ان کی روایتیں بھی ایک جیسی ہی ہیں کیونکہ انگریزوں کے قائم کردہ دستور دونوں ہی ملکوں میں آج تک برقرار رہے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ ایک چیز فیصلہ کن ثابت ہوگی اور وہ ہے ''قیادت اور لیڈر شپ''۔ اگر ہماری فوج میں نیچے سے اوپر تک بھی اپنی روایتوں سے پوری طرح بندھے رہیں اور حلف لیتے وقت زبان سے ادا کیے گئے تینوں الفاظ فرض، عزت نفس اور وطن پروری کو ذہن میں رکھیں اور جنگ کے وقت مقدم مان کر چلیں تو یقیناً ان کی فتح ہوگی۔ ان کے کارنامے اپنی فوج اور اپنے ملک کے ساتھ ساتھ خود کو بھی عزت و عظمت کا احساس دلائیں گے اور اگر وہ اپنے مقصد سے ذرہ برابر بھی ادھر ادھر ہوئے یا معیار سے ہٹ کر کوئی بھی حرکت کی تو حالات 1962 کی ہند چین جنگ جیسے ہوں گے، جس میں سینئر افسروں کی ناسمجھی حیلہ حوالی اور حکومت کے ذمے داروں کو صحیح رائے دینے کی ہمت نہ کر پانے کی وجہ سے ہمیں زبردست شرمندگی اٹھانی پڑی۔'' وکرم نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''تو دیکھیے سر! اس بار کس کی قیادت کتنی زوردار رہتی ہے کیونکہ سب کے بعد ''قیادت'' ہی جیت اور ہار کے فاصلے کو ختم کرتی ہے۔''

کہیں کہیں کرنل صاحب کو وکرم کی خوشگوار نہ لگنے والی بات چیت سے پیدا شدہ ماحول کی سختی اور سنجیدگی اس کے قہقہوں سے قدرے کم ہوئی اور کرنل صاحب کو موقع بھی نصیب ہوا کہ وہ چاہیں تو گفتگو کا رخ کسی اور جانب موڑیں یا پھر وکرم کو فرصت دیں۔

وکرم ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دوسری آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا.....اور یہ زمینی فوج کے لوگ آپ کے ساتھ کس طرح پیش آ رہے ہیں؟ اس کے کچھ سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ

آخر یکایک آرام کرسی میں سمائی ہوئی شخصیت کس طرح بدل گئی یا کرنل صاحب کے پہلو سے نیلی وردی میں ایک پرچھائیں کہاں سے نمودار ہوگئی۔ بالکل ہندوستان کی ایئرفورس کے ''ایئرکموڈور'' کی طرح۔ وہی بلیو یونیفارم وہی ٹیونک، وہی کلائی پر موٹی رینک کی پٹی، ویسے ہی چڑیوں کے پَر کی طرح ''ونگس''۔ بس فرق اتنا تھا کہ اس وردی میں تینوں شیروں کی جگہ'' چاند اور ستارہ'' لگا ہوا تھا۔ وکرم کو کچھ ایسے اپنے پن کا احساس ہوا کہ اس کے ہونٹ خود ہی بول پڑے۔

''گڈ ایوننگ سر!''

کرنل صاحب بغیر کچھ کہے سنے وہاں سے جا چکے تھے، وکرم یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آخر اس شخص کی گفتگو کا مقصد کیا تھا۔ اس نے کوئی خاص بات بھی نہیں پوچھی بلکہ اتنی دیر تک صرف ادھر ادھر کی باتوں میں سر کھپاتا رہا، کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے صرف وکرم کی شخصیت کا تجزیہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو اور اگر یہ سچ ہے تو کیوں اور کس لیے؟

''آپ ''سکھوئیہ سیون'' ہی اڑا رہے تھے جب ہمارے فوجیوں نے آپ کو نیچے گرایا؟'' ''ایئرکموڈور'' نے سیدھے ایئرفورس سے متعلق سوال کیا۔

''جی ہاں،'' وکرم نے مختصر جواب دیا۔

''ذرا زیادہ ہی بڑا اور بھاری جہاز ہے۔ دوسرے روسی جہازوں کی طرح.....'' انھوں نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔'' چلانے میں کیسا ہے؟''

''اچھا ہی چلتا ہے۔ خاص طور سے فائرنگ کے لیے تو بالکل ہی موزوں ہے،'' وکرم نے جواب دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ پیشہ ور پائلٹ اس سے جہازوں کے بارے میں ہی کچھ خاص سوالات کرے گا۔

''ہمارے پائلٹس نے بھی کچھ روسی جہاز اڑائے ہیں، ہمیں ان کے بارے میں کافی کچھ معلوم بھی ہے لیکن یہ رات کی اڑان کے لیے کیسا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ نائٹ فلائنگ کے لیے آپ لوگوں کے ''سکھوئیہ'' میں کچھ خاص ''انسٹومنٹ'' ہیں کیا؟'' ایئرکموڈور وکرم سے اس طرح گفتگو کر رہے تھے جیسے وہ دونوں کسی ''ہال'' کے بجائے پائلٹس کے ''کریو روم'' (Crew Room) میں بیٹھے ہوں۔

وکرم ایک جھٹکے میں سمجھ گیا کہ ایئر کموڈور صاحب کس پریشانی میں مبتلا ہیں۔ دراصل راتوں راتوں میں بار بار ہونے والے ہندوستانی حملوں نے صرف بہت سے فوجی ٹھکانوں کو ہی تہس نہس نہیں کیا بلکہ پاکستانی ایئرفورس کے لیے خاصی پریشانی کا سبب بھی بنے ہوئے ہیں۔ بہت کم اونچائی پر اڑنے والے ان جہازوں سے بچاؤ کے سارے طریقے ناکام ہو چکے ہیں، حدتو یہ ہے کہ بہت نیچے ہونے کی وجہ سے دشمن کے ''راڈار'' بھی انھیں دیکھ نہیں پاتے اور یہ جہاز بڑے ہی آرام سے آکر بم برسا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کی دہشت ملٹری اور عوام دونوں کو ہی بری طرح خوفزدہ کیے ہوئے ہے۔

''نائٹ فلائنگ کے لیے دوسرے جہازوں کی ہی طرح یہ بھی ہیں،'' وکرم نے نہایت ہی ایمانداری سے کہا۔ لیکن ایئر کموڈور کے اس جواب سے قطعی مطمئن نہیں لگے۔

''اور جہازوں کی طرح؟'' انھوں نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔ ''کم آن''، ''ویمپائر'' اور ''ہنٹر'' جیسے جہازوں میں بھی صرف اتنی ہی سہولت ہے کہ وہ راتوں میں بخیریت اتر سکیں، لیکن آپ کے ''مگ'' اور ''سکھوئیہ'' تو راتوں میں حملہ کرنے کے لیے کچھ خاص آلے اور مشینوں سے لیس معلوم ہوتے ہیں۔''

''کم سے کم ہمارے ''سکھوئیہ'' تو نہیں،'' وکرم نے جواب دیا۔

''اچھا جب آپ کہتے ہیں کہ فلاں جہاز راتوں میں اڑان بھر سکتا ہے، تو اس میں کون سے خاص کل پرزے ہوتے ہیں؟''

''جی! کاک پٹ اور انسٹومنٹ دکھانے والی لائٹ، زمین پر اترنے کے لیے لینڈنگ لائٹ اور پنکھوں میں لگی باہری لائٹ اور کیا؟'' وکرم نے کہا۔

''مگر آپ راتوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے کیسے ہیں؟ کسی خاص جگہ یا خاص نشانے پر، وہ بھی کسی ایسے انسٹومنٹ کے بغیر، جو آپ کو اس خاص جگہ کا اندازہ ہی نہیں کراتا بلکہ اس جگہ کے ''عرض البلد'' اور ''طول البلد'' کی صحیح جانکاری بھی دیتا ہو؟''

وکرم نے زور دے کر کہا، ''آپ کا مطلب ''ڈاپلر'' (oppler. جی۔پی۔ایس''؟

تو ہمارے جہاز میں ایسا کوئی آلہ یا پرزہ نہیں ہے۔''

''نہیں ہے تو تمھارے پائلٹ راتوں میں کیسے ہمارے ہوائی اڈے ڈھونڈ لیتے ہیں؟ کس طرح یکا یک آکر دو چار بم گرا کر سرک لیتے ہیں؟ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے ہم ہی کچھ بیکن (Beacon) وغیرہ سے انھیں راستہ دکھا کر بلا لیتے ہوں۔''

''سر! سمت بتانے کے لیے ایک قطب نما، دوسرے صحیح وقت کے ساتھ ساتھ ساکت اور متحرک بتانے والی ایک گھڑی ہی کافی ہوتی ہے۔ جس سے ہم سب اپنے نشانے تک پہنچتے ہیں، رات ہو یا دن۔'' وکرم نے آسانی سے کہا۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کی باتیں قابلِ یقین ہیں؟'' ایئر کموڈور کچھ غصے سے بولے۔ ''کیا ہندوستانی پائلٹ اتنے تیز ترّار اور باصلاحیت ہیں کہ بغیر کسی مدد کے ہمارے کسی بھی ٹھکانے پر پہنچ سکتے ہیں؟ اب آپ صحیح جانکاری دینا شروع کریں۔''

''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہمارے جہازوں میں ایسے کوئی کل پرزے نہیں ہیں اور اب کتنی بار بتاؤں؟ اور اگر میری بات آپ کی سمجھ سے بالکل پرے ہی ہے تو ہمارے وہ جہاز جو کریش ہو کر آپ ہی کی سرزمین پر کہیں نہ کہیں بکھرے پڑے ہوں گے آپ خود ہی ان کی تحقیق کیوں نہیں کر لیتے۔''

''وہ تو ہم دیکھ بھی لیں گے اور پتہ بھی لگا لیں گے؛'' ایئر کموڈور اب دھمکی بھرے لہجے پر اتر آیا۔ ''مگر میں نے تم سے پوچھا ہے اس لیے مجھے صحیح جواب صرف تم سے چاہیے، وہ بھی کل صبح تک۔ اگر تم اس کے بعد بھی جھوٹ بولے تو ایک ایسی ٹیم کے حوالے کر دیے جاؤ گے جس کی ڈکشنری میں صبر و رحم جیسے الفاظ نہیں ہوتے۔''

اپنے انھیں سلگتے ہوئے جملوں کے ساتھ ایئر کموڈور رخصت ہوا۔ وکرم اس سے ہوئی بات چیت کے بارے میں دیر تک سوچتا رہا۔ آخر اس نے سچ ہی تو بتایا تھا مگر وہ ہیں کہ بھروسا کرنے پر کسی بھی طرح تیار ہی نہیں ہیں۔ ہاں اس نے یہ حقیقت ضرور چھپائی کہ کچھ بہت ہی باصلاحیت پائلٹ ہی راتوں کے حملے کے لیے خصوصی طور پر ٹرینڈ کیے جاتے ہیں جو کچھ عام کل پرزوں کی ہی

مدد سے ایسے کرشماتی حملے کرنے کے اہل ہوتے ہیں اور یہ ان کی کامیابی کا ثبوت ہی ہے کہ آج پاکستانی ان کے حملوں سے بچنے کے طریقے ہی نہیں ڈھونڈ پا رہے ہیں بلکہ اس پریشانی اور بے چینی کا حل ڈھونڈنے کے لیے بوکھلائے پھر رہے ہیں۔

اس ایئر کموڈور نے وکرم کو ''دوسری صبح'' تک کا موقع دیا تھا۔ حالانکہ اپنی جھنجھلاہٹ میں وہ اسے بڑے ہی سخت حالات میں ڈال سکتا ہے لیکن ......کل ایک دوسرا سورج نکلے گا، دوسری صبح ہوگی اور دوسرا دن ہوگا جسے ''کل'' کہا جائے گا۔ آنے والا کل اور آنے والے کل میں کیا خبر کیا رہے اور کیا نہ رہے۔ انھیں خیالات میں ڈوبے وکرم نے کمبل تان لیا اور اپنے آپ کو نیند کے آغوش کے حوالے کر دیا۔

—

باب چھ

اپنے لوگ، اپنے ساتھی

"گارڈ......! گارڈ......!" بند کمرے سے قیدی نے آوازیں دیں۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

"گارڈ......!" اس نے پھر پکارا، اس بار قدرے چیخ کر۔ لیکن اس بار بھی اس کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ شاید گارڈ دروازے کے باہر مقرر کردہ اپنی مخصوص جگہ پر نہیں تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی "ضرورت" سے فارغ ہونے گیا ہو یا پھر چائے وغیرہ کی طلب پیش آگئی ہو۔ بہر حال یہی کچھ سوچ کر قیدی نے کچھ دیر انتظار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

جیل کی اس سیل میں اس وقت بھور کا دھندلا اجالا چھایا ہوا تھا۔ ایک بلب جو رات بھر ٹمٹماتا رہتا تھا، صبح قیدی کی فراغت کے لیے دروازہ کھولتے وقت بجھا دیا جاتا تھا۔ اس وقت کمرے میں دروازے کی جھریوں سے ہوکر کچھ روشنی آرہی تھی۔ بلکہ ایک بڑی دراز سے قیدی کو باہر کی دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ اس دیوار میں اس کے علاوہ کوئی اور خاص بات نہیں تھی کہ وہ اس وقت آفتاب کی کرنوں سے چمک رہی تھی۔ اس نے ابھی تک تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ جہاں ہے وہاں روشنی دھوپ اور گرمی کا گمان بھی کیا جاسکتا ہے۔ کئی روز سے وہ اس ٹھنڈے اور اندھیرے کمرے میں قید تھا۔ دن بھر اندھیرا، رات میں بمشکل تمام دس واٹ کا بلب، نہ تازہ ہوا نہ دھوپ کی گنجائش۔ پیشاب پاخانے کے لیے دن میں تین چار بار باہر لے جایا جاتا وہ بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کر، کُل

دس قدم کی دوری طے کر کے۔

لیکن دو روز پہلے یکا یک اسے کچھ زیادہ دور لے جایا گیا۔ ایک کرسی پر بیٹھا کر جب اس کی آنکھیں پٹی سے آزاد کی گئیں تو اس نے خود کو اونچی دیواروں سے گھرے ایک آنگن میں پایا۔ پورا ایک گھنٹہ اسے دھوپ میں بیٹھنے دیا گیا تھا۔ لیکن وہ دو دن پہلے کی بات تھی، معلوم نہیں آج بھی کوئی اسے باہر لے جانے کی زحمت اٹھائے گا یا نہیں۔

وکرم کو اسپتال کے آرام دہ شب و روز اور بہترین تیمارداری سے یکا یک محروم کر کے اس ٹھنڈی اور اندھیری کوٹھری کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ یہاں لیٹنے کے لیے ایک ڈھیلی چارپائی اوڑھنے اور بچھانے کے لیے ایک ایک عدد کمبل ہی نصیب ہوئے۔ اس طرح ایئر کموڈور کی گذشتہ دھمکی کا پہلا حصہ سامنے آ چکا تھا۔ تازہ حالات سے خاصہ گھبرایا ہوا وکرم ان ''مخصوص'' لوگوں کا منتظر تھا جو اس سے سچ اگلوانے کے لیے آنے والے تھے۔ خوفناک انتظار، نیند اور تکان سے بوجھل حالات کے بیچ لمحے، گھنٹے اور پھر کئی دن گذر گئے۔ کوئی نہیں آیا۔ ایک رات جب پاخانے کے لیے وکرم کی کوٹھری کا دروازہ کھولا گیا تو باہر تیز روشنی دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ یہ تھی ہی عجیب بات کیونکہ اسپتال تک میں بہت ہی سختی کے ساتھ ''بلیک آؤٹ'' یعنی ''مکمل اندھیرا'' رکھا جاتا تھا آخر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ وکرم نے سوچا— کیا ''بلیک آؤٹ'' کی ضرورت نہیں رہی؟ کیا راتوں میں ہوائی حملوں کا خطرہ ختم ہو چکا ہے؟ کیا یہی وجہ تھی کہ وہ ''مخصوص'' لوگ پوچھ تاچھ کے لیے نہیں آئے تھے یا ان کے آنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی، اور وکرم تھا کہ بلاوجہ کی پریشانی اور ڈر میں دن کاٹ رہا تھا۔ پہرے پر ایک بدمزاج اور بدتمیز پولس کارپورل کے تعینات ہونے کی وجہ سے وکرم نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر دوسرے دن صبح ہوتے ہی ایک بھلے سے پٹھان گارڈ کے دروازہ کھولتے ہی وکرم نے اندھیرے میں تیر مارا۔ ''لڑائی ختم ہوئی............ چلیے اچھا ہوا۔''

جواب میں گارڈ نے صرف اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے سے کسی قسم کی مسرت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن جنگ کے خاتمے کی تصدیق ہو چکی تھی۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس کی ''مزاج پرسی'' کے لیے کیوں کوئی نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ واضح ہوتا گیا کہ ہار کے ماحول میں پاکستانی حکمرانوں خاص طور سے فوج کے لوگوں کے درمیان افراتفری، الجھنوں اور اندیشوں کی عجیب سی

صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ کچھ دنوں تک اس بات کی وضاحت نہیں ہو پا رہی تھی کہ کون حکومت میں رہے گا؟ کون نہیں؟ کون بچے گا اور کس کا سر قلم کیا جائے گا۔ سب اپنے اپنے حساب کتاب میں الجھے ہوئے تھے اور سارے کام جہاں کے تہاں رکے ہوئے تھے۔

''گا......ر......ڈ......!'' وکرم نے زور سے پکارا۔

''کیا بات ہے؟'' گارڈ نے پنجابی میں پوچھا۔

''ذرا کارپورل کو بلایئے،'' وکرم نے کہا۔ دراصل خاص باتیں ان سپاہی گارڈوں کے بس کی نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے لیے ایئر فورس پولیس کا کارپورل ہی مناسب ہوتا تھا۔

''باتھ روم جانا ہے کیا؟'' گارڈ نے انسانیت سے پوچھا۔

''نہیں! مجھے کارپورل سے ہی کچھ باتیں کرنی ہیں،'' وکرم نے اصرار کیا۔

''او......کے،'' یہ گارڈ عموماً انگریزی بولنے کے مواقع مشکل سے ہی چھوڑتے ہیں۔ باہر سے چابیاں نکالنے کی آواز آئی۔ تالا کھلنے کے بعد پہلے سلاخوں کا دروازہ کڑکڑاتا ہوا کھلا اور پھر لکڑی کی کواڑیں۔ یکا یک کوٹھری روشنی سے منور ہو اٹھی۔ وکرم نے کئی بار سوچا تھا کہ اس جیسے زخموں سے چور قیدی کے لیے کیا واقعی اس قدر تالے یا ایسے زبردست بندوبست کی ضرورت تھی؟ مگر فوج کے اپنے قاعدے قانون اور ضابطے ہوتے ہیں لہٰذا بہتری اسی میں ہوتی ہے کہ ان سے کسی طرح کی بھی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔

کارپورل خان نے اپنے جانے پہچانے انداز میں پوچھا،'' تو آپ کے رات اور دن کیسے رہے؟'' خان صاحب الگ الگ دنوں میں الگ الگ وقت پر الگ الگ طرح کا تخاطب استعمال کر چکے تھے۔ لگتا تھا کہ آج آخر میں انھیں یہی تخاطب راس آیا جو ہر وقت میں ہر طرح کے حالات پرکھ لینے کی باقاعدہ اہلیت رکھتا تھا۔ آئندہ آٹھ مہینوں میں ان کی بات چیت ہمیشہ اسی جملے سے شروع ہوتی رہی صرف ایسے وقت کو چھوڑ کر جب کہ وہ ناراض ہوتے ہوں۔ ایسی حالت میں ان کی آنکھیں تو لال ہوتی ہی تھیں وہ خود بھی لال ہو جاتے تھے اور قطعی خاموش۔

وہ اپنے تخاطب کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ روز کی طرح وکرم نے کہا،'' ٹھیک بالکل ٹھیک رہے۔''

''پیٹھ میں تکلیف زیادہ تو نہیں ہوئی؟'' خان نے نرمی کے ساتھ پوچھا۔

''زیادہ نہیں''، وکرم بولا۔ ''کیا آج مجھے باہر لے جائیں گے؟ یہاں بہت ٹھنڈا ہے۔ کچھ دیر دھوپ میں.........''

''دھوپ کے لیے تو میں نہیں کہہ سکتا''، خان اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولے، ''مگر کہیں تو لے ہی چلیں گے آپ کو۔''

''کہاں؟'' وکرم نے پوچھا۔

''کہیں.........''، خان کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ جہاں بھی جانا ہوگا وہاں شاید ناپسندیدہ کچھ بھی نہ ہو۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی اس لیے قیدیوں کے رکھ رکھاؤ میں کچھ نہ کچھ تبدیلی تو آنی ہی تھی۔

تقریباً گھنٹہ بھر بعد دروازہ کھولنے کی قواعد پھر دہرائی گئی اور اس بار نازل ہوئے ہلکے قد اور بھاری جسم والے ماسٹر وارنٹ افسر نقوی۔

''م......م......مجھے م......م......معلوم ہوا ہے کہ آپ ب......ب...... باہر ن...... ن......نکلنا چ......چ......چ......چاہتے ہیں،'' وہ ہکلائے۔

''جی ہاں۔''

''ب......ب......باہر تو ل......ل......لے چ......چ......چلیں گے م......م......مگر د......د......دھوپ میں نہیں،'' وہ بمشکل تمام گویا ہوئے۔

''کیا کسی دوسرے کیمپ، جیل یا اسپتال لے جانے کا ارادہ ہے؟'' وکرم نے بغیر کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''د......د......دیکھیے ش......ش......شاید کچھ خ......خ......خوشگوار......'' انھوں نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

خوشگوار کیا......بہت ہی خوشگوار۔ کیوں کہ جب وکرم کو بغیر آنکھوں پر پٹی باندھے ہی باہر لے جایا گیا تھوڑی ہی دوری پر ایک اور کمرے کی طرف۔ ابھی وہ کچھ دور ہی تھا کہ اسے بڑے ہی جوش بھرے لہجے میں بات چیت کرتے ہوئے کچھ لوگ محسوس ہوئے۔ جیسے بہت سے لوگ اپنے

اپنے دل میں آئی ہوئی باتیں ایک ساتھ ہی کہہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ وکرم نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک دم سے سناٹا ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے لفظوں میں نہ بیان ہونے والا شور۔ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو پہچاننا اور پھر آپس میں لپٹ جانا۔ اُف

''ارے......وکرم سر۔'' ملند بھاگ کر آیا اور پلک جھپکتے ہی اس نے وکرم کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

''آ......ہ......آہستہ ملند'' وکرم بولا۔ ملند نے اپنی بانہیں ڈھیلی کیں اور وکرم کو جگہ جگہ سے چھو کر دیکھنے لگا۔

''افوہ......اس ڈھیلی جیکٹ کے اندر پلاسٹر بھی ہے۔ اس کا تو احساس ہی نہیں ہوا۔ آپ کرسی میں بیٹھ جائیں،'' وہ بولا۔

''آپ کو تو اسپتال میں ہونا چاہیے،'' آدتیہ بولا، ایک ''مسٹیر'' جہاز کا پائلٹ، چھ فٹ کا چھریرا جسم لیکن اس قدر کمزور اور چہرے سے بالکل زرد زرد۔

''تمھیں تو خود بھی اسپتال میں ہونا چاہیے۔ کیا ہوا؟'' وکرم نے غمگین لہجے میں پوچھا۔

''تھوڑا سا خراب وقت......سر۔'' آدتیہ نے قید ہونے کے بعد کی بہت سی اذیتیں رائفل کی بٹوں سے مارے جانے کی بات سنسر کرتے ہوئے بیان کیں۔

یہ بڑے ہی حساس اور دل دہلا دینے والے لمحات تھے۔ یہ سارے پائلٹ ایک دوسرے کے حالات اور مقدرات سے ابھی تک پوری طرح بے خبر تھے۔ ان میں کس کے ساتھ کیا ہوا، کتنے شہید ہوئے، کون زندہ بچا، اس کی معلومات کسی کو نہیں تھی۔ سامنے منوہر کھڑا تھا۔ ہندوستان میں ہی بنے ہوئے ایچ ایف 24 کا پائلٹ، ہمیشہ مگن مست رہنے اور ہر وقت دوسروں کے دکھ درد بانٹنے کے لیے تیار رہنے والا جوان۔ جہاز میں آگ لگنے کے بعد پیراشوٹ سے وہ سندھ کے قریب ایک گاؤں میں گرا تھا۔ اپنے عملی اخلاق اور برتاؤ سے گاؤں والوں کو یہ یقین دلانے میں اسے بھرپور کامیابی ملی تھی کہ وہ ایک پاکستانی پائلٹ ہے جس کا جہاز حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ پھر کیا تھا اس کی خوب آؤ بھگت اور خاطر تواضع کی گئی۔ گاؤں والوں نے اس کی یونٹ تک واپسی کے لیے ایک اونٹ کا انتظام بھی کر دیا تھا، لیکن بدقسمتی سے نماز کے وقت انھیں منوہر کی نماز مشکوک لگنے

لگی اور اصلیت واضح ہوگئی۔ آخر کار بے چارے منوہر کو جوتوں اور چپلوں سے نوازا بھی گیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر اسی اونٹ کے ذریعے پولیس کے حوالے بھی کیا گیا۔

وہاں موجود سب سے کم عمر پائلٹ پَرسی تھا۔ جس نے صرف تین دن جنگ میں حصہ لیا تھا۔ بڑا ہی مہذب، دھیمی آواز میں گفتگو کرنے والا یہ عیسائی افسر اپنے حالات سے ابھی تک بھونچکا تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ کہاں پھنس گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کھڑے تھے ہریش سنگھ، جنھیں ''ہیری'' کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ ایک راجسی خاندان کے راجپوت راجکمار، اپنی وراثت میں ملی خاندانی بہادری پر اٹوٹ بھروسا اور فخر کرنے والے، اور ہمیشہ دوسروں سے بھی یہی منوانے کو بے قرار، سدا ایک طرح کی ایسی جلدی میں، جیسے راستے کے کسی پڑاؤ پر رکتے ہی کوئی اگلے سفر کو بے چین رہے اور سب سے پرسکون و چھوٹے چھوٹے جملے ادا کرنے والے، پھرتیلے اور لچیلے جسم کے ''سنتی'' جن کا پیراشوٹ سے اترتے ہی رائفل کی گولیوں نے استقبال کیا تھا۔ ایک گولی ان کے پیٹ کو تھوڑا سا ''مس'' کرتے ہوئے نکلی تھی جس کی وجہ سے ٹانکے لگے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر میں کمرے کا دروازہ پھر کھلا اور اندر داخلہ لیا ''سنتا'' نے۔ سب کو کچھ دیر متعجب آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ آنکھیں نم ہوآئیں زبان سے بغیر کچھ کہے آہستہ سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ سب سمجھ گئے کہ ان کی پیٹھ میں چوٹیں آئی ہیں۔

''سنتا! یار تم کب آئے؟'' کسی نے پوچھا۔

''سترہ تاریخ کی شام کو،'' سنتا بولے۔

''سترہ کو''، سنتا نے کچھ شرماتے ہوئے جواب دیا۔ جنگ بندی کے ایک گھنٹہ پہلے ہم یہاں پہنچے یہ وہ وقت رہا ہوگا جب لڑائی بہت گھماسان کی ہو جاتی ہے اور ایک ایک انچ زمین کے لیے جانیں داؤ پر لگا دی جاتی ہیں۔

''بہت خوب۔'' ''برٹی'' ایک تمل عیسائی افسر جو ہمیشہ اپنے بازوؤں کی مچھلیاں ابھارنے میں مصروف رہتے تھے، پر مذاق لہجے میں بولے۔ ''بڑے وقت سے آگئے تم سنتا، ذرا سوچو اگر تھوڑی سی بھی دیر ہو جاتی تو یہ مزے کہاں نصیب ہوتے۔''

''ارے سنتا! جلدی جلدی بتاؤ جنگ میں کیا کیا ہوا؟ تم تو آخری وقت تک وہاں تھے؟''

ایک سکھ افسر ''گیری'' نے بے قرار ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

''رکیے''، وہاں موجود اکیلا پارسی افسر ''تیمل'' بولا۔ پہلے ہم دیکھ لیں کہ پاکستانیوں نے ہمیں سننے کے لیے کہیں کچھ لگا تو نہیں رکھا ہے۔

''تیمل'' راجستھان کے ایک مورچے پر بری فوج کے ساتھ ''ایئر کنٹرولر'' کی ڈیوٹی پر تعینات تھا۔ اس کا خاص کام تھا، حملہ کرنے آئے جہازوں کی دشمن کے ٹھکانوں کی طرف رہنمائی کرنا جو تیزی سے بدلتے ہوئے زمینی حالات میں ضروری تھا۔ ہماری فوج اس مورچے پر بڑی تیزی کے ساتھ دشمن کے علاقے میں گھس رہی تھی۔ ان سے بھی آگے نکل جانے کی ہوڑ میں ''تیمل'' موصوف اپنی جیپ میں بہت آگے نکل گئے۔ رات کے اندھیرے میں انھوں نے ایک فوجی کیمپ دیکھا، گاڑی روکی اور ترنت اس میں داخل ہو گئے۔ بڑی ہی اسٹائل سے ایک خیمے کا پردہ اٹھا کر زور سے ''ہیلو'' ہی کہہ سکے تھے کہ ریوالور کا ایک شاٹ گونج اٹھا۔ گولی بائیں کوہنی میں لگی اور وہ درد سے چیخ پڑے۔

''ابے گدھے کیا کر رہا ہے؟'' وہ اپنے حملہ آور پر برس ہی رہے تھے کہ یکا یک انھیں احساس ہوا کہ وہ تو ایک پاکستانی افسر کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ تو خوش قسمتی کہیے کہ پاکستانی افسر نے دوسرا فائر نہیں کیا۔ اس طرح ''تیمل'' صاحب قیدی بنا کر راولپنڈی روانہ کر دیے گئے۔

تیمل اب دوبارہ کسی جال میں پھنسنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی سراغ رسانی کامیاب رہی اور ایک میز کے نیچے واقعی ایک مائکروفون لگا ہوا ملا۔ جس کا تار کھینچ کر اسے ناکارہ بنایا گیا۔

''سنتا'' لڑائی کا بیورہ شروع ہی کرنے والا تھا کہ دروازہ پھر کھلا اور ''نقوی'' کے پیچھے پیچھے دو پاکستانی فوجی ایک ہندوستانی پائلٹ کو اٹھائے ہوئے داخل ہوئے۔ یہ تھے مہاراشٹر کے ''کامت''، جنھیں سب ''کیمی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے دونوں گھٹنے اور ایڑیوں کے اوپر کے جوڑ ٹوٹ چکے تھے۔ اس لیے نیچے سے اوپر تک دونوں پیر پلاسٹر کی قید میں تھے۔ انھیں ایک کرسی پر بٹھایا گیا اور پیروں کو سیدھا کر کے ایڑیوں کی طرف ایک اسٹول رکھ دیا گیا۔ سب نے باری باری ان سے ہاتھ ملائے اور خیر خیریت پوچھی۔ لیکن ان کی چوٹیں دیکھ کر سبھی کچھ ایسا دکھ اور لاچاری

محسوس کر رہے تھے کہ کسی طرح کی بات چیت کا سوال ہی نہیں رہ گیا بلکہ سب کے چہروں پر صرف تسلی اور ہمدردی کے اثرات ہی نمایاں تھے۔

ماحول بہت ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن حالات سے متاثر نہ ہونے کی کوشش ایسے وقت کی سب سے اہم ضرورت ہوا کرتی ہے لہٰذا وکرم نے جوش بھری آواز میں زور سے کہا— "ارے بھائیو! زندہ بچ نکلنا بھی تو بہت بڑی بات ہے۔"

"بالکل سر"، سب سے زیادہ چوٹوں کے شکار "کیمی" نے جوش کے ساتھ حامی بھری۔ "زندگی ہے تو امکانات بھی ہیں۔ آگے کا آگے دیکھا جائے گا۔ آئندہ کبھی حساب برابر کر لیں گے۔" دکھ درد لاچاری اور ناامیدی کا گرا ہوا پردہ ہٹ گیا۔ سب کے سب نئے جوش کے ساتھ فخر سے سر اونچا کیے ہوئے کھڑے رہے۔

باہری دروازہ پھر کھلا۔ سب نے چونک کر اس امید کے ساتھ اس طرف دیکھا کہ پھر ان کا کوئی دوسرا ساتھی لایا جا رہا ہے۔ لیکن اندر داخل ہوئے پاکستانی ایئر فورس کے اسکواڈرن لیڈر عثمان۔ دراصل وہ اس قیدی کیمپ کے نگراں تھے۔ عثمان صاحب کی ایک خاصیت تھی کہ وہ جو بھی کرتے تھے ہمیشہ خوش مزاجی سے مسکرا کے کرتے تھے۔ وہ چاہے اچھا کرنا ہو یا برا۔ مگر آج تو انھیں مسکرانے کا موقع تھا ہی کیونکہ ان کے پیچھے دو جوان آرہے تھے جن کے ہاتھوں کیک اور چائے سے لدی ٹرے تھی۔

"آپ سب کو بڑے دن کی بہت بہت مبارکباد" وہ بولے۔ "آج کرسمس کا دن ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ خود آپ کو اس کی مبارکباد دوں۔"

اتنے دنوں کی قید تنہائی کے بعد ایک دم سے اپنے لوگوں، اپنے ساتھیوں سے ملنے کی خوشی اور حوصلے میں سب بھول ہی گئے تھے کہ آج تاریخ کیا ہے، آج کون سا مخصوص دن ہے، ایسی بھول کہ ان میں سے کئی عیسائی افسروں تک کو اس کی خبر نہیں تھی مگر اب عثمان صاحب کی طرف سے ہوئے اعلان کے بعد سبھی ایک دوسرے کو "بڑے دن" کی بدھائی دینے میں مصروف ہو گئے۔ کیکوں پر حملہ بول دیا گیا اور چائے کے پیالے ایک طرف بھرتے رہے تو دوسری طرف خالی ہوتے رہے۔

''اب ہمیں اپنی اپنی سیلوں میں پھر واپس جانا ہوگا یا ساتھ ساتھ ہی رہنے دیا جائے گا؟'' ملند نے عثمان سے دریافت کیا۔

''جیسا آپ چاہیں''، عثمان نے اپنے مخصوص طرز میں جواب دیا۔

''ارے سرہم تو جانے کیا کیا چاہتے ہیں، فی الحال ہمیں ایک ساتھ ہی رکھا جائے تو کیا کہنا،'' گیری نے تپاک سے کہا۔

سب نے باہر آنگن میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔

عثمان اپنے ماتحتوں کو خاموشی سے کچھ ہدایتیں دے کر جانے لگے تو وکرم نے جلدی سے کہا، ''ذرا ایک منٹ عثمان صاحب!''

''جی فرمایئے،'' عثمان نے رک کر کہا۔

''عثمان صاحب۔ پلیز، اتنا بتا دیجیے کہ آپ کی قید میں صرف ہم لوگ ہی ہیں یا ہمارے کچھ اور ساتھی بھی......''

عثمان کچھ سوچتے ہوئے بولے، ''میرے چارج میں صرف آپ ہی لوگ ہیں۔''

''اور کہیں؟'' وکرم نے اصرار کیا۔

''اور جگہوں کے بارے میں میں نہیں جانتا''، عثمان نے ہوشیاری سے اپنا دامن چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ لوگوں کی ذہنی کیفیت سمجھ سکتا ہوں، لیکن مجھے واقعی اوروں کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہے،'' یہ کہہ کر عثمان رخصت ہو گئے۔

برٹی فوراً سامنے آئے اور بولے، ''ذرا دھیان دیں میں آپ سب سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' سبھی خاموش ہو کر برٹی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پچھلے دنوں ہم سبھی کس قدر خوفناک حالات سے دوچار ہوئے ہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ بری طرح زخمی بھی ہوئے۔ جیسے وکرم، کیمی اور سنتا۔ اس کے علاوہ ہمارے بہت سے ساتھی اس جنگ میں شہید بھی ہو چکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم ایک نہ ایک دن ضرور واپس جائیں گے۔ ہمارے اپنے دیش واسیوں کے بیچ، اپنوں کی گود میں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم اپنے فرائض کی انجام دہی پر فخر کر سکتے ہیں کیونکہ ہماری حیثیت یہاں

ایک فاتح ملک کے فوجیوں کی ہے اور سر اٹھا کر یہاں رہ سکتے ہیں بغیر اس فکر کے کہ ہم نے کتنی پریشانیاں جھیلی ہیں اور ابھی کتنی جھیلیں گے۔ آیئے سب سے پہلے ہم سب اپنے مرحوم ساتھیوں کے لیے دو منٹ کی خاموشی اختیار کریں اور ان کی روح کے سکون کے لیے دعا کریں اور اس دعا کے بعد ہم سب مل کر اپنا قومی ترانہ گائیں گے۔"

پرسکون ماحول میں سب نے خاموش پرارتھنا کی اور ایک نئے جوش کے ساتھ بلند آواز میں قومی گیت گایا۔ جن گن من...... کے بول دشمن کی سرزمین پر گونج رہے تھے۔ ایک ایک لفظ مادرِ وطن کی عظمت اور اس کے وقار کا ضامن ثابت ہو رہا تھا اور سب کے دلوں میں فخر اور ملک کے لیے خود سپردگی کی گونج پیدا کر رہا تھا۔

اس کے بعد سبھی آنگن میں پہنچے اور ایک دوسرے سے سٹ کر کھڑے ہو گئے۔ سنتا سے کہا گیا کہ وہ فوراً جنگ کے خاتمے تک کا بیورہ سب کے سامنے رکھے۔ سنتا نے بغیر کسی رکاوٹ کے بتانا شروع کیا۔ سبھی بے حس و حرکت سنتے رہے کہ پاکستانی فوج نے کس طرح ڈھاکہ میں خود سپردگی کی۔ اس وقت کی ہندوستانی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے امریکی بیڑے کے بنگال کی کھاڑی میں داخل ہونے پر کیا تقریر کی۔ امریکہ کے پاکستان کی طرف جھکاؤ سے ناراض تمام ہندوستانیوں نے کس طرح پیچھے نہ ہٹنے کا عہد بار بار دہرایا۔ اس کے علاوہ دلی کے رام لیلا میدان میں بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکارہ لتا منگیشکر کی سحر انگیز آواز میں......

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

......اور سب کے بعد اندرا گاندھی کی وہ چنوتی بھری تقریر......

سورج غروب ہونے تک باتوں کا نہ ختم ہونے والا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ سارے واقعات ایک دوسرے کو بتائے گئے وہ ایک نہیں بلکہ کئی کئی بار۔ اس طرح کے مذاکرے آئندہ کئی دنوں تک متواتر چلتے رہے خصوصی طور پر جنگ کی اہم وارداتیں اور پاکستانیوں کے ہتھے چڑھنے کے بعد کی اذیتیں۔

جیسے ہی سورج مغربی دیوار کے نیچے جانے لگا سب کو ان کے اپنے اپنے سیلوں میں لے

جایا گیا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی ٹھنڈا اور بدذائقہ کھانا کھانے کے لیے پھر ٹھنڈی کوٹھریوں میں رات گزارنے کے لیے۔ لیکن اب اکیلے پن کا تصور بالکل ختم ہو چکا تھا۔ سب کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ پھر صبح ہوگی پھر اپنے لوگ ہوں گے پھر اپنے ساتھی ہوں گے۔

—

باب سات

ایک امریکی مہمان

وکرم کو بعد میں یاد نہیں رہا کہ کس دن پاکستانی ایئر فورس کا ایک افسر صبح صبح اس کی کوٹھری میں ایک امریکی کو لے کر آیا تھا۔ امریکن کو ایک ایسے مشہور ٹیسٹ پائلٹ کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا جو راکٹ سے چلنے والے "ایکس ٹو" طیارے کے ارتقا میں اہم رول ادا کر رہا تھا۔ وکرم کو معلوم تھا کہ کامیاب معائنوں اور جانچ پڑتال کے بعد اسی طیارے سے خلا میں بھیجی جانے والی "شٹل" کا ارتقا ممکن ہوسکا ہے۔ وکرم نے "کرنل ایگر" کے بارے میں انگریزی رسالہ "ٹائم" میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا، لیکن آج تک اس کی شکل سے قطعی ناواقفیت رہی۔ یہ سوچ کر کہ یہ وہی آدمی ہوگا، وکرم نے مستقبل کی خلائی اڑانوں کی توقعات سے متعلق اس انسان کا استقبال سر جھکاتے ہوئے مسکرا کر کیا۔

مگر یہ امریکی پچیس دسمبر کے بعد ہی آیا ہوگا، کیوں کہ اس دن امریکیوں کو لے کر وکرم کے من میں کافی اتھل پتھل تھی۔ اسے "سنتا" سے پتہ چلا تھا کہ کس طرح امریکہ کا ساتواں بیڑہ بھارت کو ڈرانے دھمکانے کے لیے بنگال کی کھاڑی بھیجا گیا تھا۔ امریکہ پوری طرح دباؤ بنائے ہوئے تھا کہ ہندوستانی فوجیں ڈھاکہ کو حاصل کر لینے کے بعد راولپنڈی پر قبضہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ "کرنل ایگر" کو دیکھتے ہی اس کے تیور چڑھ گئے تھے۔

بات چیت شروع کرنے کی غرض سے امریکی بولا،'' مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کو کچھ چوٹیں آئی ہیں۔اب کیا حال ہے؟''

'' زندہ ہوں......'' وکرم نے بے رخی سے جواب دیا۔'' مگر یونائیٹڈ اسٹیٹس (United States) کے آفیسر! آپ یہاں کیسے؟ ہم قیدیوں میں آپ کا کوئی پرانا شناسا؟ اور ہاں کچھ چاکلیٹ وغیرہ لائے ہیں یا بس خالی ہاتھ ہی؟''

وکرم کو اس کی صورت میں امریکہ کا ساتواں بیڑہ ہی نظر آرہا تھا۔زیادتی زبردستی اور من مانی کرنے والے امریکہ کا خوفناک چہرہ۔وکرم کے ہولناک اور شدت آمیز جواب سے وہ امریکی ہکا بکا رہ گیا، لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے آسانی سے بولا،'' میرے'' ٹور پروگرام'' میں اس وقت پاکستان آنا پہلے سے ہی طے تھا۔میں ایک دو دن سے ادھر ادھر گھوم ہی رہا ہوں۔''

'' سب مورچے دیکھ آئے آپ؟'' وکرم پھر کاٹ کھانے والے انداز میں بولا......'' اور شاید آپ نے ہمارے جہازوں کے باقیات کی جانچ بھی کر لی ہو گی؟''

ظاہر تھا کہ یہ امریکی کسی خاص وجہ سے کچھ خاص پہلوؤں کی کھوج میں پاکستان آیا تھا۔دنیا کے ایک کونے میں پڑے ہوئے وکرم جیسے ایک ادنیٰ اور شدت پسند قیدی کی باتوں سے وہ ڈگمگانے والا نہیں تھا۔لہٰذا بڑی سادگی سے اس نے جواب دیا،'' ہاں واقعی میں نے آپ کے کئی کریشڈ جہاز دیکھے ہیں۔بڑے دلچسپ ہیں یہ روسی جہاز۔ویسے بھی روس کے اپنے طریقے ہیں جہاز بنانے کے۔وہ اپنی بنیادی ڈیزائنوں کو بدلتے نہیں ہیں، بلکہ ایک عرصے تک وہی ڈھانچہ چلاتے رہتے ہیں۔''

ایگر نے بڑی مہارت سے تکرار کے امکانات کو کنارے کر دیا۔وکرم من ہی من اس کی بات چیت کے آرٹ سے متاثر ہوتے ہوئے سوچنے لگا کہ اس امریکی سے گفتگو آگے بڑھانے میں حرج ہی کیا ہے۔

'' آپ کی یہ رائے غور کرنے کے لائق ہے،'' وکرم آسانی سے بولا۔'' بلاشبہ آپ نے تو روس کے سبھی '' فائٹر'' اور '' بامبر'' جہازوں کا مطالعہ کیا ہوگا، لیکن میرے حساب سے یہ الگ الگ تخیلات کی مشینیں معلوم ہوتی ہیں۔''

''بنیادی طور سے تو نہیں،'' امریکی نے کہا، '' اب دیکھیے اگر وہ ایک نیا انجن بنا لیتے ہیں تو اس کے لیے نیا جہاز نہیں بناتے، بلکہ پرانے جہاز کو تھوڑا بہت بدل کر اسی میں اپنا انجن فٹ کر لیتے ہیں اور ان کا جہاز پہلے سے زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نئے اسلحے بھی پرانی مشینوں میں لگا لیے جاتے ہیں۔''

وکرم سمجھ رہا تھا کہ امریکی بکواس کر رہا ہے لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بات چیت کو کس سمت میں لے جانا چاہتا ہے۔ اس لیے وکرم نے کہا، '' میں تو صرف ایک پائلٹ ہوں۔ آپ جیسے ''ٹسٹ پائلٹ'' تو ڈیزائننگ اور انجینئرنگ میں بھی حصہ لیتے ہیں اس لیے ذرا جہازوں کے روزمرّہ استعمال کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں تو شاید میں بآسانی سمجھ سکوں۔''

''یقیناً،'' وہ مستعدی کے ساتھ بولا، '' اب الکٹرانکس کی ہی بات لے لیجیے۔ شروع میں ''سکھوئیہ'' جہازوں میں ایسا کوئی پرزہ نہیں تھا جس سے کسی جگہ کے لیے صحیح رہنمائی کی جا سکے، چاہے دن میں یا رات میں۔ وجہ..... اس وقت روس نے ایسے پرزے بنائے ہی نہیں تھے۔ بعد میں جب ایسے پرز۔ ے بن گئے تو کسی طرح آپ کے ''سکھوئیہ'' جہازوں میں فٹ کر دیے تا کہ آپ صحیح نشانے پر پہنچ سکیں۔''

ظاہر تھا کہ امریکیوں نے بھارت پاکستان جنگ پر کڑی نظر رکھی تھی اور لڑائی کے ایک ایک پہلو ایک ایک اسلحے کا انھوں نے بڑی ہوشیاری سے تجزیہ ضرور کیا ہوگا۔ ان کو ہندوستانی ایئر فورس کے راتوں میں کیے گئے حملوں کی کامیابی سے کافی پریشانی ہوئی ہوگی، اتنی ہی جتنی کہ پاکستانیوں کو۔

'' مجھے تو اس بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں،'' وکرم جواب کا جواب دیتے ہوئے بولا، '' ہاں ہو سکتا ہے کہ روسیوں نے کچھ پرزے لگائے ہوں لیکن ہم سے ان کا ذکر کرنا بھول گئے ہوں۔''

'' تو کیسے آپ کے پائلٹ اتنی آسانی سے ٹارگیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور وہ بھی رات کے زبردست اندھیرے میں؟ حد ہے کہ ایک بھی جہاز گرا نہیں ہوا۔''

انگر جیسے امریکی ایکسپرٹ بدھو نہیں تھے۔ وہ زمیں بوس جہازوں کا ایک ایک ذرہ دیکھ چکے ہوں گے۔ مگر ظاہری طور پر ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے تھے۔ ان کی سوچ میں اگر ایسا

کوئی پرزہ جہاز میں فٹ نہیں تھا تو کیا باہر سے جہازوں کی رہنمائی کی جا رہی تھی۔ کوئی بیکن، یا کچھ ریڈیو شعاعیں، جن کے سہارے وہ راستہ اور حملے کے ٹھکانے ڈھونڈ لیتے تھے؟ دوران جنگ سننے میں آ رہا تھا کہ روس نے ہندوستان کو ایسے مخصوص طیارے مہیا کرائے تھے جو ہندوستان کی فضائی حدود میں رہ کر جہازوں کو دشمن کے ٹھکانے تک پہنچانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ کیا واقعی ایسا تھا؟ اور پھر بھارت روس فوجی امداد کس حد تک پہنچ چکی تھی؟ امریکن انھیں امکانات کی تلاش میں لگا ہوا تھا۔

"ارے چھوڑیے!" وکرم نے جھڑک کر کہا "آپ اور آپ کے میزبان بھی جانتے ہیں کہ اچھی اور سدھی ہوئی اڑان بھر کر صحیح سمت، رفتار اور وقت کا خیال رکھتے ہوئے کہیں بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ بھی لوگوں کی اصل پریشانی کیا ہے؟"

"نہیں، نہیں...... میں تو ایسے ہی فلائنگ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔"

آگے بات چیت کا کوئی نتیجہ نہ نکلنے کے اندیشے سے مایوس پاکستانی افسر نے بڑے تپاک سے اپنا بایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور گھڑی دیکھتے ہوئے کہا، "چلیے ہم لوگوں کو دیر ہو رہی ہے۔"

جیسے ہی وہ لوگ کمرے سے باہر جانے لگے وکرم نے امریکی مہمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "تو اگلی بار کیا اپنا ساتواں بیڑا بحر عرب کے ساحلوں پر تعینات کریں گے؟ پاکستان کے اس حصے کے لیے۔"

امریکی نے کندھے اچکا کر ہونٹوں کے کنارے کھینچ لیے اور دوسری طرف پاکستانی کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ دونوں بغیر کچھ کہے باہر چلے گئے۔

اس دن قیدیوں کو باہر نہیں نکالا گیا۔ سب اپنے سیلوں میں الگ الگ بند رہے۔ گارڈوں نے پتہ کرنے پر کوئی واضح جواب بھی نہیں دیا۔ نقوی اور ان کے کارپورل بھی کہیں دکھائی نہیں دیے۔ وکرم نے اندازہ لگایا کہ امریکی ضرور سارے ہندوستانی قیدیوں سے الگ الگ مل رہا ہوگا۔ روس کے ہتھیاروں کے سلسلے میں امریکی خفیہ ایجنسیوں کی جانکاری میں کہیں کوئی خلا ضرور ہے جس کے لیے وہ تمام دنیا کی جنگی علاقوں میں گھوم کر اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوں گے۔ پاکستان کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے۔ یہ تلاش کیسی تھی؟ ان کا مقصد کیا تھا؟ یہ ہندوستانی پائلٹوں کی سمجھ سے پرے تھے۔ عظیم طاقتوں کا کھیل ہی الگ ہوتا ہے۔ روس

اور امریکہ اصل میں کسی کے دوست نہیں، صرف اپنی غرض، اپنے فائدے میں مصروف۔ اگر وہ چاہتے تو ہندو پاک جنگ رکوا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے جنگ ہونے دی۔ کن وجوہات کی بنا پر، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ شاید اتنی چھوٹی بات کہ صرف کچھ اسلحوں کی صلاحیت ہی دیکھنے کے لیے یا اتنی بڑی بات کہ آنے والے وقت میں اس ضمنی برِّ اعظم کے اور ٹکڑے کرائے جانے کے لیے۔ اسے ذات اور مذہب کی بنیاد پر اور بانٹنے کے لیے، جس سے کبھی اس حصے میں ایک بڑی طاقت منظم نہ ہو سکے۔

دوسرے دن جب وہ سب پھر آنگن میں اکٹھا ہوئے تو سب سے پہلے گیری نے کہا، "اس کمبخت امریکی کی وجہ سے کل ہم لوگ دن بھر بندر رہے۔ سالا بڑی یاروں دوستوں جیسی باتیں کر رہا تھا۔ جیسے ہم ہی میں سے ایک ہو۔ لیکن آخر میں مجھے لگا کہ وہ میرے جوابوں سے خوش نہیں تھا۔"

"سر! میں سمجھ نہیں پایا کہ وہ جاننا کیا چاہتا تھا؟" منوہر نے بیچ میں کہا۔

"یار منوہر، تم سمجھتے بھی کیسے؟" ہیری نے مذاق میں کہا۔ "اسے تمھارے ایچ ایف 24 میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔" ہیری نے ہندوستان میں بنے اس جہاز پر طنز کیا جو پائلٹس کی نظر میں بالکل ردّی تھا۔

پُرسکون لفظوں میں ملند نے کہا، "مجھے لگا کہ وہ زمین سے ہوا میں مار کرنے والی ہماری نئی میزائلوں کے بارے میں کھوج بین کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان امریکیوں کو شک ہے کہ کہیں روس نے ہمیں "آواکس" سے لیس جہاز تو نہیں دے دیا جس کے سہارے دشمن کے جہازوں اور زمینی ٹھکانوں پر بالکل ٹھیک حملہ کرنے کے لیے ہماری صلاحیت بہت بڑھ سکتی ہے۔"

"شاید وہ میرے جوابوں سے بھی خوش نہیں تھا۔ کیونکہ میں بھی ساتویں امریکی بیڑے کی نقل و حرکت پر ناراض تھا اور میں نے اسے جتنی ہو سکی کھری کھوٹی سنا ڈالی،" ملند پھر بولا۔ "مگر سر! تعجب ہے اس ملک میں امریکیوں کو اتنی چھوٹ کہ جہاں چاہیں جائیں جو چاہیں کریں، جیسے یہی یہاں کے اصلی مالک ہیں۔ کم سے کم ہمارے یہاں روسیوں کو اس کے مقابلے میں کوئی چھوٹ نہیں ہے۔ وہ صلاح کار ہیں اور صرف دور سے صلاح ہی دے سکتے ہیں وہ بھی اگر ہم صلاح مانگیں تب۔ ان لوگوں کی طرح تو ہرگز نہیں۔"

کرنل ایگر کی آمد کے موضوع پر دن بھر چرچا ہوتی رہی۔ایک بات پر سب کا اتفاق تھا کہ امریکہ کا پاکستان کی طرف جھکاؤ ہندوستان مخالف تھا، بلا وجہ تھا اور سبھی کو اس بات پر غصہ تھا۔مگر ایک کمزور ملک، ایک کمزور انسان کی طرح طاقت ور مخالف کو للکارنے کی اہلیت بھلے نہ ہو۔ پر اس زیادتی اور زبردستی کی یک طرفہ حرکتوں کو معاف یا نظر انداز کرنے کو تیار نہیں ہوسکتا۔

آج کا کمزور ملک صرف صحیح وقت کا انتظار ہی کرسکتا ہے اور اسے کرنا بھی چاہیے کیوں کہ ہر ملک انسانوں اور بڑے خاندانوں کی طرح اٹھتا ہے طاقت اور خوش حالی حاصل کرتا ہے۔ کچھ وقت کے لیے سب کے اوپر حاوی ہوتا ہے، لیکن کچھ دن بعد غرور اور خود اطمینانی میں غافل ہوتا ہے اور آخر میں ایک دن زوال کے راستے پر آجاتا ہے۔

اس لیے امریکہ کو بھی ہوشیار رہنا چاہیے کہ چاہے سو برس لگیں یا ہزار برس اس کا بھی انجام یہی طے ہے۔دوسرے ممالک یا آج کے کمزور اور الگ تھلگ پڑے ہوئے ممالک وقت کا انتظار کریں گے اور ایک دن وہ وقت ضرور آئے گا جب یہ ممالک آج کے اس مغرور ملک کو جواب ضرور دیں گے۔

باب آٹھ

کچھ ہنسی کچھ مذاق

فلائٹ لیفٹیننٹ عباس پاکستانی ایئرفورس میں ایک نوجوان ڈاکٹر تھے۔ مریض، دوا اور علاج وغیرہ ان کی مسرت سے بھری اور حوصلوں سے پر زندگی کے گزارنے کا محض بہانہ تھے۔ ان کو اپنی وردی اور اپنے افسر ہونے پر بے پناہ خوشی اور فخر تھا، خاص طور سے اس فوجی حکمراں ملک میں، جہاں عزت کے ساتھ بہت سے خصوصی اختیارات بھی انھیں حاصل تھے۔ وہ فوجی حکمرانوں کے بڑے پرستار تھے اور ہمیشہ ان کے بارے میں احترام سے گفتگو کرتے تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ دراصل جنرل یحییٰ کی حکومت کی شروعات میں وہ چھٹیوں پر گھر گئے تھے۔ ان کا گھر کسی چھوٹے سے شہر میں تھا یکایک وہاں کے سول افسر کو ہٹا دیا گیا اور بغیر کوئی وجہ بتائے ٹیلیفون پر حالات پر نظر رکھنے کے لیے کہہ دیا گیا۔ یہ کیسے ہوا؟ عباس اسے کبھی نہ سمجھ سکے۔ شاید ہوا یہ ہو کہ ایک باصلاحیت افسر کی حیثیت سے وہی سب سے پہلے دکھائی دے گئے ہوں۔ خیر اب کیا تھا عباس صاحب نے ایک سرکاری جیپ اپنے قبضے میں لے کر شہر میں گشت شروع کر دی اور اگلے دس دنوں میں اپنے اہلکاروں اور ماتحتوں کو ہی نہیں بلکہ پورے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا۔

یہ کہانی سننے کے بعد ملند نے پوچھا، ”کیا آپ کو کچھ خاص کام، کسی طرح کی بریفنگ یا رہنمائی کے لیے کچھ ہدایتیں دی گئی تھیں کہ آپ کو کرنا کیا ہے؟“

''ارے مجھے خاک معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ یا میرا کام اور میرے اختیارات کیا کیا ہیں؟'' عباس صاحب ہنس کر بولے۔ ''اور سب سے مزے کی بات یہ کہ عوام کو بھی کیا معلوم تھا؟''

وہ آگے بولے، '' آپ جانتے ہیں...... یہ کمبخت سویلین نوکر شاہ اگر ذرا سا کام پڑ جائے تو کیسے راستہ بتاتے ہیں؟ ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ دن میں دو بار ان کی پیشی کراتا تھا۔ میں نے ان دس دنوں میں انھیں ایسی ایسی پھٹکار لگائی کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ مزہ آ گیا جناب ان دس دنوں میں۔ بس ویسا ہی تھا کہ کسی کو ایک دن کی بادشاہت مل گئی تھی......'' فلائٹ لیفٹیننٹ نے زوردار قہقہہ لگایا۔

عباس صاحب ان دس دنوں کو نہ بھولے تھے نہ آئندہ بھولنے کی امید ہی تھی۔ اعلیٰ قوت وری کے وہ دس دن، ایڈمنسٹریشن کیا بلکہ ایک چھوٹی موٹی دنیا کی بادشاہت کے دن تھے۔ ان کے نزدیک ملٹری رول کا مطلب تھا روزمرّہ کی زندگی کے لیے ایک منظم طریقہ جس کے معانی ہیں، ضابطہ، محنت اور فرائض کے تئیں خود سپردگی اور جواب دہی اور سویلینس کے بس کی یہ باتیں تھیں نہیں۔ وہ سارا انتظام چوپٹ کیے ہوئے تھے۔ ٹھیک ہے، مغربی ممالک اور ان کی نقل میں لگے کچھ دیگر ملک جمہوریت کی دہائی دیتے ہیں، ذاتی آزادی اور فرائض کے تئیں خود سپردگی جیسے موضوعات پر بحث و مباحثہ کرتے رہیں، مگر ان کے ملک اور ان کے مثالی کردار عرب ممالک کے لیے غور کرنے کے لائق صرف ایک ہی مدعا تھا، کہ تانہ شاہی حکومتوں کے رواج اور اصول کیا ہونے چاہیے۔ عباس صاحب کے خیال میں سلام بجالانے کے لائق وہی حکمراں ہوتا ہے جو دشمن پر فتح حاصل کر لے۔ امن چین قائم رکھ سکے، مصیبت میں امداد کے لیے پہلے آگے بڑھے اور...... ہمت و ہیکڑی سے اپنی بہادری کی نمائش بھی کرتا رہے تاکہ اس کے عوام بھی سینہ تان کر رہ سکیں۔

ڈاکٹر عباس دلچسپ قصے سنانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ خاص طور پر اونچے عہدوں پر فائض لوگوں کے کارناموں کے بارے میں۔ ان کے پاس ان گنت لطیفوں کا خزانہ بھی تھا حالانکہ ان کے لطیفے زیادہ تر ہندوستان اور ہندوستانیوں کی کھلّی ہی اڑاتے تھے۔ ایک روز انھوں نے بڑا ہی مزے دار لطیفہ سنایا۔

پاکستان میں جنرل ایوب کا دورِ حکومت تھا۔ امریکہ کے خوش رہنے کی وجہ سے ملک میں

پیسہ اور اسلحہ دونوں کا ریلہ آ رہا تھا۔فوج کی پو بارہ تھی۔اناج یا دوسری کھانے کی اشیا افراط تھیں۔ عوام نظم و ضبط کی پابندی ہی نہیں بلکہ اپنے آپ میں مست اور خاموش بھی تھی۔کوئی خرافات نہیں، کسی قسم کی شکایت نہیں، کسی طرح کی بے کلی نہیں۔اپنا کام کرو پیسہ کماؤ اور زبان بند رکھو۔

سرحد سے دوسری طرف ہندوستان میں بے چارے لال بہادر شاستری وراثت میں ملے نہرو کے مختلف جھمیلوں اور بکھیڑوں سے جوجھ رہے تھے۔کھانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔قحط جیسے حالات سر پر سوار تھے بھیک کے کٹورے ہاتھ میں لے کر حکمراں جماعت کے ہندوستانی سیاست داں اور بڑے افسر خوشحال اور دولتمند ممالک کے چکر لگا رہے تھے۔امریکہ اپنی شرائط پر لمبے عرصے کے لیے اناج ادھار دے رہا تھا۔

انھیں حالات میں ایک دن دو کتے ہندو پاک سرحد پر آ پہنچے۔ایک سینہ تانے ہندوستان میں داخل ہو رہا تھا دوسرا دم دبائے پاکستان میں گھسا آ رہا تھا۔اپنی عادت کے مطابق پہلے تو یہ ایک دوسرے کو دیکھ کر غرّائے پھر تھوڑا قریب آ کر ایک دوسرے کی خوشبو یا بدبو سے لطف اندوز ہوئے اور آخر میں بغیر کسی زور آزمائی کے سکون کے ساتھ اپنے اپنے راستے چل دیے۔

ذرا رک کر پاکستانی کتے نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا، ''کیا بھوکے ہو؟'' دبلا پتلا ہندوستانی کتا سر جھکا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا...... زبان باہر جیسے سر ہلاتا ہوا کوئی ہڈیوں کا ڈھانچہ۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے،'' پاکستانی کتا بولا۔''جاؤ کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ہمارے یہاں جاؤ اور خوب سیر ہو کر کھاؤ پیو۔''

ہندوستانی کتا ڈگی چال سے آگے بڑھنے لگا، پھر کچھ سوچ کر ہلکی آواز میں بھونکتے ہوئے بولا۔''بھائی! میں تو سرحد پار کر کے آپ کے ملک میں اس لیے جا رہا ہوں کیوں کہ میں کئی دنوں کا بھوکا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کس لیے ہندوستان جا رہے ہیں؟''

''اچھا سوال ہے،'' پاکستانی کتا بولا۔''تو سنو دراصل ہمارے یہاں آرام ہی آرام ہے کھانے پینے کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے بس ایک ہی بات ہے جو اندر ہی اندر کھلتی رہتی ہے......''

کچھ دیر رک کر سوچنے کے بعد پاکستانی کتا دوبارہ سرگوشی کے انداز میں بولا......''یار ہمارے

یہاں بس ایک ہی مصیبت ہے کہ کمبخت بھونکنے نہیں دیتے۔ آخر کبھی کبھار غبار نکالنا بھی تو ضروری ہے۔ بس یہی دشواری ہمیں تمھاری طرف جانے پر مجبور کرتی ہے۔''

ہندوستانی افسر زور سے ہنسے اور پاکستانی......اور بھی زور سے ہنسے۔

—

جیل میں کبھی کبھی بہت اکیلا پن محسوس ہوتا تھا۔ دن میں تو قیدیوں کو ایک ساتھ رہنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ لیکن شام ڈھلتے ہی واپس سیل میں لاکر اکیلے بند کردیا جاتا تھا۔ رات بھر کے لیے۔ نہ ضرورت بھر روشنی نہ پڑھنے کے لیے کوئی رسالہ اور نہ ہی کوئی کتاب۔ آدمی سوئے بھی تو کتنا؟ لمبی رات کے سناٹے میں کنکریٹ کی فرش پر اکیلے پڑے پڑے دل گھبراتا تھا۔ ایک عجیب سی یاس و ناامیدی کا ماحول ہوتا تھا۔ ہاں جب کبھی کوئی خوش مزاج سنتری ڈیوٹی پر ہو تو ضرور دل بہل جاتا تھا۔

اقبال ایسے ہی اچھے اخلاق کا ایک گارڈ تھا۔ نوجوان۔ لڑائی میں اچھی طرح اپنے فرائض نبھا چکا تھا۔ اگر کوئی سینئر افسر آس پاس نہ ہو تو اقبال ہمیشہ غپ شپ کے لیے تیار۔ وکرم اکثر اُسے باتوں میں الجھائے رہتا تھا۔ اقبال بھی بڑے مزے لے لے کر اپنے گاؤں، رہن سہن اور کھان پان کے بارے میں باتیں کیا کرتا تھا۔ ہاں سب سے اچھا کھانا تو اس کی والدہ ہی پکایا کرتی تھیں۔ ویسے اس کی گھر والی ان معاملات میں بری نہیں تھی۔ حالانکہ یہ بات اقبال نے خاصا شرما کر سب کو بتائی تھی۔ گھر کے باہر اسے راولپنڈی کے چپل کباب بے حد پسند تھے۔

''مگر بڑے کے ہوتے ہیں، آپ کے مطلب کے نہیں۔'' اس نے یہ بات اس لیے کہی کہ گائے کے گوشت سے بنائے گئے یہ کباب ہندو نہیں کھا سکتے۔

ابھی کچھ دن پہلے ختم ہوئی لڑائی کا تذکرہ ہونا بھی فطری تھا۔ اقبال کو بڑے ہی سخت قسم کا احساسِ ناپسندیدگی تو تھا ہی کہ اس کے ملک کو اس لڑائی میں شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک فوجی کی حیثیت سے اسے شرمندگی تو تھی ہی، لاچاری اور غصہ بھی تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی مورچے کا ذکر چھیڑتے ہوئے آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا تھا...... ''اور ایک دم سے آپ کے جہاز آگئے۔ راکٹ اور دوسری مشینوں سے فائر شروع ہوا ہم لوگ ٹرنچوں میں دبکے رہے۔ کوئی بھی نقصان

نہیں ہوا۔" اور پھر خاموش رہ کر کچھ دیر سوچتے ہوئے کہتا تھا...... "مگر ہم ہار ہی گئے۔"

ایک رات اقبال وکرم کو لڑائی کے کچھ قصے سنا رہا تھا۔ سلاخوں کے اندر سے یکا یک وکرم نے کہا، "اقبال میاں! آپ پٹھان ہیں، جنگی اور بہادر لوگ ہیں، سیکڑوں ہزاروں بار ہندوستان پر حملہ کر چکے ہیں، زیادہ تر موقعوں پر آپ کو فتح بھی حاصل ہوئی ہے۔ مگر اس بار کیا ہو گیا؟ کیسے آپ لوگ اتنی بری طرح ہار گئے۔"

اقبال نے لمبی سانس لی اور سوچنا شروع کیا اور آخر میں جب بولا تو اس کے الفاظ اعتماد سے بھرے ہوئے تھے لگا کہ جیسے وہ پہلے ہی اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کر چکا ہو۔

"آپ کے افسر، ہاں آپ کے افسر...... ہی ہیں جن کی وجہ سے ہم ہارے۔"

"ہمارے افسر؟" وکرم نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں آپ کے نوجوان افسروں نے ہی آپ کو جتایا ہے، اور ان ہی کی وجہ سے ہم لوگوں کی ہار ہوئی ہے۔"

وکرم اس طرح ٹکٹکی باندھے اقبال کی طرف دیکھتا رہا جیسے اسے اور آگے بولنے کے لیے تیار کر رہا ہو۔

"ہمارے اور آپ کے افسروں میں بڑا فرق آ چکا ہے،" اقبال نے کہا۔ "اب دیکھیے! ہمارے میجر صاحب ٹرنچ میں سے تھوڑا سا سر اوپر اٹھاتے ہیں اور کیپٹن کی طرف چلّاتے ہیں، چا...... ر...... ج کیپٹن صاحب اپنی گردن اونچی کرتے ہیں اور جے۔سی۔او۔ سے کہتے ہیں چا...... ر...... ج۔ جے۔سی۔او۔ جوان کو حکم دیتا ہے، چا...... ر...... ج۔ جوان مورچوں پر بنے گڈھوں سے باہر کودتے ہیں اور دوڑتے ہوئے حملہ شروع کرتے ہیں۔" اقبال بولتے بولتے رک گیا جب کہ وکرم آگے اور بھی سننے کے انتظار میں تھا۔

"...... لیکن جوان جب مڑ کر پیچھے دیکھتے ہیں تو ان کے پیچھے کوئی نہیں ہوتا۔ نہ جے سی او نہ کیپٹن اور نہ ہی میجر۔" اتنا کہہ کر اقبال خاموش ہو گیا وہ خود اس کشمکش میں تھا کہ اتنے دنوں سے سینے میں چھپا ہوا غصہ اور اس کی یہ سوچ آخر کار واضح ہی ہو گئی۔

"مگر ایسا تو سبھی فوجوں میں ہوتا ہے،" وکرم نے کہا۔ حالانکہ اسے زمینی مورچوں کی نقل

وحرکت کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں تھا۔

''نہیں، نہیں،'' اقبال نے زور دیتے ہوئے کہا۔'' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہندوستانی میجر خود ٹرنچ میں سے کود کر باہر آتا ہے ہاتھ میں اسٹین گن لیے ہوئے، فائرنگ کرتا ہوا، چ......ا......ر......ج چلاتا ہوا، اس کے پیچھے آتے ہیں کیپٹن پھر لیفٹیننٹ پھر جے سی او، اور ان سب کے پیچھے ہوتے ہیں سارے جوان آگے کو دوڑتے ہوئے ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے۔ میں نے دیکھا ہے اپنی انھیں آنکھوں سے، بار بار یہی ہوا ہے۔ یہ الگ بات کہ بعد میں جوان ہی سب سے آگے ہو لیتا ہے مگر پورے کے ساتھ۔ کیوں کہ اسے پتہ ہے کہ اس کے ساتھ سبھی ڈٹے ہوئے ہیں۔''

اقبال پھر کچھ سوچنے لگا۔ وکرم بھی کچھ عجیب سی سوچ میں تھا ایک دشمن کی طرف سے ہندوستانی افسروں کی تعریف۔ یہ کوئی بہت اہم بات ہی نہیں بلکہ بے انتہا مسرت اور فخر کی بات تھی۔

''اقبال میاں! شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں،'' وکرم نے کہا۔'' اسی لیے ہمارے بہت سے نوجوان افسر اس لڑائی میں شہید ہوئے ہیں۔ اور زخمی تو بہت ہی زیادہ۔ اعداد کے تناسب میں جے سی او اور جوانوں سے کہیں زیادہ۔ آپ کے منھ سے ایسی تعریف سن کر مجھے بے حد ناز ہو رہا ہے۔ ہمارے تمام نوجوان افسروں نے اپنا فرض بخوبی نبھایا اور زیادہ تر نے تو فرائض کی حدیں بھی پار کر دیں۔''

وکرم اپنے خیالات میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ اقبال کی آواز اس کے کانوں میں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی؛ ''ہم لوگ آج بھی بہادر ہیں جناب، ذرا بھی ڈرپوک نہیں۔ ہم نے شاید ہی کبھی ایک آدھ لڑائی ہاری ہو۔ ہم ہارنا جانتے ہی نہیں، ہم جنگ کے میدان سے صرف غازی بن کر ہی نہیں لوٹتے بلکہ شہادت پر بھی ناز کرتے ہیں۔''

دونوں طرف جذباتیت بڑھ رہی تھی۔ وکرم خاموش تھا۔ اقبال نے ایک سوال کیا اور پھر اس کا جواب بھی خود ہی دیا،'' آپ نے کبھی سوچا ہے جناب کہ کس طرح کی فوج دنیا کی سب سے طاقتور فوج ثابت ہو سکتی ہے؟ ایسی فوج جس کی مثال ملنی مشکل ہو، جو روس اور امریکہ کو ایک ساتھ مٹی میں ملا دے؟......ایسی فوج وہ فوج ہو سکتی ہے جس میں ہوں ہمارے جوان اور......آپ کے افسر۔''

وکرم یہ سن کر چونکا اور پھر مسکراتا ہوا بولا، ''اقبال میاں برابر کرنے کا ایک عمل اور بھی ہے جو اس سے بھی زیادہ طاقتور ہے اور وہ ہے ہمارے ہی افسر اور ہمارے ہی جوان۔''

اقبال نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس نے شاید اپنے طور پر جیسے بھی غور و فکر کیا تھا اس میں کسی طرح کی تبدیلی کی گنجائش تھی ہی نہیں۔

—

چٹکلے سنانے اور ہلسی مذاق کرنے میں عباس صاحب کا ثانی کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے ہم قیدیوں کے بیچ بڑے ہی اشتیاق اور مسرت سے ان کا انتظار ہوا کرتا تھا۔ ان کے آتے ہی ماحول کی ساری بے کیفی ختم ہو جاتی تھی۔

''ارے آپ لوگوں نے وہ زنخوں کے بارے میں کچھ سنا ہے؟'' ڈاکٹر عباس نے ایک نیا قصہ شروع کیا۔

ہم لوگوں نے سن رکھا تھا یا نہیں، عباس صاحب کی صحت پر اس کا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ انھیں تو اپنے طرز پر، اپنے نظریے سے سنانا ہی تھا۔ مگر ہندوستانی پائلٹس میں ایک دو کی بھنویں تن گئیں۔ آپس میں ایک دوسرے پر انھوں نے سوالیہ نظریں ڈالیں۔ ہو نہ ہو کسی نہ کسی طرح یہ تذکرہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کو زنخوں کی جماعت میں ضرور کھڑا کر دے گا۔

اتنے میں وکرم نے جلدی سے کہا، ''کیا؟ زنخا، یہ کیا ہوتا ہے؟''

''ارے زنخا، زنخا...... نہیں سمجھے آپ۔ ارے بھائی جو نہ اِدھر میں ہوتا ہے اور نہ اُدھر میں۔'' عباس بولے۔

''نہ ادھر نہ اُدھر؟'' وکرم نے معصومیت سے کہا۔ ''نہیں میں نہیں سمجھا۔ شاید میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔''

عباس صاحب بھی معاملے کو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ''ارے جناب زنخے ...... نہ مرد نہ عورت۔ ارے وہی جو تالیاں بجا کر سڑکوں پر ناچتے گاتے دکھائی دیتے ہیں اور جب کبھی گھروں میں شادی بیاہ یا بچوں کی پیدائش ہو تو بخششوں کے لیے ناک میں دم کر دیتے ہیں۔''

اب تک وکرم کچھ سوچ چکا تھا اس لیے اس نے تپاک سے کہا، ''اچھا وہ...... زنخا، جی ہاں

میں نے زنخوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور سن رکھا ہے۔''

''سن رکھا ہے؟'' عباس صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں ہمارے یہاں بڑے بوڑھے اکثر آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں اور اس ''برادری'' کے سہارے بہت سے مذاق بھی کیا کرتے ہیں۔ نہ ادھر نہ ادھر جیسا آپ نے کہا۔''

''آپ کے بزرگ؟ باتیں کیا کرتے ہیں ان کے بارے میں؟ روز ہی دیکھتے ہوں گے زنخوں کو کہیں نہ کہیں،'' اور پھر ہنستے ہوئے آگے بولے۔''میں نے سنا ہے کہ آپ کا ملک بھرا پڑا ہے اس برادری سے۔''

''بھرا پڑا ہے نہیں — تھا،'' وکرم نے بے مقصدی آواز میں کہا۔'' ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں کافی زنخے ہوا کرتے تھے لیکن 1947 میں جانے کہاں چلے گئے۔''

عباس اور ان کے ساتھ آئے دیگر لوگ خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ غصے اور لاچاری کے ملے جلے تاثرات ان کے چہروں پر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہندوستان کو نشانہ بنا کر سنائے جا رہے لطیفے اور طنزیہ جملے یہیں اپنے انجام کو پہنچے۔

—

باب نو

ہمت اور بزدلی

ایک برس بعد جب ایک روز وکرم اپنے دیش، اپنے شہر اور اپنے گھر کے اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا، ہندوستانی ایئر فورس کی جگمگاتی وردی میں ایک نوجوان افسر اس کی طرف اشتیاق سے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ آگے جھک کر اس نے وکرم کے پیر اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے، ہونٹوں پر کچھ اَن کہے لفظ اور آنکھوں میں آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وکرم نے آنے والے کو پہچانا، اس کے سینے پر لگے میڈل ربن پر اس کی نظر پڑی اور اس نے جذباتی ہو کر بے انتہا خوشی اور اطمینان کی سانس لی، اس کے سر پر دعا اور حوصلہ افزائی کا ہاتھ رکھا۔ لیکن وکرم اپنے بھی آنسو ٹپکنے سے نہ روک سکا۔

روزِ ازل سے ہی سامنت اور شیخ، راجا اور دیش یہاں تک کہ ڈاکو اور دہشت پسند تنظیم یہ سب جنگ اور حملے کے لیے سپاہی اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ کبھی قوم یا مذہب کے نام پر حوصلہ افزائی کر کے کبھی جبراً بھرتی سے، جیسے آج کے مغربی ممالک میں ''ضروری قومی خدمات'' کے نام پر، کبھی بہلا پھسلا کر، کبھی بزدلی کے لیے دھکارنے پر، کبھی دھن دولت، جنت اور حور کا لالچ دینے پر اور غریب ملکوں میں صرف نوکری کا لالچ دینے پر۔ انھیں میں سے اکثر بہادر لڑاکے نکلتے ہیں، ان کی روایتیں ہر ملک ہر قوم کی وراثت ہوتی ہیں۔ لیکن ہر بہادر اپنے کو جدید کرن یا ارجن سمجھنے والا ہر جنگجو کہیں نہ کہیں اپنے اندر جسمانی نقصان اور موت کا خوف ضرور چھپائے رہتا ہے۔ جیسے جیسے

جنگ قریب آتی ہے۔ ایک بہادر سپاہی بننے کی امید کے ساتھ شہید ہو جانے کی فکر بھی ہمیشہ بنی رہتی ہے۔ زیادہ تر سپاہی متوقع بہادری اور بزدلی کے دائرے میں رہ کر اپنا فرض نبھاتے ہیں۔ کچھ ضرورت سے زیادہ نڈر اور بہادر ثابت ہوتے ہیں تو کچھ ڈرپوک اور بزدل بھی۔ لیکن جب کبھی ایک ایک خوفزدہ اور پیچھے رہنے والا سپاہی کسی مخصوص حالت میں ایک دم سے بے خوفی اور بہادری کی طرف بڑھ جاتا ہے تو لڑائی کا رخ ہی بدل دیتا ہے۔

تین دسمبر 1971۔ شام کے جھٹپٹے سے کچھ پہلے پاکستانی ایئر فورس نے بھارت کے اتری اور پچھمی حصوں میں سات ملٹری ہوائی اڈوں پر بمباری کی۔ زبردست بمباری کہیں نہیں ہوئی۔ یہ صرف جنگ کا اعلان تھا، لڑائی شروع کرنے کا دعوت نامہ۔ اس کا احساس کچھ دنوں سے سبھی کو تھا۔ اتنا کہ دونوں طرف جنگ کی ابتدائی چالوں کا مطالعہ بہتر طریقے سے ہو چکا تھا، سارے امکانات پر بحث مباحثہ اور غور و فکر ہو چکا تھا۔ حملے کے لیے ٹھکانوں کا چناؤ اور ان کے نقشے انتہائی رازدار الماریوں میں بند تھے۔ اب ان کو نکالنے اور ان پر عمل درآمد کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

پنجاب کے آدم پور ہوائی اڈے پر پاکستانی بموں کے پھٹتے ہی بیرکوں اور میس ہالوں میں ہلچل شروع ہو گئی۔ افسر، جے سی او، ایرمین اپنے اپنے مقام عمل کی طرف ہر طرح کی سواریوں پر تیزی سے دوڑ کر پہنچنے لگے۔ میکینکوں نے جہازوں کو چیک کرنا شروع کر دیا۔ پائلٹس آپریشن ردم میں اکٹھا ہو گئے۔ سب کو حملے کے لیے الگ الگ ٹولیوں میں نامزد کر دیا گیا۔ نقشوں پر ایک اور نگاہ ڈال لینے کے حکم کے ساتھ ہی صبح پو پھٹنے کا وقت حملے کے لیے طے کیا گیا۔ آخر میں اس ہدایت کے ساتھ کہ کھانا کھاؤ جلدی سو جاؤ اور سویرے زوردار حملہ بول دو۔ اس کے ساتھ سب کو وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ رات نو بجے وکرم اپنے بستر پر کمبلوں میں لیٹا ہوا تھا۔ کچھ وقت پہلے ایک بھلے ٹیلی فون آپریٹر کی مہربانی سے دور شہر میں اپنی بیوی سے بات کر چکا تھا۔ وہ دور شہر، کائنات کا ایک دیگر حصہ، امید اور خوف سے بھری ایک الگ دنیا......

ریڈیو پر ابھی ابھی پاکستانی بمباری کی خبر آئی ہے، وہ بولیں، اب کیا ہوگا؟

''بس اب شروعات ہے......'' وکرم نے کہا۔

—

وکرم کا دھیان اچانک پچھلے تین ہفتوں کے واقعات پر گیا۔ دیر شام کو آفس سے آنے کے بعد وہ اور اس کی بیوی اپنے گھر کے باہر سڑک پر چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ دونوں کو اس موقع کا انتظار رہا کرتا تھا کیوں کہ تنہائی اور پُر سکون ماحول میں اہلِ خاندان بچوں اور گھر گرہستی کے بارے میں اپنے خیال، اپنی خواہشات اور آرزوئیں وہ زیادہ تر اسی وقت ایک دوسرے پر ظاہر کرتے تھے، بحث کرتے تھے اور بے حد محبت کرنے والے زوجین کی طرح فیصلہ کرتے تھے۔ جب وکرم کو لگنے لگا کہ ہند و پاک جنگ ٹالی نہیں جا سکتی بلکہ لڑائی ہو کر رہے گی، تو یہ خیالات بھی اس نے اپنی بیوی بیلا کے سامنے رکھے۔ باتیں جب آگے بڑھیں تو بیلا کو شک ہونے لگا کہ ''یہ'' لڑائی میں کود پڑنے کا خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں؟

''وکی! تم تو ایسی اہم جگہ پر اس وقت تعینات ہو۔ تمھیں تو ہر لمحے کی اطلاع رہے گی،'' بیلا نے ایک دن گفتگو شروع کی۔

''ہاں، مگر یہی تو بات ہے۔ ایسے وقت میں میں یہاں پھنسا ہوا ہوں،'' وکرم نے دکھی من سے کہا۔

بیلا نے پوچھا'' کیا مطلب؟''

''دیکھو میرے سارے ساتھی ملند، موہن، جگو، جیوا اور مینڈی وغیرہ کس طرح لڑائی کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ کیسے سب کو آمادہ کیا کرتے تھے۔ ٹریننگ اور مشق میں ایک دوسرے کا پسینہ نکال لیتے تھے۔ تم تو سب کچھ جانتی ہی ہو۔''

''ہاں ان کو جنگ کے لیے تیار کرنے میں تم نے کوئی کور کسر باقی نہیں رکھی۔ اب وہ اتنے ماہر فائٹر پائلٹ ہیں کہ جنگ میں ضرور بہتر حصہ داری درج کرائیں گے،'' بیلا نے دوسروں پر ہی زور دے کر کہا۔

''وہ تو ہے،'' وکرم بولا۔'' کچھ تو ضرور بہادری دکھائیں گے مگر کچھ شہید بھی ہوں گے۔''

بیلا کچھ نہ بولی۔ بلکہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ وکرم نے ایسے امکانات سامنے رکھ دیے جیسے وہ قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن رد بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ان امکانات میں اس کا محبوب، سولہ برس سے اس کا مدعا، جنم جنم سے بندھا ہوا اس کا ساتھ، آج اس کی بانہوں میں ہنستا، ہنساتا، شاداب و

شگفتہ اس کا شوہر وکرم بھی شامل تھا۔

اگلی شام وکرم نے پھر وہی رٹ لگائی، ''بیلا! دیکھو میرے ساتھ کے لوگ اپنے آپ کو لڑائی میں جھونک رہے ہوں گے، جان دے رہے ہوں گے اور میں یہاں آرام سے دفتر میں بیٹھا رہوں گا۔ یہ بات مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔''

اپنے فرض اور اپنی خوشی کے بیچ لٹکا ہوا وکرم، اپنے شوہر کی محبت اور اس کی فرض ادائیگی میں رکاوٹ پیدا کرنے کے خوف کے بیچ لٹکی بیلا۔ لڑاکوں اور ان کی بیویوں کو الجھانے والے یہ سوال، قربانی یا خود کی حفاظت، وطن پروری یا خود سلامتی جیسے سوالیہ نشان روز ازل سے ہی انسانوں کے سامنے تھے۔ جودھا بائی اکبر اعظم کو تلک لگا کر میدان جنگ کے لیے الوداع کہتی تھیں، تو بہت سی رانیاں اور مہارانیاں ایسی بھی ہوئی ہیں جنھیں شوہروں کو رن میں جاتے دیکھ غش آ جایا کرتا تھا۔

جنگ میں حصہ لینے کی وکرم کی شدید تمنا، اسے محفوظ اور زندہ دیکھنے کی بیلا کی آرزو......اسی جدوجہد میں، اسی جرح اور بحث میں کئی شامیں گذر گئیں۔ آخر ایک شام ایسا بھی وقت آیا جب بیلا بہت ہی پرسکون، اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی کافی دیر تک وکرم کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ اس کی خاموشی اور گفتگو میں صرف ہوں، ہاں کے مستقل استعمال سے وکرم پریشان ہوا تھا۔

''بیلا! کچھ بولتیں کیوں نہیں؟'' وکرم سے رہا نہ گیا اور اس نے پوچھ ہی لیا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟'' وکرم نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے دباتے ہوئے کہا۔ ''بیلا، بتاؤ آخر میں کیا کروں؟''

بیلا چپ رہی۔ اس نے دھیرے سے وکرم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ قدم قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ اس نے وکرم کی طرف مڑ کر اپنا سر اوپر اٹھایا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''وکرم تم جاؤ، اپنی لڑائی لڑو، جو تمھیں ٹھیک لگ رہا ہے وہ کرو۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ، اپنے فرض کے لیے جاؤ، مجھ سے نہ پوچھو۔ میری فکر نہ کرو، جاؤ، وکرم جاؤ۔''

مبہوت۔ بیلا کے ان جملوں سے حیرت زدہ وکرم، کچھ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ غصے اور جھلاہٹ میں کہہ رہی ہے یا اس نے حقائق کو قبول کر لیا ہے۔

''تم ناراض ہو؟'' اس نے پوچھا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بیلا نے کہا،" نہیں، بالکل نہیں، میں ناراض نہیں ہوں، بلکہ بہت غور وفکر کے بعد کہہ رہی ہوں۔ دیکھو وکی، میں سمجھ رہی ہوں تم کو اس جنگ میں جانا ہی ہے۔"

"تمھیں میرے مرنے کا ڈر نہیں بیلا؟" وکرم نے اس کے ارادوں کی پختگی کا پھر امتحان لیا۔

بیلا نے بغیر کسی تکلف کے کہا" نہیں وکی، مجھے اب کوئی ڈر نہیں، کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ مجھے تو دونوں طرح سے تمھیں کھونا ہے۔ اگر تم جنگ میں قربان ہو گئے تب بھی تم میرے لیے کھو ہی جاؤ گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور اگر تمھیں جنگ میں جانے سے روک لیتی ہوں تب بھی میں تمھیں کھو دوں گی۔ جس وکی کو میں جانتی سمجھتی ہوں، جو میری رگ رگ میں بسا ہوا ہے، جس کے کردار میں میں کسی بھی طرح کی تبدیلی برداشت نہیں کر سکتی میں جانتی ہوں کہ مصیبت کے وقت اپنے فرائض کی ادائیگی نہ کر پانے سے تم وکی رہو گے ہی نہیں۔ اندر سے، من سے، روح سے یا جسم سے کہیں سے بھی تم میرے کہیں سے تم میرے وکی نہیں رہ جاؤ گے۔"

بیلا کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔ ایک حساس اور دلدوز آواز میں اس نے کہا،" میرا تو دونوں حالات میں نقصان ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ کم سے کم تم ہی مطمئن رہو۔ تمھاری خودداری، تمھاری فرض شناسی تو برقرار رہے۔ سرحد کی جنگ سے کہیں زیادہ اہم وہ جنگ ہے جو تم مستقل اپنے آپ لڑ رہے ہو اور یہ امتحان بھی تم نے اپنے لیے خود مقرر کیا ہے۔ اس لیے وکی اب تو تمھیں جانا ہی ہے۔"

—

"کل..... کل ہی صبح تم جاؤ گے؟" بیلا نے سہمتے ہوئے پوچھا۔

یہ وقت بڑا نازک ہے۔ وکرم اس موضوع کو بڑھانے سے ڈر رہا تھا۔" دیکھو! میں کچھ دنوں "بنی" کی "میتھس" نہیں دیکھ پاؤں گا، باقی سبجکٹس تم دیکھ لینا" وکرم نے بات بدل دی، اور بیلا کو لڑائی کے بارے میں بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بیلا بھی سمجھ رہی تھی کہ جذبات کو الگ رکھنا ہی ٹھیک ہوگا، حالانکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ وکرم کی آواز پھر کبھی بھی نہ سن پائے۔

آخر میں اس نے ایک بناوٹی جوش کے ساتھ اسے الوداع کہا، آل دی بیسٹ وکی، لک آفٹر یور سیلف۔

اور اب بستر میں لیٹے ہوئے کروٹیں بدلنے کا وقت۔ نیند غائب تھی، دماغ جانے کہاں کہاں گشت کر رہا تھا۔ مگر وکرم کو تعجب تھا کہ اس وقت گھر خاندان اعزا و اقربا سے متعلق خیالات ذہن میں کم ہی آ رہے تھے۔ اسے تو رہ رہ کر دشمن کے جہاز، ٹینک، توپیں اور جگہ جگہ ہوتے ہوئے دھماکے ہی دکھائی دے رہے تھے اور ان تمام خیالوں اور تصویروں کے بیچ ایک عجیب سا احساس، ایک برائی کا احساس ذہن کو مضطرب کیے ہوئے تھا۔ یہ کھلبلی اور یہ گھبراہٹ آخر دروازے پر ہوئی دستک سے ٹوٹ گئی۔

''وکرم سر!......'' ایک ہلکی سی آواز آئی۔ وکرم ڈینی کی آواز پہچان کر بستر سے باہر نکلا۔ اس نے سوچا شاید ڈینی کوئی خاص پیغام لے کر آیا ہے۔

''کیا بات ہے ڈینی؟'' وکرم نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ وہ نوجوان افسر باہر ٹھنڈ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جب کوئی جواب نہیں دیا تو وکرم نے قدرے جھلاہٹ کے ساتھ کہا، ''ڈینیل بات کیا ہے؟ بتاتے کیوں نہیں؟''

''سر!...... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے،'' ڈینی آخر بول پڑا۔ ''لیکن اگر آپ سو رہے ہوں تو......''

''اب تو تم نے جگا ہی دیا ہے،'' یکا یک وکرم نے اپنے آپ کو آگے کچھ کہنے سے روک لیا۔ ڈینی کی آواز میں کچھ پریشانیاں صاف دکھائی دے رہی تھی اس لیے وکرم نے بڑی نرمی سے کہا، ''اچھا ڈینی آؤ اندر آ جاؤ۔''

وکرم تکیوں کی ٹیک کے سہارے بستر پر بیٹھ گیا اور ڈینی کو بھی اپنے پاس ہی بیٹھا کر کمبل کا ایک حصہ اس کے پیروں کی طرف بڑھا دیا۔ وکرم نے مسکراتے ہوئے اپنی بھنویں اونچی کیں جیسے دوبارہ اطمینان دلاتے ہوئے اسے اپنی بات کہنے کی دعوت دے رہا ہو۔

ڈینی نگاہ نیچی کیے ہوئے بولا ''سر مجھے...... مجھے سر بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

بائیس برس کا یہ فائٹر پائلٹ، یہ جوانی اور یہ صحت، ایسے میں تو حوصلے اور البیلے پن کی توقع ہوتی ہے پر یہ کیا؟ ایک ماہر پائلٹ، اچھا افسر، جس سے آئندہ کے لیے بڑی امیدیں کی جا سکتی تھیں۔ پر اب اسے کیا ہو گیا؟

فوج میں خوف کو بزدلی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ردِعمل کے طور پر کسی بزدل کو بڑی ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کافی حد تک یہ ٹھیک بھی ہے کیوں کہ ایسا برتاؤ کسی طرح کی ہچک رکھنے والوں کو کم سے کم ایک فرضی بہادر کا چہرہ ہی سامنے رکھنے پر مجبور کرتا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اداکاری کے طور پر ہی سہی کچھ نہ کچھ دیر تو موقع پر ڈٹا ہی رہے گا۔ لیکن یہ دوا ہر مرض میں فائدہ نہیں پہنچاتی اور نہ ہر مریض پر اس کا مثبت اثر ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب ایک طرف ڈینی جیسی سوجھ بوجھ کا افسر ہو اور دوسری طرف سر پر گھماسان لڑائی۔ ایسے حساس اور نازک حالات میں بھی وہ ڈینی کو کل صبح حملے پر جانے والی ٹولیوں سے کیا بلکہ پوری لڑائی تک اسے مورچوں سے الگ رکھ سکتا تھا لیکن یہ ایک اکسپرٹ پائلٹ اور اچھے افسر کو کھودینے جیسا ہوگا۔ وکرم اس ٹیم کا لیڈر تھا۔ اس کا کام تھا، سب کو ساتھ لے کر چلنا۔ وہ چاہے اچھے ہوں یا برے، بہادر ہوں یا کمزور۔ اصلی چنوتی تو کمزور کو سنبھالنے کی ہوتی ہے۔ تو کیا وہ ڈینی کو سنبھلنے میں مدد دے سکتا تھا۔ کم سے کم اس کے ڈر کو وہیں روک کر اسے اتنا حوصلہ تو دے ہی سکتا تھا کہ وہ اوروں کے پیچھے لگ کر تھوڑا بہت فرض نبھالے۔ بھلے ہی کسی محاذ پر اکیلے نہ آگے بڑھے لیکن دوسروں کے ساتھ جا کر بم تو گرا ہی آئے۔

ہوشیار، وکرم نے خود کو سمجھایا، کوئی بھی ایک غلط لفظ کہنا یا اشارتاً بھی اسے کمتر ہونے کا احساس کرانا اس ہونہار نوجوان کو ذہنی طور سے برباد کردے گا۔ وہ زندگی میں کبھی بھی کمتری کے اس احساس سے ابھر نہیں پائے گا۔ اس لیے صرف سچ، یہاں تک کہ جینے مرنے کی تلخ سچائی، دل میں بسی امید اور ڈر کے دو پہلو۔ حوصلہ اور بزدلی کے بیچ کی پتلی سی لکیر، اور ان سب کے اوپر، سب پر حاوی، انسان کی فرض شناسی اپنے لیے، اپنی فوج کے لیے، اپنے ملک کے لیے، یہی سب سمجھنا تھا، سمجھانا تھا۔ خوف سے اوپر اٹھ کر ہاتھ بٹانا تھا۔ اس لیے بڑی آسانی اور نرم روی سے وکرم نے دھیرے سے کہا، ''سچ پوچھو تو ڈینی ڈر تو مجھے بھی بہت لگ رہا ہے۔''

''سر؟'' ڈینی چونک کر بولا۔ وہ وکرم کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے کان سننے میں کچھ غلطی کر گئے ہیں۔ اس کا یہ کمانڈر............اور ڈر؟ یہ آدمی جو تیرہ تاریخ والے جمعہ کو ضرور اڑان بھرتا تھا، جو دیوار پر لگی سیڑھیوں کے نیچے سے ضرور گزرتا تھا، صرف اندھی عقیدت اور خوف کو سب کے سامنے چنوتی دینے کے لیے۔ سب کو حوصلہ مند تحریک دینے کے لیے، پائلٹوں کے دل سے انہونی کی

علامتوں اور اس کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے، اور ایسے انسان کو بھی لڑائی میں جانے کا ڈر؟

''ہاں ڈینی، بالکل سچ؛'' وکرم نے کہا۔ ''اور کون ہے؟— جو جنگ میں جانے سے پہلے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی ہے تو جھوٹا ہے، یا گدھا ہے جس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔''

''سر آپ مجھ سے نا امید تو نہیں ہیں؟'' ڈینی نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

''اگر تم کہتے کہ لڑائی پر جانے کا تمھیں کوئی ڈر و ر نہیں ہے یا تمھیں کسی طرح کی فکر نہیں ہے، تو میں ضرور سکپکاتا، اور تمھارے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوتا۔ دیکھو جلد بازی میں اندھے ہوئے لوگ ہی خوف سے انکار کرتے ہیں، اپنی ہیکڑی میں خود کو لافانی اور وقت کو فتح کر لینے والا سمجھنے لگتے ہیں۔ واقعی ایسے بہت لوگوں کو میں نے کریش کی آگ اور دھویں میں اپنے انجام کو پہنچتے ہوئے دیکھا ہے۔ نہیں ڈینی تم بدحوصلہ اور ڈینگ مارنے والے نہیں ہو۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک عام آدمی کی طرح تمھیں بھی کچھ خوف یا کسی انہونی کا اندیشہ پریشان کر رہا ہے۔ آج کی رات یہاں ہر ایک انسان کچھ ایسے ہی تخیلات سے گزر رہا ہوگا۔''

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے سر؟'' ڈینی نے کچھ اور بڑھے ہوئے حوصلے کے ساتھ کہا۔

''کیا کرنا چاہیے؟ کیا کر سکتے ہو؟'' وکرم کو لگا کہ شاید اسے کامیابی مل رہی ہے۔ ''دیکھو ڈینی، ایسا ہے، جب جنگ قریب آنے لگتی ہے، جیسا انیس سو باسٹھ میں، پھر پاکستان کے خلاف انیس سو پینسٹھ میں اور اب انیس سو اکہتر میں، تو ہمارے تمھارے جیسے فوجیوں کا رات میں تارے گنتے رہنا فطری ہے۔ میاں والی اور سرگودھا کے ہوائی اڈے اور وہاں کھڑے سیبر اور ایف 104-جہاز انھیں رات بھر دکھائی دیں گے۔ تم امرتسر یا پیشاور کے اوپر فضا میں دشمن کے جہازوں سے بھڑے ہوئے ہو یا ڈائیو Dive میں ہو اور پاکستانی ٹینک تمھاری توپوں کے نشانے پر ہیں۔ تم گولیاں چلاتے ہو، دشمن کو تہس نہس کرتے ہو اور ایک ہیرو کی طرح واپس آتے ہو۔ کبھی دشمن کی گولیاں تمھارے جہاز کو بھیدتی ہیں، تم پیراشوٹ سے کودتے ہو، زمین پر دشمن سے بچ کر چھپتے چھپاتے واپس اپنے وطن لوٹ آتے ہو۔ ایک دم ہیرو تو نہیں پھر بھی ایک باحوصلہ، ہار نہ ماننے والوں کی قطار میں۔'' تھوڑا رکنے کے بعد وکرم آگے بڑھا۔ ''تو ڈینی! اس وقت کچھ بھی کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ بس اپنے دل میں سوچو سرسال پور اور جیکب آباد کے ہوائی اڈوں اور وہاں قطار سے کھڑے ''مگ 19'' جہازوں کے بارے میں اور کل صبح وہاں پہنچ کر ان سب کو اڑا دو بس یہی سوچنا ہے اور یہی کرنا ہے۔''

''سر! وہاں میزائلیں بھی تو ہوں گی؟'' وکرم کے سمجھ میں اب آیا کہ ڈینی کا خوف انھیں میزائلوں پر مرکوز تھا۔

''ہونی تو چاہیے۔'' وکرم نے بے توجہی سے کہا، ''مگر تم تو پیڑوں کی اونچائی پر فلائنگ کرو گے، تمھارے اوپر یہ میزائلیں لاک نہیں ہو سکیں گی اور کچھ ہوتا بھی ہے تو کیا؟ ہمارے جہازوں میں اتنی اچھی اجکشن سیٹ ہے، بٹن دبایا نہیں کہ پیراشوٹ کے سہارے صحیح سلامت جہاز سے نیچے۔''

اس حساب سے پائلٹ کو خطرہ ہی کیا ہے؟ سب کچھ محفوظ، حفاظت کا ہر انتظام پختہ۔ مگر ڈینی اس وقت مسحور تھا اور وکرم کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو سچ مان رہا تھا۔ آخر میں یہ مسئلہ تب حل ہوا جب ڈینی نے کہا، ''سر! آپ مجھے کل اپنا نمبر دو بنا کر چل سکتے ہیں؟''

''ضرور — اگر تمھاری یہی خواہش ہے'' وکرم نے ڈینی کی بات مانتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح میں تمھاری جگہ بدل دوں گا۔ ویسے بھی تم دو چار بار میرے ہی ساتھ چلو۔ مگر میرا خیال رکھنا ہوگا، دشمن کے جہازوں کو میرے نزدیک پھٹکنے مت دینا۔''

صبح ہوتے ہی ڈینی نے اپنی زندگی کی پہلی جنگ کے پہلے حملے کے لیے اڑان بھری۔ فلائنگ بالکل متوازن، ہر قلابازی جیسے سیدھے کتاب سے نکالی گئی ہو۔ پھر بھی وکرم حوصلہ بڑھانے کے لیے ریڈیو پر حوصلہ افزائی کے دو چار جملے ضرور بول دیتا تھا۔ حملے بہت ہی کامیاب رہے۔ ایک دو نہیں بلکہ وکرم اور ڈینی نے اس روز پاکستان پر تین بار حملے کیے۔ وکرم ہر بار لوٹنے پر حملوں کے بارے میں ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ پچھلی رات کی گفتگو کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں۔ دوسرے دن کے حملوں کے بعد وکرم نے سوچا کہ اب ڈینی دھیرے دھیرے خود کفالت کی طرف ڈھکیلنا ہی ٹھیک ہی رہے گا۔ اس لیے اگلے دن اس نے ڈینی کو کسی بہانے سے دوسرے سینئر پائلٹ کے ساتھ بھیج دیا اور اب اس کے لیڈر تھے موہن۔ خود اعتمادی اور مہارت سے بھرے ہوئے،

دوسروں کی خامیوں کے بجائے اپنی اچھائیوں پر نگاہ رکھنے والے۔ موہن کی رہنمائی میں ڈینی اور بے خوف ونڈر ہوتا گیا۔ اس کی خود اعتمادی نکتۂ عروج کو پہنچ چکی تھی لیکن ڈینی کو اگلے ہی روز زوردار دھکا لگا۔ وکرم کا جہاز پاکستان میں مار گرایا گیا اور اسے "جنگ میں لاپتہ" مشتہر کر دیا گیا۔ اتنا ہی نہیں اس کے دوسرے دن دیکھتے دیکھتے موہن کا جہاز دشمن کی توپوں سے زخمی ہو کر فضا ہی میں بم کی طرح پھٹ گیا۔ یہاں تک کہ موہن کو پیراشوٹ سے کودنے تک کی بھی مہلت نصیب نہ ہو سکی اور ڈینی پھر اکیلا رہ گیا۔ جن دو لوگوں نے اسے حوصلہ ہی نہیں بخشا بلکہ اس کی قوت ارادی کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اپنی حفاظت کی پروا نہ کرتے ہوئے اس جیسے اناڑی کو جنگ میں اپنے ساتھ بھی رکھا، آج اس سے بہت دور ہیں۔

رات بھر ڈینی سوچتا رہا۔ وکرم اور موہن نے اسے خوف اور ملامت سے ابھارا تھا۔ اسے میدانِ جنگ میں متحرک ہونے کے قابل بنایا تھا۔ ان کی احسان مندی میں اب وہ وہی کرے گا جس کی ان دونوں نے اس سے امید کی ہوگی۔ اب وہ ایک بہادر فائٹر پائلٹ ہو کر دکھائے گا۔

اس وقت ہندوستانی فوج پاکستان کے شکر گڈھ علاقے میں کافی اندر تک گھس چکی تھی۔ ایک ایک انچ زمین کے لیے گھماسان لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ پاکستانی ٹینک ہندوستانی فوج کو پیچھے کھدیڑنے کے لیے متحرک ہو اٹھے تھے۔ ایک مورچے پر وہ کامیاب ہوتے دکھائی بھی دیے۔ ہوا یوں کہ ان کے ٹینک بڑی تیزی سے بڑھتے ہوئے ہمارے جوانوں پر زبردست گولہ باری کر رہے تھے۔ ہماری فوج نے انھیں روکنے کے لیے ایئر فورس کی مدد مانگی۔ فوراً جہاز بھیجے بھی گئے جہازوں کو آتا دیکھ ٹینک رک کر ایسا چھپ گئے کہ ہندوستانی فوج کے پائلٹ انھیں دیکھ ہی نہیں پائے۔ لیکن ہمارے جہازوں کے لوٹتے ہی ٹینک پھر میدان میں آ گئے۔ ہمارے جوانوں کی چیخ پکار پھر آدم پور کے بیس کمانڈر تک پہنچی، وہ بھی جھلائے، "دو بار جہاز بھیج چکا ہوں، چار جہاز یعنی چار جوڑی آنکھیں، مگر یہ ہیں کہ ان کو ٹینک نظر ہی نہیں آتے۔ فوج سے کیا کہوں کہ ہمارے پائلٹس کے سروں میں صرف دو عدد گڈھے ہیں ان میں آنکھیں نہیں؟"

پاس کھڑا ڈینی سب کچھ سن چکا تھا۔ بغیر زیادہ سوچے وہ ہمت کر کے بولا، "سر! ابھی وقت ہے۔ مجھے ایک بار کوشش کر لینے دیجیے۔ سر اس بار مجھے جانے دیجیے۔" کمانڈر نے اس نوجوان

پائلٹ کی طرف دیکھا کچھ سوچا، پھر حکم دیا کہ ڈینی اپنی رہنمائی میں دو جہاز لے کر جائے گا۔ ڈینی نے پہلے محاذ پر گئے پائلٹس سے جلدی جلدی اس علاقے کی جانکاری لی پھر ترنت اپنے ایک ساتھی کو ساتھ لے کر اڑان بھری اور تھوڑی ہی دیر میں مورچے پر پہنچ گیا۔

ہم لوگ مصیبت میں ہیں گولڈ وَن۔ بھگوان کے لیے چوکنا مت، نیچے سے ڈینی کو اس کے ''کال سائن'' سے مخاطب کرتے ہوئے ایئر کنٹرولر کی آواز ریڈیو پر سنائی دی۔

''او کے،'' ڈینی نے جواب دیا۔ ''ٹینکوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کرو۔''

''گولڈ وَن! تم ہمارے اوپر سے ابھی گزر رہے ہو۔ سیدھے دیکھو، داہنے طرف، ندی کے پورب میں، وہیں مکانات کا ایک جھنڈ ہے۔''

''دیکھ لیا۔ کچھ آگے نکل آیا ہوں۔ واپس مڑ رہا ہوں،'' ڈینی بولا۔

''ان ہی گھروں کے دکن میں تقریباً ہزار گز کی دوری پر ایک بہت ہی گھنا سا باغ ہے، دکھائی دیا؟ ٹینک اسی باغ کے اندر چھپے ہیں۔ تقریباً آٹھ دس۔''

ڈینی نے باغ پر نظر ڈالی۔ سب کچھ پرسکون، کہیں کوئی حرکت تک نہیں۔ پورا علاقہ پیڑوں سے پوری طرح ڈھکا ہوا۔ کہیں کہیں زمین دکھائی بھی دیتی تھی تو خالی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاز کا پٹرول بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ ڈینی نے سوچا کیا اسے بھی ناامید ہی واپس جانا پڑے گا؟ اور تو اور زمینی فوج کے ان بے چارے جوانوں کا کیا ہوگا؟

کبھی کبھی کسی چھوٹی سی بات یا معمولی سی غلطی سے لڑائی کا رخ کس طرح پلٹتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ نیچے کی طرف مستقل آنکھیں گڑائے ہوئے ڈینی نے ایک دم سے آگے بائیں طرف باغ میں کھلی زمین پر کچھ ہلتا ہوا دیکھا۔ ارے دو آدمی وہ بھی فوجی وردی میں۔ بہت دھیان سے دیکھتا ہوا جب وہ ان کے اوپر سے گزرا تو دیکھا کہ ان فوجیوں کے قریب ہی ایک الگ سی پرچھائیں، بڑا بکسہ نما ایک ہیولی۔ ارے مل گیا ٹینک مل گیا۔ فوراً ڈینی نے اس جگہ کا نشانہ لیا اور ایک ساتھ آٹھ راکٹ چلائے یہ سوچ کر کہ ایک تو صحیح ٹھکانے پر پہنچے گا۔

''گولڈ وَن! ویل ڈن'' نیچے سے ریڈیو پر آواز آئی۔ ''وہ دیکھو ٹینک میں سے دھواں نکل رہا ہے۔''

ڈینی نے آس پاس کے پیڑوں کے تنے پر ہی نشانہ لگانے کا فیصلہ کیا اور اپنے ساتھی پائلٹ سے بھی ایسا ہی کرنے کو کہا۔ ان کے اگلے دو حملوں میں ایک اور ٹینک سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا۔ دشمن کو یقین ہو گیا کہ اس کا یہ ٹھکانہ ہندوستانی آنکھوں سے اب چھپا نہیں رہ گیا، اس لیے باقی بچے ٹینکوں سے جوابی فائرنگ شروع ہو گئی۔ پٹرول کافی کم ہو چکا تھا، ڈینی کو چاہیے تھا کہ وہ یہیں مورچہ چھوڑ دے، لیکن جوش میں ایک اور......

نیچے سے تڑاتڑ گولیوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ ڈینی ڈائیو سے جہاز نکال رہا تھا، مگر ایلی ویٹر کے ٹھیک سے کام نہ کر پانے کی وجہ جہاز بڑی ہی مشکل کے ساتھ اوپر اٹھا، پھر بھی ایک پیڑ کی اوپری ٹہنیوں سے رگڑ کھاتا ہوا کسی طرح زمین پر کریش ہونے سے بچا۔

''لگتا ہے'' ایلی ویٹر'' پھنسا ہوا ہے اس لیے ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے،'' ڈینی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ دراصل '' ایلی ویٹر'' جہاز کی دم کا وہ حصہ ہوتا ہے جو جہاز کو اوپر یا نیچے کی طرف لے جاتا ہے لیکن جب گولڈ ٹو نے اپنا جہاز ڈینی کے جہاز سے قریب لا کر دیکھا تو ڈینی کے جہاز کے ''ایلی ویٹر'' کا ایک بڑا حصہ غائب تھا اور اس کے آس پاس بڑے بڑے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ یہ نقصان زمینی توپوں کی فائرنگ سے ہی ہوا تھا۔

جہاز بہت ہی آہستہ آہستہ کچھ اوپر اٹھا اور ڈینی نے اسے گھر کی طرف موڑا۔ گولڈ ٹو، ڈینی کے جہاز پر احتیاط سے نظر رکھے ہوئے تھا، پتہ نہیں کب ہوا کا دباؤ بڑھ جائے اور جہاز کنٹرول سے باہر ہو جائے۔ اس کا دل بھگوان سے لگاتار یہی پرارتھنا کر رہا تھا کہ کسی بھی طرح ڈینی بامب لائن پار کر لے تاکہ اگر اس کے بعد اسے جہاز چھوڑنا بھی پڑے تو وہ کم سے کم اپنے ہی علاقے میں نیچے آئے گا۔

اپنی فضا میں پہنچ کر ڈینی نے جہاز کو اوپر لے جانا شروع کیا۔ جہاز ہچکولے کھا کھا کر ادھر ادھر مڑ رہا تھا ایسی حالت میں اسے زمین پر اتارنا ٹیڑھی کھیر تھی لیکن ڈینی نے سوچا کہ وہ کوشش تو ضرور کرے گا۔ دراصل کوئی بھی ذمے دار پائلٹ جہاز کی قیمت سمجھتے ہوئے اسے چھوڑنا نہیں چاہتا بلکہ اسے بحفاظت آخری پلوں تک واپس لانے کی جدوجہد جاری رکھتا ہے۔

گولڈ ٹو، نے آدم پور ہوائی اڈے کے کنٹرول ٹاور کو اطلاع دی کہ ڈینی کا جہاز بری طرح

نقصان زدہ ہو چکا ہے اور لینڈنگ کے وقت اسے مشکل آسکتی ہے، اس لیے ایمرجنسی ڈرل شروع کی جائے۔ کنٹرولر نقصان زدہ جہازوں کو لینڈ کرانے کا عادی ہو چکا تھا اس لیے اس نے فوراً دوسرے جہازوں کو الگ الگ اونچائی پر چکر لگانے کا حکم دیا اور پورا ہوائی اڈّہ ڈینی کے لیے خالی کروالیا۔

دور سے ہوائی پٹی یعنی ''رن وے'' دیکھ کر اس نے دھیرے دھیرے جہاز کی سمت اس سے ملائی، پھر نیچے آنا شروع کیا۔ کنٹرول ٹاور میں دوربینوں کی مدد سے لوگ ڈینی کے جہاز کو آسمان میں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جلدی ہی نیچے سے آواز آئی، ''گولڈ ون'' ہم آپ کو متواتر دیکھ رہے ہیں آپ بالکل صحیح سمت میں رن وے کی طرف آرہے ہیں۔

حالانکہ اس طرح کی باتوں کی ضرورت تو نہیں ہوتی لیکن اس سے پائلٹ کی ہمت بندھی رہتی ہے اور اسے ہر لمحہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھی مصیبت کی اس گھڑی میں اس کی مدد کے لیے کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور اب ڈینی زمین کے بہت قریب آچکا تھا۔ نیچے آنے کے ساتھ ساتھ اس نے جہاز کو ہموار کرنا شروع کیا۔ زمین پر سب نے دیکھا کہ جہاز کا اگلا حصّہ کس طرح جھٹکے لے لے کر اوپر کی طرف اٹھ رہا ہے۔ سب کی سانسیں اپنی جگہ رکی ہوئی تھیں۔ حادثے کے سارے امکانات سامنے تھے۔ لیکن ڈینی کی یکسوئی اور اس کی ہوشیاری کام آئی، جھٹکوں کے ساتھ ہی سہی، پر جہاز نے رن وے کو چھولیا۔ فوراً ڈینی نے انجن بند کر دیا تاکہ رفتار تیزی سے کم ہو اور آگ لگنے کا اندیشہ کم سے کم رہ جائے۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے جہاز ایک جگہ آکر رک گیا۔

اس قابلِ ذکر فرض ادائیگی، خود کو خطرے میں ڈال کر دشمن کے پانچ ٹینکوں کی تباہی اور پھر جان کی بازی لگا کر اتنے تباہ حال جہاز کو صحیح سلامت واپس لے کر آنے کے لیے ڈینی کو ملک کے اہم ترین اعزاز ''مہاویر چکر'' سے نوازا گیا۔

اور اب اپنے ہاتھوں میں وکرم کے پیروں کو جکڑے ہوئے آنسو بھری آنکھوں اور رندھے گلے سے ڈینی کہہ رہا تھا، ''سر! یہ سب آپ کی دین ہے۔''

—

باب دس

دلیری اور شیطانی

بیس کمانڈر اپنی شیشے کی کیبن کے باہر نکلے اور آپریشنز روم کے بالکل بیچ نہایت سنجیدگی سے کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر وہ چاروں طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''کل صبح سوا دس بجے سرگودھا کے علاقے میں اڑان پر کون تھا؟

حملوں پر جانے اور لوٹنے والوں کے علاوہ کئی پائلٹس بھی آپریشن روم میں ادھر سے ادھر آجا رہے تھے لیکن سرگودھا کا نام سنتے ہی سب رک کر دھیان سے سننے لگے۔ سرگودھا پاکستانی ایئر فورس کی سب سے طاقتور بیس تھی۔ اس سے متعلق کوئی بھی کارروائی، کوئی بھی اطلاع اہم ہی ہو سکتی تھی۔

''کون.....؟'' سوال پھر پوچھا گیا۔ کمانڈر کی حالت اور اس کی آواز دونوں سے ہی کسی خطرے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ضرور کسی نے کوئی گڑبڑی کی ہوگی۔ کیا کوئی اپنے ساتھیوں کی فکر کیے بغیر مورچہ چھوڑ کر بھاگ آیا؟ یا دشمن کے علاقے میں کہیں بم پھینک کر یہ رپورٹ دے دی کہ حملہ کامیاب ہو گیا۔ کیوں کہ ایسے واقعات اکثر ہی ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اب.....کون.....کون؟

انھیں اوقات میں فلائٹ لیفٹیننٹ ملہوترا جسے سب ''میلی'' کہہ کر پکارتے تھے، ہال میں داخل ہوئے۔ سبھی اچانک مڑ کر ان کی طرف گھورنے لگے، جیسے پہیلی کا حل مل گیا ہو۔ میلی نے ایک

ایک کر کے سب کے چہروں پر نظر ڈالی، وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ سب کی نگاہیں انھیں کیوں مجرموں کی طرح دیکھ رہی ہیں۔ حالانکہ اپنے ساتھیوں اور سینئروں کے چہروں پر وہ بہت بار اس طرح کے انداز دیکھ چکے تھے جیسے کہ ساری کیاں انھیں میں ہوں۔ یا کسی بھی غیر معمولی واقعے کے پیچھے بھی ہمیشہ وہ رہتے ہوں۔ لیکن یہ جنگ کا وقت تھا، اس وقت کون سا قاعدہ، کون سا قانون؟ یہ جنگ تھی زندگی اور موت کا تصادم، وہ اپنا جہاز ہوا میں توڑ مروڑ ڈالیں یا ضرورت پڑنے پر کچھ بھی کر ڈالیں، بس دشمن کا خاتمہ کرتے رہیں، آگے بڑھ بڑھ کر انھیں مارتے رہیں۔ بقیہ سب کچھ بے وجہ۔ ان کی طرح کے پائلٹس ایسے وقت کا انتظار کرتے ہیں، جب ان پر کوئی بھی پابندی نہیں لگا سکتا۔

''کل صبح دس بجے سرگودھا ہوائی اڈے کی اونچائیوں پر کون اڑ رہا تھا؟'' بیس کمانڈر نے میلی کی طرف دیکھتے ہوئے سختی سے دہرایا۔

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ، نگاہ کچھ نیچی، چہرے پر گہری فکر کے آثار، کچھ نہ بولنے کی حالت میں سامنے کھڑے میلی.....

—

میلی دغا فریب سے پاک، مخلص اور سیدھا سادہ افسر تھا، اس میں ایک عجیب سی بے خوفی اور آگے بڑھ کر ضرورت سے زیادہ کچھ کر ڈالنے کی عادت بہت شدید تھی۔ ساری خوبیاں اور خامیاں ملا کر بھی اس کے کردار کی تعریف بیان کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں، سینئروں اور اپنی یونٹ کے لیے ہمیشہ وفادار رہتا تھا۔ لیکن یہ وفاداری کبھی کبھی مصیبت بن جاتی تھی۔ کام سے وہ کبھی بھی جی نہیں چراتا تھا بلکہ مسئلہ یہ ہوتا تھا کہ اسے ضرورت سے زیادہ کام کرنے سے کس طرح روکا جائے۔ چاہے نوعمر پائلٹوں کی ٹریننگ ہو یا کھیل کا میدان وہ اپنے ساتھ ساتھ سبھی کا تیل نکال لیا کرتا تھا۔ افسوس یہ تھا کہ اپنی ہر کوشش کو صحیح ڈھنگ سے کامیابی تک پہنچانے میں وہ کہیں نہ کہیں ضرور پھسل جاتا تھا۔ اس کے جاننے والوں میں یہ بات خاصی مشہور تھی کہ اگر کسی میدان میں صرف ایک ہی گڈھا ہے تو ''میلی'' اپنے گرنے کے لیے اسے ضرور تلاش کر لے گا۔

اس فائٹر اسکواڈرن کو ایک نئی جگہ پر لایا گیا تھا۔ چاروں طرف جھاڑ جھنکھاڑ اور زمین اوبڑ

کھا بڑتھی۔ ایک دن کمانڈر صاحب نے کہا ایسے میں تو نہیں رہا جا سکتا یہ سب صاف کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی کچھ باغ باغیچہ بھی لگانا ہوگا۔

عادت سے مجبور میلی فوراً بول پڑے، ''جی ہاں سر! جاڑا آنے والا ہے، یہی صحیح وقت ہے پیڑ پودے لگانے کا۔'' اس طرح باغبانی کا سارا کام میلی کے سر مڑھ دیا گیا۔ شاید میلی نے وہ کہاوت نہیں سنی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ کبھی خدائی فوجدار نہ بنو اور نہ ہی کہیں بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات پیش کرو۔ لیکن میلی نے یہ کہاوت سن بھی رکھی ہوتی تو اسے کیا فرق پڑتا۔ کام نہ کرنے کی صلاح اسے اچھی ہی کہاں لگتی تھی۔ اسے تو ہر وقت جد وجہد چاہیے اور مطلب صرف نتیجے سے نہ کہ کیوں؟ کیسے؟ اور کب؟

میلی نے فوراً تمام یونٹوں کا معائنہ شروع کر دیا۔ کس کا باغ اچھا ہے کس کے یہاں پودے ٹھیک ہیں؟ کہاں کھاد اور پانی کا انتظام بہتر ہے؟ اس میس پر کافی دنوں سے قیام پذیر دوسرے فائٹر اسکواڈرن کا انتظام سب سے اچھا تھا۔ ان کے یہاں صاف ستھری کیاریوں کے ساتھ ساتھ نرسری بھی تھی جس میں نئے پودے روپائی کے لیے بالکل تیار تھے۔ بس تو دیر کاہے کی۔

دوسرے روز ہی یونٹ کی بلڈنگ کے سامنے پچاس لوگ اکٹھا ہوئے۔ ہاتھوں میں کدالیں، پھاوڑے اور کھرپے کھرپیاں لیے ہوئے۔ میلی سب سے بڑا پھاوڑا اٹھائے سب سے آگے۔ صفائی ہوئی، کھدائی ہوئی، زمین ہموار کرنے کے ساتھ ساتھ شام تک کیاریاں بھی تیار ہوگئیں۔ کسی کو وہاں سے ہٹنے کی اجازت نہیں تھی۔ رات کا کھانا ''میس'' نے وہیں بھجوا دیا۔ سگریٹ میلی خود ہی منگوا کر سب کو بانٹ رہے تھے۔ پیاس کے بہانے پانی کے دو ٹینکر منگوا لیے گئے تھے۔ یعنی آگے کی کارروائی کے لیے پوری تیاری۔

آدھی رات کو تقریباً دس لوگ ٹہلنے نکل پڑے۔ وہ جب لوٹے تو ایسے کئی باغ بھر کے نئے پودے ان کے ہاتھوں میں تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں باغ تیار ہوگیا اور کیاریاں پانی سے بھر دی گئیں۔ میلی نے بڑی باریکی سے سارا پلان بنایا تھا۔ یہ سنیچر کی رات تھی، دوسرا دن اتوار اور پھر سوموار کو سرکاری چھٹی۔ دو دن تک کوئی جھانکنے نہیں جائے گا، اس کے بعد کس کو کیا پتہ پودے کہاں گئے؟ میلی کو کیا خبر تھی کہ اسی اتوار کو دوسرے اسکواڈرن کے کمانڈر کے دو چھوٹے بچے اپنے

ڈیڈی سے ان کا دفتر اور جہاز دکھانے کی ضد کریں گے۔ کمانڈر کو بچوں کی ضد ماننی بھی پڑی ساتھ ہی محترمہ بھی گاڑی پر بیٹھ گئیں۔ محترمہ نے اپنا باغ بچوں کی طرح سجایا سنوارا تھا۔ اپنے شوہر کی چو طرفہ کامیابی میں ان کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ ظاہر تھا کہ ان کے پہنچتے ہی وہاں شور شرابہ شروع ہو جائے گا۔

چاروں طرف ٹیلی فون کھڑکھڑانے لگے، معاملہ بیس کمانڈر تک پہنچا۔ میلی کے کمانڈر سے خود اپنی یونٹ کی جانچ کے لیے کہا گیا۔ معاملہ صاف تھا ایک بڑی چوری کا، وہ بھی ایک عورت کے سامان کی چوری۔ کون نہیں جانتا تھا کہ دوسرے کمانڈر کی بیوی بالکل نجی ملکیت کی طرح اپنے پیڑ پودوں کی نگرانی کرتی تھی۔ کچھ افسروں نے اور بھی باتیں بنائیں۔ دوسری یونٹ کے کچھ افسروں نے میلی کے کمانڈر کے لیے دو چار ہتک آمیز جملے بھی کہہ دیے۔ نتیجتاً میلی نے ڈائننگ ٹیبل سے چاقو اٹھالیا اور جب تک سب سے معافی نہیں منگوالی تب تک حملہ کرنے پر آمادہ رہا۔ روز کوئی نہ کوئی جھگڑا، روز نئی شکایت۔ یہاں تک کہ میلی کے ایک فلائٹ کمانڈر نے بھی یہ بات کہہ دی کہ اب کوئی سخت کارروائی ٹالی نہیں جاسکتی۔ کم سے کم تھوڑے دنوں کے لیے ہی سہی ''میلی'' کو ''گراؤنڈ'' یعنی جہاز اڑانے سے محروم کر دینا چاہیے۔ یہ ایک طرح کی ایسی عملی سزا ہے جو اکثر زیادہ جوشیلے پائلٹوں کو بس میں رکھنے کے لیے دی جاتی ہے اور کامیاب بھی ہوتی ہے۔

آخر میں کمانڈر نے وکرم کی طرف دیکھا۔ وکرم نے اطمینان دلایا کہ وہ خود سارے معاملات باریکی سے دیکھ کر اپنی رپورٹ دے گا۔ ایک دوسرے موقعے پر وکرم میلی کے بارے میں کمانڈر سے یہ کہہ چکا تھا کہ سر! کبھی کبھی کھوٹا سکہ بہت کام آتا ہے اور کمانڈر نے مسکرا کر وکرم کی بات مان لی تھی۔ جس کی وجہ سے میلی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس بار بھی وکرم سمجھ رہا تھا کہ معافی یا سزا صرف ایک ہی شخصیت پر منحصر ہوگی اور شخصیت ہوں گی دوسرے کمانڈر کی بیگم صاحبہ۔ اس لیے سب سے پہلے اس نے ان ہی محترمہ سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب جانتے تھے کہ جہاں تک عورتوں کا سوال تھا وکرم ان سے وہ حاصل کر لیتا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ لہٰذا میلی دو سیکنڈ ہاتھ جوڑ کر پھر مصیبت سے آزاد ہو گئے۔

—

مگر کل سوا دس بجے کون ہندوستانی پائلٹ سرگودھا کے اوپر؟ کون.....کون؟

سرگودھا کے دکن میں ایک اور ہوائی اڈہ تھا، جہاں پاکستانی ہوائی جہازوں کے اکٹھے ہونے کی خبر کہیں سے موصول ہوئی۔ اس کی تصدیق کے لیے اس ہوائی اڈے کی فوٹوگرافی ضروری تھی۔ یہ مشن میلی کے سپرد کیا گیا تھا۔ میلی نے بہت سوجھ بوجھ اور محنت سے پلان بنایا جس کا خاص حصہ تھا دشمن کو حیرت میں ڈال کر یا فریب دے کر اتنی اونچائی تک لے جانا جہاں سے پورے علاقے کی تصویر کشی کی جاسکے۔ اس لیے جب وہ سرگودھا کی سمت میں جائے گا تو سرگودھا کنٹرول کو اطلاع ہو جائے گی کہ ہندوستانی جہاز ادھر آرہے ہیں۔ لیکن دومنٹ پہلے وہ دکن کی طرف سمت بدل لے گا اور اوپر اٹھتا ہوا جہاز کے نیچے لگے کیمرے سے فوٹوگرافی کرے گا۔ ایک دم سے ہوائی اڈے کے اوپر ظاہر ہونے سے زمین پر لگی توپیں صحیح نشانے پر فائرنگ بھی نہ کرسکیں گی اور جہاز بھی محفوظ رہیں گے۔

ایسے مشن پر عموماً دو جہاز بھیجے جاتے ہیں۔ آپسی حفاظت اور مشن کی کامیابی دونوں کے لیے۔ مگر اڑان بھرتے ہی میلی کے ساتھ آئے دوسرے جہاز میں کوئی خرابی پیدا ہونے لگی اور پائلٹ کو واپس لوٹنا پڑا۔ میلی کو مشن کینسل کر کے لوٹ آنے کا پورا اختیار تھا لیکن میلی تو دوسری ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ دورانِ جنگ سب جائز ہے۔ اکیلا جانے پر زیادہ سے زیادہ اس کی واپسی مشکل ہوگی لیکن اگر وہ لوٹا تو ظاہر ہے کہ کامیاب ہو کر ہی لوٹے گا اور دونوں طرح کے حالات میں اس سے کوئی جواب طلب نہیں کیا جاسکتا۔

جیسے جیسے سرگودھا قریب آتا گیا۔ میلی کے حواس چوکنا، مرکوز اور ہوشیاری کی انتہا پر تھے۔ کسی بھی وقت نیچے سے فائرنگ شروع ہوسکتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ میزائلیں بھی داغی جائیں۔ وہ علاقے میں بڑھتا ہی جارہا تھا، مگر عجیب بات..... کہ دشمن کی طرف سے کسی طرح کا ردِعمل ہی نہیں۔ پھر یکایک داہنی طرف آسمان میں چنگاری جیسی ایک چمک۔ ایک ذرّہ برابر پرچھائیں اور تیزی سے بائیں جانب جاتا ایک عکس۔ میلی نے جہاز کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس عکس کی طرف تیزی سے موڑا تو دیکھا کہ دشمن کا جہاز سامنے تھا۔ اوپر اٹھنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دونوں جہاز

آمنے سامنے پینترے بدلتے ہوئے محدود دائرے میں تھے، اتنے پاس کہ زمین سے توپیں یا میزائلیں داغی ہی نہیں جاسکتی تھیں۔ ان کل پرزوں یا مشینوں کو کیا معلوم کہ کون اپنا ہے کون پرایا۔ گولیاں تو کسی بھی جہاز میں لگ سکتی تھیں۔

''ڈاگ فائٹ'' چل رہی تھی، یعنی ہوا میں دو جہازوں کی مڈبھیڑ۔ دونوں اس ہوڑ میں کہ مخالف جہاز کے پیچھے کیسے آیا جائے اور کس طرح فائرنگ پوزیشن میں پہنچا جائے۔ بلاشبہ سرگودھا میں موجود پاکستان کے سبھی لوگ زندگی موت کی اس لڑائی کو سانسیں روکے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ''ڈاگ فائٹ'' ویسے بھی ایک فائٹر پائلٹ کی مہارت، ہمت اور جانبازی کی مظہر ہوتی ہے اور دونوں طرف سے جان لڑا کر فلائنگ کی جاتی ہے۔ اس وقت تو یہ ایک خطرناک قسم کے ہندوستان پاکستان میچ جیسا ہی تھا۔ اپنے دانت بھینچے ہوئے میلی جہاز کو ادھر ادھر موڑ رہا تھا، کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی ترچھا کبھی الٹا۔ دھیرے دھیرے وہ دشمن کے جہاز کو پیچھے کھسکاتا ہوا فائرنگ پوزیشن میں پہنچ گیا۔ اب وقت تھا مشین گن کے ٹریگر دبانے کا، کسی بھی فائٹر پائلٹ کی زندگی کا سب سے اہم لمحہ، ایک عجیب قسم کا احساس کرانے والا لمحہ، موت کا حکم دیتے ہوئے ''ٹریگر'' دبانے کا پل۔ ساری ٹریننگ، تمام تیاریاں بس اسی ایک لمحے کے لیے ہوتی ہیں۔ جب ایک سپاہی اپنے دشمن پر اچوک اور آخری وار کرتا ہے۔

دو دو مشین گنوں سے تیس ملی میٹر کی بے شمار گولیاں لامحدود رفتار سے آگے کو چل پڑیں۔ سامنے کے مگ-19 جہاز سے نکلتی دھویں کی پتلی سی لکیر دکھائی دی۔ دھویں کا غبار بڑھتا گیا آخر جہاز آگ کا ایک گولہ بن کر نیچے گرنے لگا۔ کام ختم ہوا۔ میلی نے یہ سمجھنے کے لیے، کہ کیا کر بیٹھا ہے سر کو زور سے جھٹکا، پھر تیزی سے جہاز کو گھر کی طرف موڑ دیا۔

مگر فوٹو مشن؟ جلدی سے اس نے ''پٹرول گیج'' کو غور سے دیکھا، پٹرول بہت کم تھا، صرف لوٹنے بھر کے لیے کافی۔ اب وہ کر ہی کیا سکتا تھا؟ تصویر کشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پھر سب اس کے پیچھے پڑیں گے، کہیں گے دیکھا سب کچھ کرے گا لیکن جس کام کے لیے بھیجا جائے وہی نہیں کر سکتا۔ بہرحال دیکھا جائے گا۔ اس نے سوچا ہو سکتا تھا کہ وہ بٹن دباتا اور کیمرہ کام ہی نہ کرتا تو کیا ہوتا؟ اس کشمکش میں میلی واپس لوٹا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ بہتری اسی میں ہے کہ جب

تک ممکن ہو اس سلسلے میں کسی سے کچھ بھی نہ کہا جائے۔

—

''میلی! کیا تم کل صبح سرگودھا کے علاقے میں گئے تھے؟'' بیس کمانڈر نے سیدھے اسی سے پوچھا اور میلی تھا کہ سچ کو چھپا سکتا تھا، خود کو ظاہر کرنے سے بچ سکتا تھا لیکن — جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

''سر...... سر...... وہ فوٹو مشن، میرا مطلب...... سر......'' الجھن اور گھبراہٹ میں ہکلاتے ہوئے میلی بولا ''کیمرہ...... بٹن...... سر...... میرا مطلب۔''

''مگر یہ کیا؟'' بیس کمانڈر کے چہرے کا تاثر بدل چکا تھا۔ وہاں مسکراہٹ بھی تھی اور تھوڑی سی شیطانی ہنسی بھی۔

''ارے نا سمجھ...... بدھو یہ بتا کہ فوٹو مشن ہوتا کس لیے ہے؟ اسی لیے نہ کہ اس کے سہارے ہم دشمن کے جہازوں کا پتہ لگا سکیں اور پھر ان پر حملہ کر سکیں؟ اور تو نے تو بغیر کسی تصویر کا سہارا لیے ہی ان کا جہاز مار گرایا۔'' اتنا کہہ کر بیس کمانڈر زور سے ہنسے اور میلی کی پیٹھ تھپتھپانے لگے۔

پھر سکون سے بولے، ''دشمن کے وائرلیس پیغامات ہمارے سپاہیوں نے سنے جن میں ایک واضح رپورٹ تھی کہ کل صبح سوا دس بجے ایک ہندوستانی ''سکھوئیہ-7'' جہاز نے سرگودھا کے اوپر ایک پاکستانی ''مگ19'' کو مار گرایا۔ اطلاع ملتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ بچے! یہ تیرا کام ہی ہو سکتا ہے۔''

ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک دوسری اطلاع بھی آئی ہے۔ اس بہادری کے لیے، اس جاں بازی کے لیے صدرِ عالی وقار نے تمھیں ''ویر چکر'' سے نوازنے کا حکم دیا ہے۔ بہت بہت مبارک ہو میلی۔ ویل ڈن مائی بوائے۔

چاروں طرف مبارکباد کے جملے گونج رہے تھے۔ اتنی بھیڑ میں صرف وکرم تھا جو خاموش رہا۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا اور دھیرے دھیرے باہر ہو لیا۔ ایک ہلکی سی مسکان اس کے چہرے پر رقص کر رہی تھی۔

باب گیارہ

کالا سندھو

ایک روز چھٹ پٹ بارش کے وقت سارے ہندوستانی قیدی ایک ہی کمرے میں بیٹھائے گئے۔ اُمس اور گرمی سے ست اور بے جان بھی اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ سوچ کر منوہر ملے ڈلے اور وکرم سے پوچھ بیٹھے۔ ''سر! آپ کالا سندھو کے بارے میں کتنی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

وکرم نے پوچھا'' کیوں؟ کیا جاننا چاہتے ہو؟''

'' آپ دونوں شاید کبھی ایک ہی یونٹ میں ساتھ بھی رہے ہیں؟''

'' ویسے تو ہم لوگ ایک ساتھ فلائنگ اکادمی میں تھے، لیکن وہ مجھ سے چھ مہینے سینئر تھے۔ پھر نمبر چودہ اسکواڈرن میں ساتھ رہا، اس کے بعد جب '' نیٹ'' جہاز آیا تو نمبر دو اسکواڈرن ہم ساتھ ساتھ رہے اور میرا خیال ہے کہ کسی کو جاننے کے لیے اتنا وقت کافی ہوتا،'' وکرم نے کہا۔

'' کیا آپ 1965 کی جنگ میں اس روز پٹھان کوٹ ہی میں تھے، جب ان کے والد وہاں تشریف لائے تھے؟'' منوہر نے پھر سوال کیا۔

'' نہیں! میں ایک دن پہلے'' ہلوارا'' چلا گیا تھا۔ مگر مجھے وہ حادثہ اچھی طرح معلوم ہے۔''

'' تو آج ہمیں اس واقعے کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتائیے پلیز،'' منوہر نے اصرار کیا۔

"ہاں ضرور بتایئے،" پری نے بھی ضد کی۔ "ہم لوگ اس واقعے کو الگ الگ قسطوں میں سنتے آئے ہیں۔ آپ بتایئے کہ اس دن "نیٹ" اور "سیبر" جہازوں کی مڈ بھیڑ میں واقعی کیا ہوا تھا اور بعد میں سندھو کے والد کے آنے پر کیا ہوا؟"

وکرم پرسکون حالت میں بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ آخر کہاں سے شروع کرے۔ کس طرح سمجھائے باپ اور بیٹے کے درمیان کی لامحدود محبت۔ باپ کا اپنی اولاد پر اس قدر فخر اور اس سے اسی درجہ امیدیں۔ اس کے ساتھ ہی سندھو کے ساتھ ہوا دھوکا، اس سے چھنا ہوا حق جو اسے بہر حال ملنا چاہیے تھا۔ وکرم نے یادوں کے دریچے کھولنے شروع کیے اور سیدھے سیدھے بتایا۔

سندھو کی شخصیت بہت سی خصوصیات سے بھری ہوئی تھی۔ وہ جاٹ گھرانے کے سکھ تھے جو عموماً لمبے تگڑے اور گورے چٹے جوان ہوتے ہیں۔ مزاج سے حملہ آور، لڑائی میں خونخوار۔ سندھو نے اپنی برادری کی زیادہ تر خصوصیات وراثت میں پائی تھیں۔ بس ایک معاملہ سب سے الگ تھا۔ یہ سندھو جس کا ذکر چل رہا ہے، اس قدر کالا تھا کہ کالے سے کالے ہندوستانی کو مات دے سکتا تھا۔ کسی کو یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ اس کا نام امر جیت سنگھ ہے۔ ہنسوں میں کوا دکھائی دینے والا امر جیت سنگھ "کالا سندھو" کی عرفیت سے جانا جانے لگا۔ تہذیب اور اخلاق کا خیال رکھتے ہوئے اس کے منھ پر کوئی اسے "کالا" نہیں کہتا تھا بس۔ برتاؤ میں ہمیشہ نرم اور فراخدل، لیکن جہاز میں سوار ہوتے ہی سندھو بے قابو شیر ہو جاتا تھا۔ وہ پہلے "ایرمین" کے طور پر بھرتی ہوا تھا لیکن بہت جلدی ہی فلائنگ کے لیے اس کا چناؤ آفیسر کیڈر میں ہو گیا۔ سیدھے سادے کسانوں کے قبیلے کا یہ لڑکا آج بھی سادگی اور آسانی سے کسی پر بھی بھروسا کر لینے کی عادت چھوڑ نہیں پایا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ گاؤں سے جب اس کے رشتے دار ملنے آتے تھے، تو ایئر فورس کے مغربی رہن سہن میں ان کو اٹپٹا سا لگتا تھا اس لیے "سندھو" ان کو جلدی ہی رخصت کر دیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بہت دن تک اپنی بیوی کو ساتھ نہیں رکھا۔ کیوں کہ انگریزی تہذیب میں بال روم ڈانسنگ کرنے والے افسروں اور ان کی بیویوں کے بیچ وہ بے چاری پنجابی بولنے والی خاتون کیسے ایڈجسٹ کرتی۔ لیکن ساتھیوں کے مشترکہ اصرار پر اس نے بیوی کو بلا لیا اور کچھ ہی دنوں میں اس "معمولی عورت" نے اپنی بے لوث محبت، فراخدلی اور پنجابی کھانوں کی سب سے خاص ورائٹی (سرسوں دا ساگ تے

مکئے دی روٹی) سے بھی کا دل جیت لیا۔ عالیشان سے عالیشان پارٹیوں میں بھی اس کے اردگرد کی کرسیاں کبھی خالی نہیں رہتی تھیں۔

''کالا سندھو'' کی تعیناتی جب بھی پنجاب کے کسی حصے میں ہوتی تو اس کے والد اس سے ملنے اکثر آیا کرتے تھے۔ سفید برّاق کپڑوں میں صافہ قمیص اور تہبند پہنے ہاتھ میں ہلکے رنگ کی چھڑی لیے وہ بس سے اتر کر پیدل ہی بڑے فخر سے سر اونچا کیے ہوئے اپنے فرزند کے بنگلے کی طرف چل دیتے تھے۔ ملٹری کی گاڑی یا بیٹے کی موٹر سائیکل پر سواری کرنا انھیں بالکل پسند نہیں تھا۔ اپنے مضبوط پیروں پر چلنے والے لمبے چھریرے بزرگ۔ ان کی چال میں کبھی کسی طرح کی جھجک یا لڑکھڑاہٹ نہیں دیکھی گئی۔ اپنا یہی انداز انھیں پسند تھا اور یہی انداز وہ ہمیشہ رکھنا بھی چاہتے تھے۔

سندھو کے والد صرف دو ایک گھنٹے رک کر واپس اپنے گاؤں ''سرسا'' لوٹ جایا کرتے تھے۔ وہ بڑی باریکی سے دیکھتے تھے کہ بچوں کی صحت ٹھیک چل رہی ہے یا نہیں، بہو کے چہرے سے اگر مسکراہٹ غائب ہے تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ گھر میں گھی دودھ کی کمی تو نہیں ہے۔ جاتے وقت سندھو کو بڑی سختی سے ہدایتیں دیتے تھے کہ گھر میں ضروری چیزوں کو کبھی نظر انداز نہ کرے۔ باپ بیٹے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ جہاں بیٹا باپ کا بے پناہ احترام کرتا تھا اور باپ کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا وہیں اپنے بیٹے کی کامیابیوں پر باپ بہت فخر بھی کرتے تھے۔ لیکن تعریف کرنا، چال چلن میں ڈھیل دینا اس کے باپ کی عادت میں نہیں تھا اور ان کو نرمی دکھانی بھی نہیں تھی کیوں ان کے بیٹے کو ابھی بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔ ابھی سے مطمئن ہو کر ضروری کوششوں میں ڈھیل دینے کا وقت نہیں آیا تھا۔

سندھو ایک ذہین فائٹر پائلٹ تھا۔ اس نے اپنا یہ سفر ''اسپٹ فائر'' سے شروع کیا تھا۔ جسے دوسری جنگ عظیم کا سب سے نامی گرامی جہاز سمجھا جاتا ہے۔ وہ ''ویمپائر'' سے ''جیٹ'' کے دور میں داخل ہوا پھر ''نیٹ'' کا مانا ہوا پائلٹ سمجھا جانے لگا۔ نیٹ جہاز اس زمانے کا ایک نادر فائٹر جہاز تھا کہ دشمن اس کے نام سے گھبرا جاتے تھے۔

اندیشے کے مطابق پاکستان نے زبردست حملہ پنجاب کے اسی علاقے پر کیا، جس کے کھونے سے ہندوستان کے بقیہ حصے سے جموں کشمیر کا راستہ بند ہو سکتا تھا۔ پاکستانی ایئر فورس نے

بھی سارے کے سارے ''سیبر'' جہاز ہندوستانی فوج اور ہوائی اڈوں پر حملے کے لیے جھونک رکھے تھے۔ ان سے نمٹنے کے لیے امبالا سے نٹ جہاز پٹھان کوٹ لائے گئے اور ان چھ جہازوں کے پائلٹوں میں ایک ''کالاسندھو'' بھی تھے۔

اگلے روز پو پھٹتے ہی چار ''نیٹ'' ہوائی اڈے پر تعینات کر دیے گئے۔ فضا میں پاکستانی ''سیبر'' جہازوں کی کھوج کے لیے گشت جاری تھی کہ اتنے میں بری فوج کے ایک مورچے سے ریڈیو پر یہ اطلاع آگئی کہ ''سیبر'' وہاں حملہ کر رہے ہیں۔ فوراً ''نیٹ'' بھی ڈایو کر کے اسی طرف بڑھے۔ پانچ منٹ کے اندر دونوں جہاز ایک دوسرے کی نگاہ میں آگئے اور فضا میں ہوائی قلابازیاں شروع ہوگئیں۔ ''سیبر''، ''نیٹ'' کے پیچھے آنے کی کوشش میں تھے اور ''نیٹ''، ''سیبر'' کے۔ کیوں کہ چاہے مشین گن ہو یا میزائل سب کے سب سامنے ہی سے فائر کی جاتی ہیں۔ اس لیے ہمیشہ دشمن کے پیچھے سے ہی وار کیا جا سکتا ہے۔

اس پینترے بازی میں ایک ''نیٹ'' تھوڑا داہنے سے ''سیبر'' کے پیچھے لگا ہوا تھا اور فائرنگ کے لیے قریب آنے کی کوشش میں تھا۔ ''نیٹ'' صحیح فاصلے پر پہنچنے ہی والا تھا کہ اس کے پائلٹ نے محسوس کیا کہ اسی ''سیبر'' کے پیچھے بائیں طرف سے اس کا ایک اور ساتھی لگا ہوا ہے۔ لیکن یہ کیا؟ لیکن یہ کیا؟ داہنے والے پائلٹ نے جیسے ہی ''ٹریگر'' دبانا شروع کیا اسی وقت اس نے دیکھا کہ ''سیبر'' سے ایک پتلی دھویں کی دھار نکلنا شروع ہو چکی تھی۔ اس کا ٹریگر بھی دب ہی چکا تھا گولیاں تڑاتڑ ''سیبر'' کی طرف جا رہی تھیں لہٰذا ''سیبر'' آگ کے گولے میں تبدیل ہو کر نیچے جانے لگا۔

خوشی کی بوکھلاہٹ میں داہنے والے نیٹ پائلٹ نے ریڈیو پر ایک دم سے چلّا کر کہا— ''میں نے ایک سیبر مار گرایا۔'' اس کی آواز سن کر بائیں طرف والے پائلٹ نے بھی کہا— ''میں نے بھی ایک ''سیبر'' مار گرایا ہے۔'' بائیں طرف والے یہ پائلٹ کوئی اور نہیں کالاسندھو تھے۔

کالاسندھو کو داہنی طرف کے نیٹ کا اندازہ نہیں تھا، کیوں کہ وہ اس سے آگے تھا۔ ''سیبر'' سے دھواں نکلتا دیکھ وہ اپنی کامیابی پر بے فکر ہو کر ایک دم وہاں سے مڑ گیا۔ داہنی طرف والے پائلٹ نے ''سیبر'' سے دھواں نکلتے تو دیکھا تھا لیکن ٹریگر اس نے بھی دبایا تھا اور دونوں کے اس

عمل میں شاید لمحے کے ایک چھوٹے سے حصے کا ہی فرق رہا ہوگا۔ ''سیبر'' کو مار گرانے کی خوشی اور امنگ میں یہ معمولی سا فرق نظر انداز کر دیا گیا۔ بعد میں پایا گیا کہ دھویں کی پتلی سی لکیر کالا سندھو کے کیمرے میں قید تھی اور دھواں و آگ کا گولہ دوسرے جہاز کی فلم میں۔ واضح تھا کہ سندھو کی گولیاں سیبر کو پہلے لگی تھیں اور دوسرے جہاز کی بعد میں۔ دعویٰ سندھو کا ہی بنتا تھا، لیکن زمین پر معاملہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔

جیسے ہی ''کنٹرول ٹاور'' میں ''سیبر'' کو مارنے کی پہلی اطلاع ریڈیو پر آئی، وہاں خوش خبری کے انتظار میں بیٹھے اسٹیشن کمانڈر اچھل کر کھڑے ہوئے اور اپنی کیپ گھسیٹ کر بغیر کچھ کہے سنے سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ اس جلد بازی میں انھوں نے چند لمحوں بعد کی وہ ریڈیو کال بھی نہیں سنی جس میں سندھو نے اپنے سیبر مارنے کی اطلاع دی تھی۔ باہر انھوں نے دیکھا کہ ایک ''نیٹ'' واپس آکر زمین پر اترنے والا ہے فوراً انھوں نے اسی طرف اپنی گاڑی دوڑا دی جہاں اس نیٹ کو زمین پر رکنا تھا۔ مقدر سے زیادہ طاقتور کوئی شے نہیں ہوتی ہے، اتفاق سے پہلے واپس آنے والا وہ دوسرا پائلٹ ہی تھا۔ جہاز کا انجن بند کر کے جیسے ہی وہ ''کاک پٹ'' میں کھڑا ہوا، دیکھا کہ اسٹیشن کمانڈر کار سے اتر کر اسی کی طرف بھاگے چلے آرہے ہیں۔ وہ بھی حوصلے سے بھرا ہوا تھا زور سے چلّایا، ''سر! میں نے ایک ''سیبر'' مار گرایا ہے۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ ہوا میں ہی پھٹ گیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو نا؟ کوئی شک تو نہیں ہے؟'' اسٹیشن کمانڈر بھی پوری طرح مطمئن ہونا چاہتے تھے۔

''بالکل سر''! پائلٹ نے کہا۔

''سیبر'' ہی تھا نا؟'' کمانڈر نے پھر پوچھا۔ شاید اس امید سے کہ اگر جلنے والا جہاز ''ایف ایک سو چار'' رہا ہو تو اور سونے پر سہاگہ۔

''سیبر سر'' ایف چھیاسی۔'' پائلٹ نے بالکل واضح کر دیا۔

کمانڈر صاحب بھاگ کر کار میں بیٹھے، ڈرائیور کو تیزی سے آپریشنز روم پہنچنے کا حکم دیا اور ......وہاں پہنچ کر انھوں نے سیدھے ہاٹ لائن پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔

''ہم نے ایک سیبر مار گرایا ہے،'' انھوں نے فخر سے اطلاع دی۔ ساتھ ہی یہ کارنامہ انجام

دینے والے پائلٹ کا نام بھی بتا دیا اور وہ وہی پائلٹ تھا جس سے وہ ابھی بات کر کے آئے تھے۔

پٹھان کوٹ ہوائی اڈے پر پچھلے تین دنوں میں پاکستان نے زمین پر کھڑے ہوئے چھ ہندوستانی جہازوں کو تباہ کر دیا تھا۔ یہ کام اس کے "سیبر" جہازوں کا تھا اور اس کی وجہ تھی، اسٹیشن کمانڈر کی نا اہلی جو زمین پر کھڑے اپنے جہازوں کو نہ بچا سکا جب کہ اس کی سیکڑوں ترکیبیں تھیں۔ یہ روسیاہ کمانڈر اپنے بچاؤ کے لیے چاہے ایک ہی سہی لیکن کسی فوری کامیابی کی آرزو کر رہا تھا۔ اس کو پٹھان کوٹ سے ہٹانے کے احکامات بھی ہو سکتے تھے، اس سے پہلے کہ ایسا کچھ ہوتا کوئی ایک کامیابی ہیڈ کوارٹر کی جانکاری میں لانا بہت ضروری تھا، اسی طرح اپنے آپ کو وہ بچا سکتا تھا۔ اس لیے تابڑ توڑ جلد بازی کے پاگل پن میں، بنا ٹھوس ثبوت، بغیر کیمرہ فلم دیکھے اور چاروں پائلٹوں سے پوچھ تاچھ کیے بغیر ہی ایک دم سے ہیڈ کوارٹر کو سیبر مارنے والے کا نام بھی بتا دیا۔

"ہیڈ کوارٹر" بھی پٹھان کوٹ میں ہوئے نقصانات کے زخم سہلا رہا تھا سو وہاں بھی ملک کے سامنے اس کامیابی کو فوراً ظاہر کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ لہٰذا کچھ دیر میں یہ خبر ریڈیو اور ٹرانسسٹر کے ذریعے گھر گھر کیا بلکہ کھیتوں اور کھلیانوں تک میں سنی جا رہی تھی۔ وہ دوسرا پائلٹ ذرا سی دیر میں قوم و ملک کا پہلا "ہیرو" بن گیا۔ اگلے دن اس کی تصویر تمام اخبارات میں اور ہر ایک ٹی وی اسکرین پر موجود تھی۔

ادھر سندھو عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ناامیدی میں چپ ساد ھے، حجرہ نشین ہو کر اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ یہ ہوا کیا؟ اس کا کہیں نام تک نہیں؟ ملک و قوم کا ہیرو تو کوئی اور بن چکا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ سیبر پر دوسرے پائلٹ نے گولیاں داغی تھیں لیکن سندھو تو اسے پہلے ہی مار چکا تھا۔ اسکواڈرن کے تمام پائلٹوں نے دونوں جہازوں کی کیمرہ فلمیں بار بار دیکھیں۔ یہ کیمرہ ٹریگر دبتے ہی اپنے آپ آن ہو جاتا ہے اور گولیاں یا راکٹ کہاں جا رہے ہیں فوراً شوٹ کر لیتا ہے۔ اس لیے اصلیت کسی سے بھی چھپی نہیں رہ گئی۔ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، نیک نامی اور عظمت کا اصلی حقدار کون تھا؟ اس غیر مناسب واقعے اور ناانصافی کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ باتیں اوپر تک پہنچیں اور گھبراہٹ ہونے لگی کہ ایسے تذکروں سے دوسرے پائلٹوں کی حوصلہ شکنی ہو سکتی ہے اور وہ بھی اپنے تئیں انصاف پانے کی امید کھو دیں گے۔ آخر میں سندھو کے سینئر افسر بھرت سنگھ کو اس معاملے میں کچھ کرنے کے لیے کہا گیا، تاکہ یہ مسئلہ ختم ہو اور بھی

یکسوئی کے ساتھ لڑائی کی طرف دھیان دیں۔ بھرت سنگھ سندھو کا ہاتھ پکڑ کر تنہائی میں لے گئے اور گفتگو شروع کی۔

انھوں نے کہا، ''سندھو! سچائی ہم دونوں ہی جانتے ہیں۔ کریڈٹ تمھارا تھا۔ حالانکہ ''سیبر'' پر اس نے بھی فائرنگ کی تھی اور بہت ہی اچوک فائرنگ۔ مگر تم سمجھ رہے ہو کیا ہو چکا ہے؟''

سندھو خاموش رہا، چہرے پر مایوسی تھی۔ بھرت سنگھ پھر بولے، ''وہ تم سے پہلے واپس بھی پہنچا۔ اس نے وہی کہا جو اس کے دماغ میں سب سے اوپر تھا۔ اس کا فائرنگ کرنا اور ''سیبر'' کا آگ کے گولے میں تبدیل ہونا، اس کے شعور میں اس وقت جوش کی وجہ سے اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ تم سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہنے کی کوشش کر رہا ہوں؟''

''جی ہاں، سر! پھر بھی......'' سندھو بے من سے اتنا ہی کہہ سکا۔

''اب سنو، غلطیاں کیسے بڑھتی گئیں،'' بھرت سنگھ نے آگے کہا۔ ''پچھلے دنوں کی ناکامیوں کے بعد ایئر فورس کیا سارا دیش کسی بڑی کامیابی، کسی بڑے کارنامے کی امید میں پریشان تھا۔ پہلے ''سیبر'' کو گرانا ہی وہ کارنامہ تھا جو کامیابی کی علامت بن گیا۔ یہ کارنامہ کس نے انجام دیا، ملک کے سامنے بہت ہی خصوصیت کا مدعا یہ کبھی نہیں ہوتا۔ حکومت کو، عوام کو ایک نام چاہیے، ایک چہرہ چاہیے بس وہ نام وہ چہرہ ہندوستانی ہونا چاہیے۔ انھیں تو سب سے پہلے کامیابی چاہیے۔ اس لیے یہ خبر فوراً ملک کے سامنے پیش ہونی تھی۔ اسی جلد بازی میں یہ غلطی ہوگئی۔''

''تو میرا کیا؟ مجھے کیا حاصل ہوا؟'' سندھو نے تکلیف کے ساتھ کہا۔

''اب کسی دصولیابی کی نہیں سوچ سکتے تم۔ ایک طرح سے جیسے تم کل تھے، ویسے آج ہو۔ ہمارے لیے تم ویسے ہی ماہر اور بہادر پائلٹ ہو۔ ایک ''ایس پائلٹ''۔ بھرت سنگھ ہوشیاری سے بولے۔ ''صحیح یا غلط، ایک نام اس کارنامے سے جڑ چکا ہے۔ ساری دنیا اس نام سے واقف ہو چکی ہے۔ جو اعلان اتنے بینڈ باجوں سے کیا جا چکا ہے اس کو نہ تو ایئر فورس واپس لے سکتی ہے اور نہ ہی حکومت۔''

''تو اس کا مطلب، جو اعزاز مجھے ملنا چاہیے تھا وہ کوئی اور مار لے جائے؟''

بھرت سنگھ نے سندھو کی فراخدلی کو ٹٹولا، اس سے سیدھی مانگ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ''ہاں افسوس مجھے بھی بہت ہے، مگر اپنی فوج اور اپنے ملک کی بھلائی کے لیے اس معاملے کو یہیں دبانا ہوگا۔ میں تم سے ایک بات کہوں گا۔ تم نے زندگی میں کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ ضرور کھویا ہوگا۔ بس ایک چیز ملک کے فائدے کے لیے اور کھو جانے دو۔ لڑائی کی شروعات ہے، تم جیسا جانباز فوجی ایک نہیں بہت سی کامیابیاں حاصل کرے گا۔ دیکھتے تو جاؤ کہ تم کہاں پہنچتے ہو۔''

وہی بات بار بار.......... ہر بار سندھو نے خون کے آنسو پیے اور دیش کے فائدے کے لیے خاموش رہنے کی بات مان لی۔ اس کے بعد اس نے کبھی بھی اس مسئلے پر اپنی زبان نہیں کھولی۔ مگر ساری ایئر فورس میں یہ تذکرے کا موضوع بن چکا تھا۔ ہر طرف سندھو کی واہ واہی ہو رہی تھی۔ اس طرح سندھو نے اعزاز کے طور پر جو بھی کھویا تھا اس سے کہیں زیادہ عزت و احترام کے طور پر حاصل کر لیا تھا۔

دور .... سرسا کے اس انجانے گاؤں میں سندھو کے والد جنگ شروع ہونے کی خبر ریڈیو پر سن چکے تھے۔ انھوں نے پہلے سوچا کہ فوراً چلیں اور بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر ''واہے گرو'' سے اس کی سلامتی کی دعائیں مانگیں، مگر یہ سوچ کر رک گئے کہ شاید وہ امبالا میں نہ ہو۔ اس کے بعد تو سردار جی چوبیس گھنٹے ٹرانسسٹر سے ہی کان لگائے شہید ہونے یا بہادری کے لیے میڈل پانے والوں کے نام غور سے سنتے رہتے تھے۔ ان کے دل میں ایک اَن کہی امید تھی، ایک شدید چاہ تھی، بہادروں کی فہرست میں اپنے بیٹے کا نام بھی سننے کی۔

شام کو اکثر وہ سنتا سنگھ کے دروازے پر بیٹھنے چلے جاتے تھے۔ عموماً گاؤں کے سبھی سربرآوردہ لوگ شام کو وہیں اکٹھا ہوتے تھے۔ گپ شپ، ہنسی مذاق اور فصلوں کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کے علاوہ دورانِ جنگ لڑائی کی خبروں سے متعلق بحث و مباحثے بھی یہیں ہوتے تھے۔

ایک شام اچانک بنتا سنگھ نے پوچھا، ''بھائی آپ کا بیٹا اس وقت کہاں ہے؟''

''کہاں ہے؟ ارے فرنٹ پر ہے۔ لڑائی میں شامل ہے اور کہاں ہوگا،'' سندھو کے پتا جی نے کچھ جھلّا کر جواب دیا۔ ''مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں،'' بنتا بولے۔ ''ایسے ہی میں سوچ رہا تھا کہ کہیں ریزرو ڈیوٹی پر پیچھے کے

علاقوں میں تو نہیں ہے؟''

سینیئر سندھو کو طنز کے یہ تیر گھائل تو کر گئے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ سندھو خاندان کا افتخار جائز تھا۔ ان کا ایک بیٹا سینیئر افسر کے درجے میں تھا، گاؤں کے دوسرے خاندانوں میں کوئی سپاہی کے درجے سے آگے نہیں نکل سکا تھا۔ حسد اور جلن کی وجہ سے بنتا جیسے کچھ لوگ بڑے سندھو کی کھنچائی کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ جب بھی آمنا سامنا ہوتا کوئی نہ کوئی ضرور پوچھ لیتا جی، آپ کے بیٹے کا نام ریڈیو پر آیا؟

بار بار یہی ایک سوال۔ آخر ایک دن بنتا سنگھ تو حد ہی کر دی، کہنے لگا، ''اجی ان سے کیا پوچھ رہے ہو؟ نام تو ان کے آتے ہیں ریڈیو پر جو کوئی خاص بہادری دکھائیں یا وطن پر جان نچھاور کر دیں۔ ان کے نام کیسے آئیں گے جو چھپ کر کہیں پیچھے بیٹھے ہوں؟''

بڑے سندھو تلملا اٹھے، پھر بھی خود پر قابو رکھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ گئے گھر پہنچ کر گھر والی سے کچھ بات چیت کی، صندوق سے کچھ روپے پیسے نکالے، چھڑی اٹھائی اور بس اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ رات بھر بسیں بدل بدل کر قسطوں میں سفر کرتے رہے۔ آخر بھور ہوتے ہوتے پٹھان کوٹ ہوائی اڈے کے گارڈ روم کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

''بابا کیا چاہیے آپ کو؟ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟'' ایئرفورس پولیس کے سپاہی نے پوچھا۔ ''میں جی اپنے پُتّر سے ملنے آیا ہوں۔ وہ دو چار دن پہلے امبالا سے ادھر آیا ہے،'' بڑے سندھو نے سپاہی کو بتایا۔

''لڑکے کا نام تو بتائیے؟''

''جی، امر جیت، امر جیت سنگھ سندھو............ نیٹ پائلٹ ہے۔ امبالے سے آیا ہے۔''

''ٹھیک ہے بابا ٹھیک ہے لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ لڑائی چل رہی ہے، وہ اس وقت اڑان پر ہیں۔ پاکستانیوں کو مارنے گئے ہیں کوئی ٹھیک نہیں کب آئیں اور پھر کب چل دیں۔ اگر کوئی خاص کام ہو تو مجھے بتا دیں، میں انھیں بتا دوں گا۔''

''دیکھ بھائی میں اپنے بیٹے سے ملنے آیا ہوں، بات کر کے ہی جاؤں گا۔ وہ کام میں لگا ہے تو کوئی بات نہیں ہے میں یہیں انتظار کر لوں گا ــــ جب موقع ہو دو منٹ کے لیے بلا دینا۔''

پولس والے نے اندر جا کر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ معاملہ ایک سینئر افسر کے پتا کا تھا، اس لیے فوراً یونٹ کو اطلاع دی گئی۔ سندھو نے سنا تو بوکھلا گئے، بولے "کیا؟ پتا جی؟ کیوں آ گئے؟" وہ ابھی فلائنگ سے لوٹا تھا اور دوبارہ پھر جانے کی تیاری تھی۔ ایسے مصروف وقت میں اسے گھر خاندان کی "کچ کچ" بالکل پسند نہیں تھی۔

"ارے اتنی دور سے آئے ہیں کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی ہی۔ آپ جا کر مل آئیے ہم لوگ تو یہاں ہیں ہی،" ایک دوسرے افسر نے سمجھایا۔

کچھ منھ بناتے ہوئے سندھو وہاں سے چلے۔ گارڈ روم پہنچ کر باپ بیٹے کا سامنا ہوا۔ باقاعدہ سلام دعا ہوئی۔ اپنے بیٹے کے موڈ کا اندازہ لگاتے ہوئے پتا جی نے فوراً بات شروع کر دی، "پتر میں ریڈیو پر لڑائی کی خبریں سنتا رہتا ہوں۔ میں بس دیکھنے آیا ہوں کہ تو لڑائی میں شامل تو ہے نا؟ تو مورچے پر تو ہے؟

"جی میں اور کس لیے اس بارڈر سے لگے ہوئی اڈے پر بھیجا گیا ہوں؟ بس آپ صرف یہی جاننے کے لیے اتنی دور آ گئے؟" سندھو نے کچھ جھلاّہٹ کے ساتھ ذرا اونچی آواز میں کہا۔ گارڈ روم اور آس پاس کھڑے ایئر مین اور دوسرے ملازمین ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور بڑے غور سے ان کی باتیں سننے لگے۔

"ہاں میں یہی پتہ لگانے آیا ہوں کہ تو واقعی لڑائی میں شامل تو ہے۔ ایک بات اور ہے۔ کیا؟" بھلا اس وقت کون سی ضروری بات ہو سکتی ہے۔ سندھو سوچنے لگا۔

"دیکھ بیٹا، گاؤں میں سب لوگ ریڈیو بہت ہی دھیان سے سنتے ہیں۔ ویر چکر شکر جیتنے والوں کے نام اور بھی دھیان اور عزت سے سنتے ہیں۔"

"تو؟"

"میں بھی سنتا ہوں، اس امید میں کہ کبھی کسی اپنے کا نام بھی ریڈیو پر آوے۔"

"آپ کتنوں کو جانتے ہیں؟ کس کا نام سننا چاہتے ہیں؟" سندھو نے پوچھا۔ مگر اب واضح ہو چکا تھا کہ اس کے پتا کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔

"بیٹا، گاؤں والے تو صرف تجھے ہی جانتے ہیں۔ شہیدوں اور بہادروں کے نام غور سے

سنتے ہیں۔ شاید کبھی تیرا نام بھی.........." بڑے سندھو جذباتی ہو چلے تھے۔ ایک باپ کی گہری امید، اپنے بیٹے کو افتخار حاصل کرتے دیکھنا، اس کے ذریعے سے سماج میں احترام و تعظیم پانے کی تمنا فطری ہی تو تھی۔ لیکن اس وقت ان کا یہ بیان سندھو کے کلیجے تک کو زخمی کر گیا۔ وہ بے چارہ اپنا کام تو کر ہی چکا تھا، یہ اور بات کہ اس کے حصے کے امتیازات اور اس کی نیک نامی پر کوئی اور قابض ہو چکا تھا اور جو فخر، جو ناز اس کے بوڑھے باپ کے چہرے پر اس وقت ہونا چاہیے تھا آج وہ کسی دوسرے کے باپ کا چہرہ روشن کر رہا تھا۔ اس کا تو جی دل اپنے باپ کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا، لیکن ایک غیر واضح اور دھندلی سی ملک کی عزت کی آرزو اور وطن کی بھلائی کے تصور نے اسے چپ رہنے پر مجبور کر دیا۔

سندھو نے دل مضبوط کیا اور بولا۔ "دیکھیے یہ تمغہ وغیرہ ایسا تو ہے نہیں کہ میں کہیں سے جا کر اٹھا لاؤں، میں کوشش ہی کر سکتا ہوں اور وہ میں کر رہا ہوں۔"

"بیٹا! تجھے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ نتھا سنگھ وغیرہ طعنے مارتے ہیں، کہتے ہیں تو کہیں چھپا بیٹھا ہوگا اسی لیے تیرا نام ریڈیو پر نہیں آ رہا ہے۔"

"نتھا سنگھ جیسے لوگوں کی پرواہ مت کیجیے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں میں کیا کر رہا ہوں۔ جائیے، گھر جائیے اور دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔"

"بس یہی تو بات ہے بیٹا۔ میں اب گاؤں نہیں جا سکتا۔ وہاں پھر لوگ پوچھیں گے، ریڈیو پر نام تو نہیں آیا؟ کیا کر رہا ہے سندھو؟"

"آپ ایسی بکواس پر دھیان ہی کیوں دیتے ہیں؟ اور اس کے لیے مجھے اتنی دور پریشان کرنے آ گئے؟ گھر جائیے میں لڑائی کے بعد آپ سے ملنے آؤں گا۔"

بڑے سندھو کے چہرے پر کچھ دکھ اور نا امیدی کے ملے جلے اثرات کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ سدھی ہوئی آواز اور واضح لفظوں میں وہ بولے، "گاؤں والے تو جو کہتے ہیں کہتے ہی ہیں۔ لیکن میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ آخر ملک اپنے سپاہی سے دو ہی چیزوں کی امید رکھتا ہے۔ ایک تو بہادری کے ساتھ کوئی بڑی جیت حاصل کرنا دوسرے ضرورت پڑے تو وطن کے نام پر شہید ہو جانا۔ گاؤں والے ایک دم غلط تو نہیں سوچتے۔"

سندھو ہکا بکا رہ گیا۔ کچھ بول نہیں سکا۔ صرف ایک تصویر اس کی آنکھوں میں تھی اس کے

باپ کی نہیں بلکہ گرو گووند سنگھ کی جب جنگ میں انھوں نے اپنے بیٹوں کو قربان ہو جانے کے لیے للکارا تھا۔

بے پناہ شفقت اور محبتوں سے تھوڑی لڑکھڑاتی آواز میں جیسے سینے پر پتھر رکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ بڑے سندھو بولے۔ ''بیٹا! میں گاؤں میں چھاتی چوڑی کر کے نکلنا چاہتا ہوں.........تو بہادری کا تمغہ حاصل کر لے..........بس سمجھ لے میرا جیون مکمل ہو جائے گا۔''

پھر رک کر بولے، ''ویسے اگر یہ نہ ہو سکے تو بیٹا یاد رکھنا۔ شہیدوں کے ماں باپ اور زیادہ چھاتی چوڑی کر کے گھر سے نکلتے ہیں۔ واہے گرو تجھے ہمت دیں۔''

آنسوؤں سے بھری آنکھیں، چھڑی کے اوپر تھوڑا سا کانپتا ہوا ہاتھ، اور دوسرا ہاتھ بیٹے کے سر پر رکھتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے پیروں سے، بغیر کچھ کہے ہوئے بڑے سندھو رخصت ہوئے۔ گارڈ روم کے باہر نکل کر وہ سڑک پر پہنچ گئے۔ سندھو مبہوت کھڑا رہا۔ باپ بیٹے کی بات چیت کا ایک ایک لفظ سبھی نے دھیان سے سنا تھا۔ ان کی جملوں سے جذباتی ہوئے سبھی لوگ متحیر کھڑے تھے۔ یکا یک ہوش آنے پر کئی لوگ بزرگوار کے پیچھے دوڑے۔ انھیں احترام کے ساتھ بس اسٹیشن لے جایا گیا۔ بس میں اچھی سی جگہ بیٹھا کر انھیں کچھ پھل اور مٹھائیاں بھی تحفتاً پیش کی گئیں، اور آخر میں ان کے پیر چھو چھو کر سبھی آشیرواد کے ساتھ واپس ہوئے۔ سبھی یہ سوچ رہے تھے کہ ایسے بہادر اور وطن پرور باپ بیٹے اب دوبارہ دیکھ پانا ناممکن ہے۔ ایک باپ نے زندگی میں اپنے بیٹے سے مانگا بھی تو کیا مانگا۔ جنگ میں بے پناہ بہادری اور زبردست قربانی۔ چاہے یہ چاہے وہ۔ ایک ایسی بھینٹ جس کا تذکرہ پشت در پشت چلتا رہے۔

سندھو یونٹ کے آپریشن روم لوٹ گئے۔ کافی دیر سنجیدہ حالت میں بیٹھے رہے۔ جب اگلے حملے کے لیے انھوں پکارا گیا تو اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور مضبوط ارادوں کے ساتھ اپنے جہاز کی طرف چل دیے۔ اس وقت ان کی فلائنگ میں ایک عجیب سا جوش تھا۔ خطروں کی کوئی پرواہ ہی نہیں تھی، سندھو اب زیادہ سے زیادہ حملوں میں حصہ لیتے اور دشمن کے علاقوں میں کافی کافی اندر تک گھس کے وار کرتے تھے۔

ایک روز ہی ''سیبر'' جہازوں کا جھنڈ، اتفاق سے سندھو اکیلے۔ مڈبھیڑ شروع ہوئی، ایک کو...

گرایا، دوسرے کو اچھا خاصہ نقصان پہنچایا۔ پیٹرول ناکافی تھا اس لیے واپس ہو لینے میں بھلائی سمجھی۔

سندھو کو ''ویر چکر'' حاصل ہوا۔ والد محترم نے ریڈیو پر سنا۔ سب گاؤں والوں کو پتہ چل گیا۔ بڑے سندھو گاؤں لوٹے، تو سب سے پہلے نتھا سنگھ نے بڑے ہی احترام کے ساتھ سینے سے لگا کر ان کا خیر مقدم کیا۔

دو روز بعد سندھو، ایک دوسرے حملے پر تھے۔ ان کے جہاز میں کافی گولیاں لگ چکی تھیں، لیکن مقابلہ آرائی کی دھن میں سندھو کو فائدے اور نقصان کا ہوش ہی کہاں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا جہاز فضا میں ہی کسی بم کی طرح پھٹ گیا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں سندھو اور ان کا جہاز دونوں ہی زمین تک آئے اور مٹی کے حوالے ہو گئے۔ سندھو شہید ہو چکے تھے۔

پھر وہی برّاق سفید قمیص اور سفید لنگی۔ بزرگوار گاؤں کے درمیان سے جا رہے تھے۔ آنکھیں نم، پاؤں لڑکھڑاتے ہوئے، چھڑی پر ٹکا ہاتھ کچھ کانپتا ہوا سا، مگر سر اونچا، چھاتی چوڑی، چہرے پر تفکر اور افتخار کا ملا جلا عکس۔ ایک تحیر ایک استعجاب...... واہے گرو کی مرضی............ اس کی کرنی کا راز............ وہی جانے...... وہی سمجھے۔

بڑے سندھو اپنی بہو اور بچوں کو لانے جا رہے تھے۔

...... اور سارا گاؤں انھیں بس پر بیٹھانے جا رہا تھا۔

—

باب بارہ

وہ وقت ہی خراب تھا

مئی 1972 میں ہندوستان پاکستان جنگ کے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ پاکستانی حکومت میں ذوالفقار علی بھٹو پوری طرح جم چکے تھے۔ لیکن ملک کے بٹوارے کی وجوہات پر ہر طرف تجزیاتی بحث چل رہی تھی۔ ایسی حالت میں پاکستانی افسر ہندوستانی قیدیوں سے ملنے کچھ زیادہ ہی آنے لگے۔ ان کے ساتھ اکثر کچھ عام لوگ اور دانشور بھی چلے آتے تھے بڑے سکون کے ساتھ۔ حال میں ہوئی لڑائی کا تذکرہ ہوتا تھا، لڑائی کی وجوہات پر دونوں ممالک کی سیاست اور سیاسی رہنماؤں پر، ملک کے بٹوارے اور اس کے بعد کے اہم مسائل اور سب سے بڑھ کر ہندوؤں و مسلمانوں کے بیچ گہری کھائی پر۔ لگتا تھا جیسے گزرے برس کے حادثوں نے پاکستان کی چولیں ہلا دی ہوں۔ لوگ ماضی میں اپنے رہنماؤں کے ذریعے کیے گئے فیصلوں کی پھر سے تشریح کر رہے تھے جیسے ان کے جواز پر دوبارہ نظر ڈال کر اپنے آپ کو پھر سے مطمئن کرنے کی کوشش میں لگے ہوں۔

کبھی خاموشی سے دونوں طرف کے خیالات سنا کرتا تھا، وہ مصیبت کے وقت حالات سے جوجھنے میں بھروسا رکھتا تھا۔ کہتا تھا کہ گڑے مردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایک بار ایسی ہی لمبی بحث سننے کے بعد وہ بولا، ”یہ لوگ ملک کے بٹوارے اور اس وقت کے دنگوں میں آج بھی پھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پچیس برس گذر چکے ہیں، آج کے مسائل پر ان کی نگاہ

کیوں نہیں جاتی؟''

''مجھے تو یہ سب کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہیں،'' پری سے بڑی ہی غیر معمولی شفافیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔'' بٹوارے کی مانگ تو انھوں نے ہی کی تھی۔ شاید ان کو لگتا تھا کہ اسلام انھیں ایک ساتھ باندھ کر رکھ سکے گا۔ ہر میدان میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھریں گے اور ہم سے کہیں طاقتور بن جائیں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہو پایا بلکہ سب کچھ تتر بتر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔''

''مگر اس کے لیے الزام ہم پر کیوں؟'' ملند نے پوچھا۔'' اگر آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ ہر پریشانی، ہر مصیبت کے پیچھے انھیں صرف بھارت ہی دکھائی دیتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہم اپنے بہت سے مسائل حل نہیں کر پائے ہیں مگر ان سے تو بہتر ہی ہیں۔ بنگلہ دیش انھوں نے اپنے ہاتھوں سے ہی بنایا۔ مگر انھیں کیا معلوم کہ ہم خود ہی اپنی مصیبتوں سے پوری طرح نہیں ابھر پائے ہیں تو ان کے لیے کیا مسائل کھڑے کریں گے۔'' ملند اپنی بات پر خود ہی زور سے ہنسا۔

اتنے میں باہر کچھ لوگوں کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ پولس کارپورل تین لوگوں کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ تینوں سول کپڑوں میں تھے۔ سب سے آگے والے نے کہا ''گڈ مارننگ'' — میں ہوں اشرف، ونگ کمانڈر اشرف۔ دوسرے دونوں ساتھیوں'' جس میں ایک دبلا پتلا لمبا اور دوسرا کافی چھوٹا اور دبلا تھا'' اپنے نام نہیں بتائے صرف ہاتھ اوپر اٹھا کر خیر مقدم کرلیا۔ چال ڈھال سے غالباً وہ فوجی نہیں تھے۔

ہندوستانی افسر اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ سب نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ گارڈ تین عدد کرسیاں لے آیا۔ ہندوستانیوں نے پہلے مہمانوں کو احترام سے بیٹھایا پھر خود بیٹھے۔ چہروں پر تبسم اور ہلکی پھلکی مٹھاس بھری باتوں سے ماحول خاصا خوش مزاج تھا۔ ایک دلچسپ صبح ایک اچھی بات چیت، کچھ کھینچا تانی، کچھ طعنہ زنی، کچھ پُر مذاق لطیفے، اسی امید میں خوبصورت سی محفل جم گئی۔

''کیا آپ لوگ بھی پائلٹ ہیں؟'' ملند نے گفتگو شروع کرنے کے لیے پوچھا۔

''نہیں،'' اشرف نے کہا۔ میں تو ایجوکیشن برانچ میں ہوں اور یہ دونوں دوسرے شعبوں میں ہیں۔''

''واہ، دانشور اور ذہین لوگ......'' گیری نے ہنس کر کہا۔

ایئر فورس میں پائلٹس چھوٹی عمر میں ہی بھرتی کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کالج کی تعلیم حاصل کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ انجینئرنگ یا دوسرے شعبوں میں کافی پڑھے لکھے لوگ ہی داخلہ پاتے ہیں ان کی نگاہ میں پائلٹس دماغ سے تھوڑے ہلکے اور موج مستی میں کافی تیز ہوتے ہیں دانش وروں اور ایسے مست مولی قسم کے لوگوں کے درمیان ہنسی مذاق تو چلتا ہی رہتا ہے۔

''دانشمندی کا کیا کریں،'' اشرف نے کہا۔ ''آپ پائلٹس کو کچھ سکھانا یا پڑھانا تو ٹیڑھی کھیر ہی ہوتا ہے۔''

آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب اتر پردیش کے ہیں؟ اشرف نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں وکرم صاحب وہیں کے ہیں،'' منوہر نے کہا۔

''ویسے ہوں تو میں بھی وہیں کا،'' گیری بولا۔ ''حالانکہ یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔''

گیری نے یہ بات مذاقاً اپنی برادری کے ان پنجابی پناہ گزینوں کے بارے میں کہی تھی جو اتر پردیش میں بس گئے تھے۔ اس کی نگاہ میں یو پی کے بھیّے کام چور، کاہل، سست اور وقت برباد کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہاں کھیتی میں ضرور ان سے کام چلایا جا سکتا ہے بشرطیکہ تھوڑی سی افیون چٹا دی جائے اور کھیتوں کی جُتائی کے لیے ٹریکٹر کے ساتھ بھیج دیا جائے۔ پھر کیا ہے جب تک نشہ ہے تب تک کام۔

''دیکھیے بھئی یو پی کی برائی تو میں نہ سن پاؤں گا۔ آخر میں بھی وہیں کا ہوں،'' اشرف نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور میں بھی،'' چھوٹے میاں بھی گویا ہوئے۔ ''میرا خاندان بریلی میں تھا۔ اشرف صاحب مراد آباد کے ہیں۔'' پھر گیری کی طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔ کیا آپ آزادی کے بعد وہاں بسے تھے؟''

''جی ہاں! میرا خاندان امرتسر، لاہور اور راولپنڈی میں پھیلا ہوا تھا اور اب ہم مراد آباد کے پاس ہی رام پور میں بس گئے تھے۔''

''آپ کو ہندوستان میں گزارے ہوئے روز و شب یاد آتے ہیں؟ اور یہاں کیسا لگتا

ہے؟" منوہر نے اشرف سے پوچھا۔

"یاد تو آتے ہی ہیں اور آتے بھی رہیں گے......" اشرف کی آواز میں چوٹ اور تکلیف دونوں کی جھلک تھی۔

"یہاں آتے ہوئے راستے میں اشرف صاحب کے گھر کے تین لوگ مار دیے گئے۔" چھوٹے میاں نے سمجھاتے ہوئے بتایا۔ "میرے گھر کے بھی کئی لوگ یہاں تک نہیں پہنچ سکے۔ میں تو اس وقت کافی چھوٹا تھا۔"

"مجھے بڑا افسوس ہوا یہ سن کر،" برٹی بولے۔ "ویسے بھی ہم لوگ دکنی ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے رہنے والے ہیں اور زیادہ تر اتری حصے میں ہوئی اتھل پتھل سے لاعلم ہی رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے بہت تکلیفیں جھیلی ہیں۔"

پچھلی باتیں یاد کر کے اشرف کافی تلملا سے گئے اور بولے، "جناب! وہ بڑے خوفناک دن تھے۔ سارے راستے میں ہر طرف ایک عجیب سا جنون، خون خرابہ، لاشیں، عورتوں اور بچوں کی چیخ پکار خاص طور سے سرہند سے باگھا تک۔ جب یہاں پہنچے تب جا کر راحت کی سانس لی۔ ہندوستان میں وہ آخری سات دن دوزخ سے بھی بدتر تھے۔"

چھوٹے میاں نے بقیہ داستان آگے بڑھاتے ہوئے بولنا شروع کیا، "سب سے زیادہ تباہی پنجاب میں سکھوں نے مچائی تھی۔ پاکستان آتی ہوئی کوئی بھی ٹرین محفوظ نہیں رہی۔ جگہ جگہ گاڑیاں روک کر قتلِ عام کیا گیا۔ نہ بچے دیکھے اور نہ بڑے بوڑھے۔ ہاں نوعمر لڑکیاں ماری نہیں گئیں بلکہ انھیں اغوا کیا گیا۔"

"مجھے تو صرف لوٹ پاٹ اور خون خرابہ ہی یاد ہے،" اشرف بولے۔ "اور آپ نے جو پوچھا کہ ادھر کیسا لگتا ہے؟ تو بتاتا ہوں کہ ہم کن حالات میں یہاں پہنچے۔ لٹے پٹے، زخمی، خالی ہاتھ خالی جیب، بس جسم پر ایک جوڑا کٹا پھٹا لباس۔ اور اب؟ اس ملک نے ہمیں کیا نہیں دیا، ایک نوکری، گھر، کار اور سب سے بڑھ کر پوری حفاظت۔ اب یہ ہمارا ملک ہے۔ ہمارا سب کچھ۔"

کیمی نے کچھ بھڑکتے ہوئے کہا۔ "مگر آپ سے پاکستان بھاگنے کے لیے کس نے کہا تھا؟ آپ نے مرادآباد کا گھر بار چھوڑا ہی کیوں؟"

”ہر طرف ہندوؤں سے گھرے ہوئے ہم لوگ وہاں کیسے رہ سکتے تھے،“ چھوٹے میاں بولے۔”روز پٹنے اور مرنے سے بہتر تھا کہ ایک بار خطرہ اٹھالیا جائے۔“

”اور جو چاچا، بابا، بھائی، بھتیجے ناطے دار، رشتے دار آپ پیچھے چھوڑ آئے۔ان کا کیا ہوا؟“ کیمی اپنی بات پر اڑے رہے۔” آپ کو کچھ معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے ہندوستان میں وہ لوگ کیسے ہیں؟اوران کا کیا حال ہوا؟“

”بے شک وہ بڑے خراب حالات میں جی رہے ہیں۔ نہ نوکری ملتی ہے نہ کھانے کو دو وقت کی روٹی ہے۔سنا ہے کہ عورتوں کو بندی لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے،“ چھوٹے میاں نے کہا۔

”یہ بکواس ہے،“ کیمی بولے۔” اپنے مولویوں اور نیتاؤں جیسی الٹی سیدھی باتیں مت کیجیے۔ایسی باتوں سے بہت خون خرابہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔اصلیت جانیے اور اعداد وشمار دیکھیے۔ بٹوارے کے وقت پاکستان میں بیس فی صد غیر مسلم تھے۔جن میں زیادہ تر ہندو ہی تھے۔اور آج؟ آج یہ تعداد گھٹ کر چھ فیصدی سے کم ہوگئی ہے اور ہندوستان میں؟ جناب ہندوستان میں اس وقت دس فیصدی مسلمان تھے جو آج بڑھ کر بارہ فیصدی ہو چکے تھے۔کون بہتر ہے؟ اور کہاں بہتر ہے؟ پاکستان میں ہندو یا ہندوستان میں مسلمان؟“

وکرم نے ہکا بکا ہو کر کیمی کی طرف دیکھا۔کیمی نے کیا اعداد وشمار پیش کیے تھے۔ یہ اعداد و شمار کتنے صحیح یا غلط ہیں یہ تو وہ نہیں جانتا۔لیکن پاکستانیوں کی نیم پختہ شکایتوں کے منہ پر لگام لگانے میں تو کامیاب تھے ہی۔

” آپ نے بتایا کہ آپ لوگ پھٹے کپڑوں میں یہاں پہنچے تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہاں سے نکالے گئے ہندو اور سکھ کس حالت میں ہندوستان پہنچے ہوں گے؟ سوٹ اور ٹائی میں؟“ سنتا نے کہا۔ جب سنتا کا خاندان مغربی پاکستان سے بھاگا تھا تو سنتا کی عمر ضرور کم تھی لیکن اسے چاروں طرف پھیلی ہوئی بربادیاں کافی کچھ آج بھی یاد ہیں۔

وکرم کو لگا کہ گفتگو اس سمت میں جارہی تھی جہاں سب کی ناپسندیدہ یادیں ابھی بھی تر وتازہ تھیں۔ بٹوارے کو پچیس برس بیت چکے تھے۔لیکن دونوں طرف کے لوگوں کو یہی لگتا ہے کہ جیسے کل ہی یا پچھلے ہفتے یا پچھلے برس ہی ایک ساتھ رہنے والے الگ الگ خیموں میں بٹے ہوں۔ جو

مسلمان ہندوستان چھوڑ کر پاکستان گئے انھیں لگتا ہے کہ ہندوؤں نے انھیں زبردستی بھگایا ہے دوسری طرف ہندوستان کے ہندوؤں کا زبردست عقیدہ تھا کہ مٹھی بھر مسلم رہنماؤں نے غیر منقسم ہندوستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ بگڑی ہوئی اولادوں کی طرح باپ دادا سے وراثت میں ملی جائداد کا بٹوارہ کیا اور حصہ بھی لے لیا۔ مگر اس بحث کو یہیں روکنا ضروری تھا۔

''دیکھیے۔ ملک کے بٹوارے میں ایک کروڑ سے زیادہ لوگ اجڑ گئے۔ بے گھر اور بے زمین بھی ہوئے اتنا ہی نہیں بلکہ دوسری طرف بھاگنے پر مجبور بھی ہو گئے۔ ان حادثوں نے بہت سے دلوں پر نہایت ہی دردناک اثر چھوڑا جیسے اشرف صاحب اور ہماری طرف ستونت سنگھ۔ مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ سارے دکھ درد ایک ہی طرف کے لوگوں نے جھیلے۔ یا تمام مظالم کسی ایک طرف ہی برپا ہوئے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس وقت کے سارے رہنما پاگل ہو گئے تھے۔ انھوں نے فرقہ واریت کی ایسی آگ لگائی جو آج تک نہ بجھ سکی، اسی کا نتیجہ ہیں ہماری آپ کی تین جنگیں اور اسی وجہ سے ہم آج آپ کی قید میں بیٹھے ہیں۔''

اشرف اور ان کے ساتھی وکرم کی دلیلوں کے بارے میں کچھ سوچ رہے تھے کہ اتنے میں ہیری نے ''کے ٹو'' سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور مہمانوں کو پیش کیا۔ یہ پاکستان کی سب سے تیز اور سب سے سستی سگریٹ تھی جو قیدی اپنے بھتّے سے خرید پاتے تھے۔ پاکستانیوں نے تپاک سے ولایت میں بنی سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ہندوستانی قیدیوں کو پیش کیا۔ ہیری کو تو مزہ ہی آ گیا۔

''اصل میں ہمارے پُرکھوں کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہندو اکثریت کے درمیان ہم عزت کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ ہم بالکل دب جاتے۔ ہماری تہذیب ہمارا رہن سہن یہاں تک کہ ہمارا مذہب بھی خطرے میں پڑ جاتا،'' چھوٹے میاں نے اپنی بات پیش کی۔

اس بار منوہر نے کمان سنبھالی، ''دیکھیے ہماری پارلیمنٹ میں پچاس مسلم ممبران ہیں۔ آپ نے ہمارے صدر مملکت عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ تمام صوبوں میں مسلم منسٹرس بھرے پڑے ہیں۔ برگیڈیر عثمان اور بہادر عبدالحمید کو ہمارے ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ملک میں برابر کے حصے دار نہیں بلکہ دوسروں کی طرح پھل پھول بھی رہے ہیں۔ آپ کے پاکستان کی طرح نہیں جہاں صرف پنجابی سُنّی ہی حکومت

کر سکتا ہے، باقی سب کے سب ان کے پیروں تلے......"

"تو ہم سے اتنی نفرت کیوں اور ہمارے ساتھ اتنا تشدد کیسے ہوا؟" چھوٹے میاں نے پوچھا۔

سنتا نے ہلکے سے گلا صاف کیا اور آگے کہا، "میرا خاندان یہیں راولپنڈی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ میں تو بہت چھوٹا تھا اور اس وقت یہاں تھا بھی نہیں۔ لیکن وہ لوگ بھی بہت شدید قسم کی نفرت اور تشدد کا شکار ہوئے تھے۔ اتنے کہ سبھی کو ایک طرح سے خودکشی ہی کرنی پڑ گئی تھی۔"

"کیسی خودکشی؟" چھوٹے میاں نے پوچھا۔

"میرے گھر کے بچے بوڑھے مرد عورت لڑکے لڑکیاں ملا کر تقریباً تیس لوگ یہاں موجود تھے۔ یکا یک مسلمانوں نے گھر گھیر لیا۔ موت سامنے تھی۔ گھر کی عورتوں نے مردوں سے ضد کی کہ وہ خود ہی انھیں موت کے گھاٹ اتار دیں۔ وہ زندہ دشمنوں کے ہاتھ پڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ ان کی آبرو کے ساتھ کھلواڑ ہوگا۔ وہ ہوس اور زنا بالجبر کی شکار ہوں گی جسے وہ موت سے بدتر سمجھتی تھیں۔ رو رو کر انھوں نے گھر والوں سے ضد کی کہ انھیں فوراً موت کے حوالے کر دیا جائے۔ کلیجے پر پتھر رکھ کر ایک ایک آدمی نے تلوار اٹھائی اور اپنی ہی ماؤں بیویوں، بہوؤں اور بیٹیوں کو زندگی سے آزاد کر دیا۔ اس کے بعد خود باہر نکلے اور شدت پسندوں سے لڑتے لڑتے اپنی جانیں گنوا دیں۔ صرف ایک پانچ سال کا لڑکا بچ گیا تھا۔ جو بڑا ہو کر اب دتی میں رہتا ہے۔ اپنی تمام خوفناک یادوں کے ساتھ۔" سنتا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس زمانے کا ظلم و جبر یاد کر کے اس وقت بھی اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

"اس طرح کے واقعات میں نے سنے ضرور تھے لیکن ایسی دردناک آپ بیتی پہلی بار سن رہا ہوں،" اشرف نے کہا۔ "ہماری بہو بیٹیاں بھی ہندو حملہ آوروں سے بے حد ڈرتی تھیں۔ گڑھ مکتیشور کے دنگوں میں تو میں نے خود عورتوں کے حالات بد سے بدتر ہوتے ہوئے دیکھے تھے کس طرح سے جوان بہو بیٹیوں کو جبراً کھینچ کھینچ کر لے جایا گیا اور جنھیں نہیں لے جایا جا سکا ان کے ساتھ وہیں بری طرح پیش آیا گیا۔ چھاتیاں کاٹی گئیں، رانوں کے درمیان تلواری گھسیڑی گئیں۔ ان کا چیخنا چلانا آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے اور میں کانپ اٹھتا ہوں۔ پتہ نہیں آج بھی

وہاں کتنی مسلم عورتیں ہیں اور خدا جانے کس حال میں ہیں۔‘‘

کیمی نے اپنا دماغ پھر ٹٹولا اور کچھ دوسرے اعداد و شمار تلاش کیے، ’’آپ لوگوں کو شاید یاد ہو کہ دونوں طرف کی گمشدہ عورتوں کو ڈھونڈنے کے لیے وائسرائے نے ایک کمیٹی بنائی تھی جو دونوں ممالک میں سرگرمِ عمل تھی۔ اس کمیٹی نے ہندوستان میں ایسی تقریباً پندرہ ہزار عورتیں تلاش کی تھیں اور ان میں سے ساڑھے بارہ ہزار عورتوں کو ان کے گھر والوں کے حوالے کر دیا گیا تھا، باقی کے بارے میں مجھے صحیح طور سے پتہ نہیں ہے۔ پاکستان میں ایسی غائب شدہ عورتوں کی تعداد صرف پندرہ سو بتائی گئی جن میں سے دو سو تو واپس کی گئیں باقی کے بارے میں یہ کہہ دیا گیا کہ انھوں نے اپنے نئے گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب آپ اس کا جو چاہیں مطلب نکالیں۔‘‘

کیمی کے علم اور اس کی یادداشت پر دکرم پھر متحیر ہوا تھا۔ اعداد و شمار صحیح ہوں یا غلط لیکن ان کا پیغام واضح تھا۔ حالانکہ وہ پاکستان ہو یا ہندوستان، عورتوں کا اغوا یا انھیں بھگا کر لے جانے کی یہاں پرانی روایت رہی ہے۔ ایک طرح سے طاقتور کے ہاتھوں کمزور سے اس کی سب سے بیش قیمت امانت یعنی اس کی خوبصورت دوشیزاؤں کو چھیننے کی رسم۔ لیکن جب یہ برے کام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں تو بے عزتی اور بے حرمتی کا احساس زیادہ ہی شدید ہو جاتا ہے۔

غیر جانبدار رہتے ہوئے دکرم نے کہا، ’’ہندو عورتوں کا اپنے نئے مسلم گھروں کو چھوڑنے سے منع کرنا ضرور ایک سچائی ہو سکتی ہے، کیمی۔ کیونکہ زیادہ تر دیکھا گیا ہے کہ مسلمان اپنی اغوا شدہ عورتیں تو واپس لے لیتے ہیں لیکن ہندو کسی حالت میں بھی نہیں۔‘‘

’’وہ تو صرف انھیں ہندوؤں کی گرفت سے نکالنے کے لیے۔ بعد میں ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ ہوتا ہے.......... یہ بڑے ہی دردناک قصے ہیں،‘‘ کیمی بولے۔

تینوں مسلم صاحبان دکرم کو بڑی ہی غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس امید میں کہ اس کا نظریہ شاید یک طرفہ نہ ہو۔ دکرم نے کہا بھی، ’’نہیں جناب! ہم ہندوؤں میں اگر کوئی عورت اپنی مرضی سے یا کسی کی زور زبردستی سے دوسروں، خاص طور سے مسلمانوں سے کوئی ناجائز رشتہ بناتی ہے تو وہ ذلیل، ناپاک اور لامذہب سمجھی جاتی ہے۔ اس کے لیے خاندان اور برادری میں کوئی جگہ نہیں رہ جاتی، اتنا ہی نہیں بلکہ اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنے آپ کو کہیں پوشیدہ کر لے۔

دوسری طرف مسلمان ہم سے کہیں فراخ دل اور زیادہ معاف کر دینے والے بن کر سامنے آتے ہیں۔ وہ واپس آئی لڑکی کا نکاح جلدی سے جلدی کہیں دور دراز کے علاقے میں کر کے اسے بھیج دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہاں سختیاں ضرور ہیں مگر بے یار و مددگار عورت کے ساتھ یہ لوگ ذلت سے نہیں پیش آتے۔"

اشرف فوراً بولے۔" یہ تو الگ ہی نظریہ ہے۔ لگتا ہے مسلم عورتوں کی بدحالی کے بارے میں جو پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے آپ اس سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے۔ تو پھر بتائیں کہ مسلم عورتوں کے جنسی استحصال، مردوں کے چار نکاح یا فوری طلاق جیسے موضوعات پر آپ کیا خیالات رکھتے ہیں۔"

ملند کا تو یہ پسندیدہ موضوع ہی تھا وہ کہاں پیچھے رہتے۔" سر! اس معاملے میں کوئی ملک، ذات یا قوم اپنی پیٹھ نہیں تھپتھپا سکتی۔ ہم ہندو اپنی عورتوں کو بڑا اونچا درجہ دینے کی شیخی مارتے ہیں۔ ماں، دیوی اور جانے کیا کیا کہتے ہیں، لیکن آپ نے ان عورتوں کی حالت دیکھی ہے جو بانجھ، طلاق شدہ یا بیوہ ہو جاتی ہیں یا ایسی جن کی کوکھ نے صرف بیٹیاں پیدا کی ہوں؟ اس کے علاوہ ایسے تمام لوگ جن کے پاس دولت اور طاقت کی کوئی کمی نہ ہو وہ کب کسی ایک عورت تک محدود رہتے ہیں۔"

ملند طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے بولے۔" سر! جو کام مسلمان جائز طریقے سے سینہ ٹھونک کر کرتا ہے، ہم ہندو خاموشی سے پردے کے پیچھے کرتے ہیں۔ اور یہ سب—ایسے ہی چلنے دیجیے۔ چلنا بھی چاہیے......زندگی میں کچھ تازگی تو ہے۔ یہ عورتوں اور مردوں کے درمیان جو ایک فرق ہے اس پر لوگ کیا کیا تقریریں کرتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں، یہاں تک کہ اس فرق کو مٹا ہی دینا چاہتے ہیں، جب کہ اسی فرق کا دوسرا نام ہی زندگی ہے۔ یہی نہ ہو تو دنیا بے کار......" اتنا کہہ کر ملند نے ایسا زوردار قہقہہ لگایا کہ دروازے کھڑکیاں تک ہل گئیں۔

ہنسی مذاق کی یہ لہر ذرا مدھم ہوئی تو وکرم نے گفتگو کی سمت بدلتے ہوئے پھر کہا،" اشرف صاحب! جیسا کہ پہلے بات ہو رہی تھی کہ پاکستان تو آپ لوگوں نے......میرا مطلب کہ یو پی اور بہار میں رہنے والے آپ کے پرکھوں نے ہی بنوایا تھا۔ مگر مشرقی پاکستان الگ ہو جانے کے بعد کیا آج بھی آپ سوچتے ہیں کہ وہ فیصلہ صحیح تھا؟"

" آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں کہ صرف یو پی اور بہار کے لوگوں نے پاکستان بنوایا

ہے،'' چھوٹے میاں ترنت بولے۔'' سب طرف کے سارے مسلمان پاکستان چاہتے تھے۔ پاکستان ہم سب نے مل کر بنایا ہے۔''

'' میرا مطلب دانشورانہ اور جذباتی تحریک سے تھا۔ دراصل سب سے زیادہ پڑھے لکھے مسلمان، مصنف، صحافی، شاعر، مفکر، چوٹی کے مولوی مولانا، بڑے سرکاری عہدیدار، وکیل، زمیندار اور تعلقہ دار انھیں علاقوں میں تھے اور ساری حمایت ان ہی لوگوں نے اکٹھا کی تھی۔ آپ جیسے مہاجرین جنھوں نے دوقومی نظریے کا تصور کیا اور اس نظریے کی عوام میں خوب تشہیر بھی کی۔ یہاں تک کہ جناح کی ساری تدبیروں کو اپنے ہی ہاتھوں عملی جامہ پہنایا۔ آخر آپ ہی لوگ سب سے زیادہ پریشان بھی ہوئے، سب سے زیادہ اجڑے بھی اور آج بھٹک بھی رہے ہیں۔ مگر یہ کام تھا آپ ہی لوگوں کا۔ پٹھانوں، بلوچوں اور سندھیوں کا نہیں۔ ان کے پاس تو صرف جسمانی طاقت ہی تھی جو صدیوں سے دوسرے ہی استعمال کرتے آرہے ہیں۔''

اشرف کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے،'' ہاں آپ شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ذہنی اور مذہبی رہنمائی تو ہم ہی لوگوں نے کی لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ پاکستان صرف مسلمانوں نے بنوایا ہے۔ میں تو کہوں گا کہ پاکستان بنوانے میں ہندو بھی برابر کے حصے دار ہیں بلکہ ہم سے کچھ زیادہ ہی۔ ہمیں مجبور کیا گیا کہ ہم اپنے لیے الگ ضابطہ اور دوسرے نظام کی تلاش کریں۔''

'' یہ تو بڑا ہی عجیب خیال ہے،'' ملند نے کہا۔'' وہاں مہاتما گاندھی انشن پر بیٹھے تھے کہ ہندو اور مسلمان آزادی کے بعد لڑنے مرنے کے بجائے ویسے ہی شیر وشکر ہو کر رہیں جس طرح جنگ آزادی میں ساتھ رہے اور یہاں جناح صاحب '' ڈائرکٹ ایکشن'' کا اعلان کر کے تشدد اور خون خرابے کا سہارا لے رہے تھے۔''

اب چھوٹے میاں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا،'' گاندھی کے خیالات واقعی بہت نیک تھے۔ لیکن ہندوؤں میں ان کے جیسے بہت ہی کم لوگ تھے زیادہ تر ہندو اگر ہم سے نفرت نہیں کرتے تھے تو ہمیں پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ فرنگی سلطنت کے آخری دنوں کی بات کر رہے ہیں، اور پاکستان دس دن یا دس سال میں نہیں بنا۔ آپ غور کیجیے کہ 1937 میں مسلم لیگ بری طرح ہاری اور دس برس بعد 1946 میں قریب قریب سو فیصدی مسلمانوں کا ووٹ لیگ کو ملا۔ مگر بات انھیں دس برسوں کی نہیں ہے اور نہ ہی بات 1940 کے لاہور سیشن میں

پاکستان کی مانگ رکھنے اور 1947 میں اسے حاصل کر لینے کی ہے۔ پاکستان کی بنیاد اور تعمیر کے درمیان انھیں برسوں کی اہمیت نہیں تھی۔''

چھوٹے میاں تھم گئے۔ ہندوستانی افسروں کو لگا کہ ابھی انھوں نے اپنی بات پوری نہیں کی ہے اس لیے سارے لوگ خاموش رہے۔ کچھ لمحوں کے بعد اشرف صاحب نے واضح کیا، ''دراصل جب آپ پاکستان کے وجود میں آنے کی بات کرتے ہیں تو فرنگی حکومت کے آخری دس بارہ برسوں کے واقعات پر ہی نگاہ ڈالتے ہیں یا ہندوستان کے بٹوارے کے بارے میں سوچتے ہیں تو آپ کو صرف چودہ پندرہ اگست 1947 یا اس کے کچھ مہینے پہلے اور کچھ مہینے بعد کا ہی وقت دکھائی پڑتا ہے جو کہ قومی دنگوں کا خاص دور تھا۔ مگر یہ سوچیے کہ بٹوارہ شروع کب سے ہوا؟ ہمارے ذہن و دل پر اس کی بنیاد کب پڑی؟ اور میں تو پوچھتا ہوں کہ بٹوارہ ختم ہی کب ہوا ہے؟ یہ تو ابھی بھی چل رہا ہے۔ ایک طرح کی نفرت، خوف اور شک کے قہر برپا کرتے ہوئے دریا کی طرح جو لگاتار اپنے کناروں کو خود سے دور دھکیلتا رہتا ہے۔ ایسے میں کیا میرا یہ سوال غیر مناسب ہے، کہ کیا بٹوارہ پورا ہو چکا ہے؟''

اشرف کی یہ دلیل سب کو اس قدر متاثر کر گئی کہ سبھی اس پر غور و فکر کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ وکرم نے اشرف پر عزت و احترام کی ایک نگاہ ڈالی۔ یہ شخص اس کے اپنے علاقے سے تعلق رکھتا تھا، اس نے اسی آب و ہوا اور مٹی میں پرورش پائی تھی، تقریباً ایک ہی جیسے دکھ سکھ میں بڑا ہوا ہوگا اور پھر ایکدم سے جھیلا ہوگا باہمی اعتماد کا زوال، یگانگت اور بھائی چارے کا خاتمہ، ہر ایک کا اپنی قوم اور اپنی اپنی مذہبی برادری میں سمٹنا، اندھی عقیدتوں اور جاہلانہ کٹر پن کے جوار بھاٹے میں بہہ جانا اور آخر میں............سب کے بعد............اپنے آپ کو فرقہ وارانہ تنگ نظری کے مکڑ جال میں پھنسا ہوا پانا۔ جیسے ایک تباہ کن لہر سمندر سے اٹھی اور سارے ہندوستان کی اچھی مٹی، بردباری اور ہمدردی کی پوشاک جیسی مٹی، مہذب چال چلن اور نظم و ضبط کے آئین کے لیے احترام کی تمام پرتوں کو اکٹھا کر پھر سے ایک اتھاہ سمندر میں سما گئی جہاں صرف ایک دوسرے کے لیے شک و شبہہ، مذہبی اندھاپن اور ہزاروں برس کی واضح و غیر واضح ناانصافی بھری پڑی تھی۔ اشرف نے تو کھائی کے اس پار سے صرف ایک جھلک ہی دکھائی تھی۔

"آگے بولیے اشرف صاحب۔ آپ کو اپنے یہ نظریات پوری طرح سمجھانے ہوں گے،" وکرم نے کہا۔

"دیکھیے محترم! بہت سے لوگوں نے ملک کے بٹوارے کو دلوں کے ٹکڑے ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں۔ دل کے معاملات بڑے ہی نازک ہوتے ہیں، اس میں ذرا سی گستاخی، معمولی سی بے رخی اور تھوڑی سی بے عزتی کی وجہ سے آپسی رشتوں میں بہت بڑی بڑی دراریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہم لوگ ایسی سیکڑوں مثالیں پیش کر سکتے ہیں جن سے دلوں کی دوریاں بڑھانے میں آئے دن مدد ملا کرتی ہے۔" اتنا کہہ کر اشرف خاموش ہو گئے۔

"بتایئے۔ بتایئے۔" منوہر نے ضد کی۔

"تو سنیے،" چھوٹے میاں بیچ میں ہی بولے۔ "اب آپس میں ملنے ملانے کا مسئلہ ہی لے لیجیے۔ شادی بیاہ یا کسی تیوہار کے موقع پر ہندو صاحبان بڑے ہی اخلاق سے ہمیں دعوت دیتے تھے۔ بڑے جوشیلے انداز میں ہماری خاطر تواضع اور آؤ بھگت بھی کرتے تھے مگر — ہمیں کھلاتے کیسے تھے؟ ایسے برتنوں میں جو صرف مسلمانوں کے لیے الگ رکھے ہوں، کسی اچھوت کونے میں اور کسی اچھوت کے ہاتھوں یہ برتن نکالے بھی جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان برتنوں میں اونچی ذات کے لوگ کھانا اتنی اوپر سے ڈالتے تھے کہ کہیں غلطی سے چمچے وغیرہ چھو نہ جائیں۔"

کچھ رک کر وہ پھر بولے۔ "ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ کچھ گھروں میں ہماری برادری کے ہی چھٹ بھیوں سے برتن نکلوائے اور دھلوائے جاتے تھے اور صفائی کے طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ ویسے تو کوئی بات نہیں لیکن سماج کے رسم و رواج کو کیا کیا جائے۔ مزے کی بات یہ کہ ہم لوگ مان بھی جاتے تھے شاید یہ سوچ کر کہ کسی کا تیوہار کیوں خراب کیا جائے۔ دوسری طرف یہی ہندو گائے اور سور دونوں کے گوشت کھانے والے انگریزوں کے آگے پیچھے دم ہلاتے رہتے تھے اور ان کو ہر وقت خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔"

اب جا کر پہلی بار نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ بڑے میاں بولے، "پشت در پشت ہمارے دماغ میں ایک بات بیٹھتی گئی کہ زیادہ سے زیادہ ہندو کسی طرح ہماری موجودگی تو سہتا رہے گا لیکن، نہ تو ہمیں اپنے دلوں میں جگہ دے گا اور نہ برابری کے حقوق۔ وہ ہمیں چھوٹا اچھوت اور گندا ہی

سمجھتا رہے گا۔صرف ایک ہی حالت میں وہ ایسی جسارت نہیں کر پائے گا جب کہ ہماری اپنی حکومت ہو۔اس لیے الگ ہونے میں ہی بھلائی دکھائی دیتی ہے۔اگر ہمارا اپنا ملک ہوگا تو ہم خود کو ''بادشاہ'' محسوس کریں گے۔''

''مگر آپ نے عام مسلمانوں کے بارے میں نہیں سوچا،'' ملند نے جواب دیا۔'' آپ نے تو صرف اپنے جیسے بڑے لوگوں، رئیسوں، زمینداروں، ملٹری اور سول افسروں کے بارے میں ہی سوچا۔جن لوگوں نے لات جوتے کھا کر جلوس نکالے، جو لوگ آپ کے کہنے پر بھائی جیسے غیر مسلموں کے قتلِ عام پر نکل پڑے، جو آپ کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے واقعی مارے کاٹے گئے۔ایسے غریب مسلمانوں کو تو آپ کام نکل جانے کے بعد بھول گئے۔انھیں تو آپ کمبخت ہندوؤں کے ہی درمیان چھوڑ آئے۔جناب! اصلیت تو یہ ہے کہ جب تک آپ غیر مسلموں پر حکومت کر سکتے تھے تب تک تو سب ٹھیک تھا، غیر منقسم ہندوستان آپ کو خوب اچھا لگتا تھا۔مگر جیسے ہی آپ کو لگنے لگا کہ جمہوریت میں آپ حکومت نہ کر پائیں گے، بھاگ لیے۔جو کچھ بھی ہاتھ لگا لے کر نکل لیے۔اونچے طبقے کے لوگوں کا فائدہ ہی فائدہ، باقی گئے جہنم میں۔حقیقت تو یہ ہے کہ آپ غیر مسلموں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر رہنا پسند نہیں کرتے۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے،'' اشرف بولے۔'' دراصل ہمارا پڑھا لکھا طبقہ خاص طور سے ہمارے زمیندار ''نہرو'' کے سوشلزم اور ان کی اشتراکیت سے گھبرائے ہوئے تھے۔نہرو کا زمینداری ختم کرنے کا اعلان ایک بڑا خطرہ بن چکا تھا۔دیکھیے خدا سے یکسر انکار کرنے والی یہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ فلاسفی ہمارے لیے زہر ہے۔اسلامی نظریات میں ایک شہنشاہ، ایک بڑا حکمراں اور اس کے ماتحت افسران تو ہماری عوام کے سمجھ میں آتے ہیں۔لیکن جمہوریت، سوشلزم، پنچایتی راج اور گاندھی کا رام راج یہ سب ہماری سمجھ سے باہر ہوتا ہے بلکہ ان سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔''

چھوٹے میاں بولے،'' ہماری سوچ کچھ الگ ہی نہیں بلکہ آپ سے بالکل مختلف بھی ہے ہمارے بزرگوں کی سوچ اور ان کے نظریات ہماری سوچ پر ہمیشہ قابض رہتے ہیں۔''

'' آپ کے بزرگ؟'' گیری نے زور دے کر پوچھا۔

''ہاں غزنوی اور اس کے بعد آئے سارے عربی، ترکی، ایرانی، منگول اور مغل وغیرہ

جنھوں نے ہندوستان صرف فتح ہی نہیں کیا بلکہ یہاں حکومت بھی کی اور سکونت بھی اختیار کی۔''
چھوٹے میاں بولے۔

''ہاں، ہاں ایسے خیالات ہم سکھوں کے درمیان بھی پائے جاتے ہیں جب وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ دوسرے ہندوستانیوں سے الگ ہیں،'' گیری طیش میں بولتے چلے گئے۔''ذرا میرے بھی گورے رنگ اور ہلکی آنکھوں پر غور کیجیے۔شاید میرے پرکھے بھی ایران یا ترکی سے آئے تھے تو میں بھی اپنے کو اس سرزمین کا نہ سمجھوں۔میں بھی ایران اور عرب کے دستور کی بجا آوری کروں؟ اور جناب آپ کس طرح کی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں آپ کو معلوم بھی ہے کہ فکر و خیال اور رہن سہن میں ترکی کہاں پہنچ چکا ہے؟''

''اور...... اگر آپ کی بات مان بھی لی جائے تو بتایئے کہ اس ضمنی برِّ اعظم کے کتنے مسلمانوں کی رگوں میں آج بھی خالص ایرانی یا عربی خون گردش کر رہا ہے؟ ایک فیصد؟ دو فیصد؟ وہ بھی ان میں جنھوں نے اپنے خاندان کے باہر کی بیٹیاں نہ اپنائی ہوں،'' منوہر نے کہا۔

''خیر! حساب لگانا تو ممکن نہیں رہا،'' چھوٹے میاں بولے۔''مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''کہنا یہ ہے کہ وہ سارے رانا، لامبا اور وڈھیرا جو ہم دونوں کے یہاں پائے جاتے ہیں۔''منوہر نے جواب دیا۔

''لیکن ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں اور ان کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے،'' چھوٹے میاں اڑے رہے۔

''نہیں جناب وہی تو اہمیت کے قابل ہیں،'' وکرم نے کہا۔''اگر آپ مذہبی لیبل ہٹا دیں اور ناموں پر غور نہ کریں تو سمجھ میں آجائے گا کہ سچائی کیا ہے۔سب کے پرکھے ایک ہی، ایک ہی خون سب آپس میں بھائی، چاچا یا ماما۔ ہندوستان میں بھرے یہ پٹھان کون ہیں؟ وہی راجپوت ــــ جنھوں نے کچھ پشتوں پہلے ہی اسلام قبول کیا۔سیّد پرانے برہمن، یادو اور چودھری آپ کے گھوسی۔ چمار اب چمڑہ کاریگر یا موچی اور کھٹک راعین کہلانے لگے۔اسی طرح امی اور بنگالی بھی مسلمان ہیں۔آخر یہ سب کے سب عرب کے کس حصے سے ہندوستان میں تشریف لائے تھے؟''

وکرم کی دلیل نے سبھی کو خاموش کر دیا تھا۔ اب وہ پھر آگے بولے۔ ''الگ الگ علاقوں میں ناک نقشے کا فرق ضرور دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن اس ضمنی برّ اعظم کے سبھی باشندوں کا خون آپس میں اس قدر تحلیل ہو چکا ہے کہ یہ کہنا قطعی درست نہیں کہ مسلمان ہندوؤں سے بالکل الگ کوئی قوم ہے یا اس کا ہندوستان کے رہن سہن اور یہاں کی تہذیب سے کوئی لینا دینا نہیں جیسے وہ ذات اور ذہنی حالات کی بنیاد پر کسی اور ہی قوم سے پیدا ہوئے ہیں۔ جیسے سیدھے خدا نے انھیں اس روئے زمین پر نازل کر دیا ہے۔ اسی سوچ اور مسجدوں کے ممبروں و لیگ کے اسٹیج سے پھیلے پروپیگنڈے ہی دلوں کو بانٹنے اور دوریاں بڑھانے میں کارگر ثابت ہوئے تھے۔ نہ کہ وہ تھوڑی سی چھوا چھوت، جو آپ لوگوں کے ساتھ ہندو گھروں میں کی جاتی تھی اور چھوا چھوت، تو ہندو آپس میں بھی کم تھوڑے ہی کرتے ہیں؟''

بڑے میاں جو اس بحث میں بہت ہی کم شریک ہوئے تھے، کھانس کر بولے،'' بقول آپ کے اگر سب آپس میں بھائی بھائی ہیں یا ہم سب کا خون ایک ہی ہے تو بتایئے کہ اس قدر خون خرابہ کیوں؟''

''کیا مطلب؟'' گیری نے وضاحت طلب کی۔

'' آپ کے ملک میں مسلمانوں کے خلاف برابر مذہبی دنگے ہوتے رہتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں مسلمان شہید کیے جاتے ہیں۔ ایسی وارداتوں کے بغیر شاید ہی کچھ دن گزرتے ہوں۔ ہمارے بہت سے اعزا و اقربا وہاں ہیں۔ ہمیں سب پتہ لگ جاتا ہے۔'' بڑے میاں نے واضح کیا۔

''اس بنیاد پر تو ہندوستان میں اب تک سارے مسلمان ختم ہو جانے چاہیے تھے،'' کیمی نے طنز کیا۔'' جہاں تک دنگوں کا سوال ہے تو دنگے ہمارے یہاں اکثر ہوتے ہیں۔ کبھی ہندو مسلمان آپس میں ٹکراتے ہیں، کبھی ممبئی میں مراٹھے اور کیرلائسٹ یا کبھی مراٹھے اور یو پی کے رہنے والے، کبھی گوہاٹی میں اسی اور بنگالی بھڑے رہتے ہیں، کبھی پہاڑی لوگ میدان میں رہنے والوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتے، کبھی سکھ ہندوؤں کو برداشت نہیں کرتے، منووادی فکر کے لوگ نچلی ذات کے شودروں کو ستاتے ہیں۔ ماؤوادی پونجی وادیوں کی جان کے پیاسے ہو جاتے ہیں، تو ہندوستان

میں دنگے ہونا ایسی کون سی بڑی بات ہے؟''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں،'' ملند نے کہا۔ ''یہ لوگ ہندو مسلم دنگوں سے تو بہت پریشان ہو جاتے ہیں لیکن دوسرے دنگوں سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

بڑے میاں بولے، ''ٹھیک ہے آپ آپس میں جم کر لڑ یے، مگر وہ مسلمان جو اقلیت میں ہیں، کمزور ہیں، ڈرے ہوئے ہیں، انھیں کیوں ستاتے اور مارتے ہیں؟''

''اس کا مطلب ہے کہ اگر ایک ذات کے بیچ دنگے ہوتے ہیں، اسی بنگالی اگر آپس میں بھڑتے ہیں یا شیعہ سنّی آپس میں ٹکراتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہاں اگر دو مذہبی گٹ آپس میں برسرِ پیکار ہو جائیں تو بے حد خراب بات ہے،'' کیمی نے کہا۔

''آپ لوگ سطحی معاملات پر غور کر رہے ہیں۔'' اشرف نے سب کا دھیان ہندو مسلم مسائل پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا باریکی سے دیکھیں۔ مذہبی دنگے انھیں علاقوں میں زیادہ ہوتے ہیں، جہاں مسلمان اپنے لیے تجارت وغیرہ میں اچھی جگہ بنا چکے ہوتے ہیں، مالدار ہو چکے ہیں شاید ان سے تجارت اور جائداد چھیننے کے لیے یہ دنگے ہوتے ہیں یا کرائے جاتے ہیں۔''

وکرم مضبوط ارادے کے ساتھ بولا۔ ''بالکل صحیح اشرف صاحب، اب آپ نے صحیح جگہ انگلی رکھی۔ اس کے پیچھے مالی وجوہات ہیں، زندہ رہنے کے لیے اور آگے بڑھنے کے لیے سبھی اپنی اپنی کھینچ تان میں مصروف ہیں۔ یہ مارا ماری زیادہ سے زیادہ دولتمند ہونے کی ہوس کبھی ہندو مسلم کبھی اونچ نیچ کے دنگوں کی شکل میں پھوٹ پڑتی ہے۔ آبادی بڑھنے سے دنگے بڑھنا بھی لازمی ہیں۔ بنیاد میں صرف آدمی کا حسد اس کی خود غرضی اور لالچ ہے۔ نام کچھ بھی دے دیجیے۔ معاشرتی برائیاں۔ مالی غیر برابری۔ مذہبی اندھاپن وغیرہ وغیرہ۔''

''بٹوارے کے وقت ہوئی لوٹ پاٹ اور قتلِ عام کو بھی شاید آپ اسی زمرے میں رکھتے ہوں؟'' چھوٹے میاں بولے۔

اس سے پہلے کہ کوئی ہندوستانی اس کا جواب دیتا۔ اشرف خود ہی بول پڑے، ''اس وقت مذہبی اندھاپن اپنے عروج پر ضرور تھا، مگر میں وکرم صاحب کی دلیل سے صد فی صد متفق ہوں۔ ہندوستان کی طرف سے آتی ہوئی ٹرینوں پر جب بھی حملے ہوئے تو سب سے پہلے حملہ آوروں کی

نگاہ ہمارے مال و اسباب پر پڑی، بہو بیٹیوں پر اس کے بعد۔ حملہ آوروں نے دونوں ہی ہتھیانے کی کوشش کی لیکن پہلی اہمیت انھیں چیزوں کی تھی، ہمارے مسلمان ہونے کی اس کے بعد۔"

"یہی حال یہاں مغربی پاکستان میں تھا،" گیری نے کہا۔ "مسلمان جلدی سے جلدی ہم ہندوؤں کی زمین مکان اور ہمارے مال و اسباب پر قبضہ چاہتے تھے۔ بعد میں ہماری بہو بیٹیاں۔ لگتا تھا کہ ہمیں قتل کرنا اتنا اہم نہیں تھا۔ وہ تو بعد کا ایک ضروری ردِ عمل جیسا تھا۔"

پرسی نے سگریٹ کا لمبا کش لیا، پھر بولے، "ہوسکتا ہے کہ پنجاب میں ایسا ہوا ہو مگر یوپی اور بہار میں شاید یہ وجہ نہیں تھی۔ وہاں تو جیسے صدیوں پرانا کوئی حساب برابر کیا جارہا ہو۔"

"مسلمان ہمیشہ سے حملہ آور رہے ہیں، یہ قتلِ عام سے کبھی باز نہیں آئے،" کیکی نے سب کچھ خارج کرتے ہوئے کہا۔

بڑے میاں نے ترنت جواب دیا، "ہندو ہمیشہ لوٹ کے چکر میں رہتا ہے، پہلے دھوکا دے ۔ تبھی تو زور زبردستی سے اور اس کے باوجود کامیاب نہیں ہوتا تو خون خرابے پر اتر آتا ہے۔"

وکرم سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صحیح توازن ہی نہیں بیٹھتا۔ اس کمرے میں دونوں مذاہب کی معمولی سی ہی نمائندگی ہے پھر بھی زمانوں کے ذہنی خلل اور دماغوں میں بسی غلط فہمیاں ہی آخر میں حاوی ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ اپنے پرکھوں کو یکسر خارج کرتے ہوئے بھائی بھائی کے خلاف ہی کھڑا ہے۔

بہت سوچ سمجھ کر برٹی نے کہا، "دیکھیے میں تو ٹھہرا عیسائی۔ پر کیا آپ لوگوں کے مذاہب آپ کو رواداری اور انسانیت نہیں سکھاتے؟"

"بالکل،" بڑے میاں بولے۔ "اسلام سے بڑھ کر رواداری اور انسانیت پر کوئی مذہب قائم ہی نہیں ہے۔ ہمارے رسولؐ نے یہودیوں اور دیگر بت پرستوں کو مکّہ کی حدود میں عبادت کرنے کی اجازت دی تھی۔ اسلام کی رو سے ہر انسان برابر ہے۔ رحم دلی ایک ایسا جذبہ ہے جو سب کے لیے ضروری ہے۔"

"ہندو کم متحمل مزاج اور رحم دل نہیں ہے،" کیکی نے کہا۔ "کسی مزار پر جا کر دیکھیے وہاں آنے والوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ تعداد ہندوؤں کی ہوتی ہے۔ ایسے تمام مقامات

ہندوؤں کی سخاوت اور فیاضی سے ہرے بھرے دکھائی دیتے ہیں۔ محترم! ہندوستان میں ہندو تو مسلمانوں کو حج تک کراتا ہے کیوں کہ ہمارے یہاں گورنمنٹ کی طرف سے حاجیوں کو جو سبسڈی دی جاتی ہے اس میں ہندوؤں کا ٹیکس بھی اسی طرح شامل رہتا ہے جس طرح ہندوستان کے اور لوگوں کا۔''

کبھی کچھ رک کر بولے، ''اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہندو آپ کی مسجدوں میں بھی پہنچ کر اپنی عبادت کرے گا۔ ہندوؤں کے لیے خدا ایک ہی ہے جو صرف اس کا نہیں بلکہ سبھی کا ہے وہ اسے مزار، مسجد، گرجا، مندر یا کسی چھوٹے سے چھوٹے پتھر میں بھی تلاش کرنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔''

یہ حقیقت پسندی اور فلاسفی کے مسئلے تھے، ان معاملات میں سوال کرنا تو آسان تھا لیکن جواب مشکل۔ یہ سبھی مانتے ہیں کہ ہر مذہب کے بنیادی اصول ایک جیسے ہی ہیں، سبھی ان اصولوں کی دہائی بھی دیتے ہیں لیکن موقع ہاتھ آتے ہی زیادہ تر لوگ ان اصولوں کو طاق پر رکھ کر ایک دوسرے کی لوٹ مار میں شامل ہو جاتے ہیں وہ بھی اپنے اپنے مذہب کے نام پر۔ اس سے بھی زیادہ، اپنے مذہب کو دوسرے مذاہب سے بہتر مان کر اس کی تبلیغ کے لیے تمام طرح کے ظلم اور ناانصافی بھی کی جاتی ہے اور اپنے آپ کو صحیح بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ تواریخ کے اوراق ایسی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔

وکرم نے کہا، ''ایک بات غور کرنے کی ہے۔ کسی بھی مذہب کی پرکھ اس کے پیغمبروں یا مذہبی کتابوں کے بجائے اس کے پیروکاروں کے چال چلن اور برتاؤ پر منحصر ہوتی ہے۔ ''انکویزیشن'' اور ''کروسیڈ'' کے وقت میں عیسائیوں نے بہت مظالم ڈھائے تھے۔ لیکن یہ بہت کم وقفے کے لیے تھا اور جلد ہی عیسائی پھر عیسٰی مسیح کی تعلیمات کی طرف لوٹ آئے۔ آج عیسائی مذہب کی ایک چھاپ ہے۔ ایک شیریں زبان پادری کی، ایک مہربان نرس کی جو کسی یتیم خانے میں ننھے منے بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی مشن اسپتال میں ڈاکٹر کی جو بغیر مریضوں کو لوٹے ہوئے ان کا علاج کرتا ہے اسی طرح مسلمانوں کو سچائی اور اخلاقیات سے شرابور قرآنی آیتوں سے نہیں بلکہ اس تشدد اور توڑ پھوڑ سے پہچانا جاتا ہے جو انھوں نے مذہب کی ترویج کے لیے اختیار کیں۔ یا صرف

حکومتیں حاصل کرنے کے لیے مذہب کا سختی سے استعمال کیا اور ہندو...... ہندو کی تصویر گیتا اور وید کے اشلوکوں میں نہیں بلکہ پجاریوں اور پنڈتوں کی بناوٹ، بنیے کی لالچ و چالاکی اور باقی لوگوں کی خودغرضی کے لیے کسی بھی حد تک گر جانے میں منعکس ہوتی ہے۔ بس اتنی غنیمت ہے کہ ہندو اپنا مذہب لے کر کسی اور کے پاس نہیں جاتا۔ وہ بڑے ہی صبر کے ساتھ ساری مشکلیں جھیل لیتا ہے اور آخر میں سب کو ساتھ لے کر دوسروں پر حاوی بھی ہو جاتا ہے۔''

''تب تو ذرا ہوشیار رہنا ہوگا،'' اشرف نے ہنس کر کہا۔ ''مگر آپ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی توسیع تشدد سے جڑی ہے تو یہ عام خیال ہو سکتا ہے لیکن ہندوستانی پس منظر میں پوری طرح صحیح نہیں ہے۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا طاقت کے زور پر مذہب تبدیل نہیں ہوئے؟ مندر نہیں توڑے گئے؟'' منوہر نے پوچھا۔

''دیکھیے تبدیلی مذہب شروع میں تو خوف کی وجہ سے ہوئی، پھر نئے حکمرانوں کے رحم و کرم سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہوئی، جیسے راجپوتوں کا اسلام میں داخل ہونا۔ انھیں لگا کہ اپنی جاگیریں بچانے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔ ان کے دوسرے بھائیوں نے اپنی بیٹیاں دے کر اسی طرح حفاظت اور عیش و آرام کا سامان فراہم کر لیا ساتھ ہی انھیں مذہب بھی تبدیل نہیں کرنا پڑا۔ اس طرح سے اس تبدیلی مذہب میں ان کی اپنی مرضی ہی شامل تھی۔ پھر بھی آزادی کے وقت کی اتنی بڑی مسلم آبادی میں اس کا تناسب بہت ہی کم تھا۔''

''تو؟'' پری نے پوچھا۔

''تو زیادہ تر ہندوؤں نے اپنی مرضی سے خود ہی اسلام قبول کیا،'' اشرف بولے۔ ''اور یہ بھی ہمارے مذہبی رہنماؤں اور مولویوں کی تشہیر سے نہیں بلکہ یہ کام مسلمانوں کے ایک ایسے طبقے کے ذریعے ہوا جو ایسا کچھ کرنے نکلا ہی نہیں تھا۔''

''آپ کا مطلب...... صوفیا؟'' وکرم نے کہا۔

''جی!'' چھوٹے میاں بولے۔ ''ہماری کتابوں کے پیغام غیر مسلموں تک پہنچانے میں صوفیائے کرام زیادہ کامیاب ہوئے۔ ایک طرح سے وہ ہندوؤں کی سادھو سنتوں والی روایات

سے بالکل میل کھاتے تھے۔ ان کی خاص پہچان تھی خدا کے عشق میں پاگل رہنا۔ یہی تعلیم کئی ہندو شاخوں کی بھی تھی اور اس کے ساتھ تھے اسلام کے سب سے مضبوط اصول، مساوات اور برابری و بھائی چارے پر زور، اسلام کے ان اصولوں نے ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچا جو طبقاتی نظام اور ذات پات سے عاجز آچکے تھے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ صرف لالچ اور ذات پات کی اونچ نیچ سے بچنے کے لیے اتنے سارے ہندو، مسلمان ہو گئے؟'' کسی نے پوچھا۔

چھوٹے میاں نے جواب دیا، ''سب سے زیادہ لوگوں نے ایسے ہی علاقوں میں اسلام اختیار کیا جہاں طبقاتی کشمکش جان لیوا ہو چکی تھی۔ بنگال، بہار اور اتر پردیش کے کچھ حصے، کیرل کا بڑا علاقہ، گاؤں کے گاؤں مسلمان بنتے گئے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ زیادہ تر ان علاقوں میں اسلام تیزی سے بڑھا جہاں بادشاہت اور زمینداریاں ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھیں۔''

ہندو افسر خاموش تھے۔ ان تاریخی حقائق نے انھیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''میں سوچتا تھا،'' اشرف بولے۔ ''واقعی میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہمارے مذہب کے کچھ جوشیلے علمبردار اگر صبر کرتے، اگر ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑا لے کر مذہب کی توسیع کے لیے نہ کود پڑتے، یا اگر انھوں نے یہ ذمے داری صوفیائے کرام کے حوالے کر دی ہوتی تو آج حالات کیا ہوتے؟''

سبھی وکرم کی طرف دیکھنے لگے جیسے اس موضوع پر کچھ کہنے کی جسارت وہی کر سکتا تھا۔ وکرم نے خاصے غور و فکر کے بعد دھیمی آواز میں کہا، ''اس حالت میں ہم ہندو ایسی جگہ ہوتے جہاں آج مسلمان ہیں،'' ''یعنی اپنے ہی ملک میں ایک اقلیت۔''

سب وکرم کی طرف گھور رہے تھے۔ پاکستانی کچھ عدم اعتمادی میں اور ہندوستانی اس کے اس قول کو طنز مان کر لیکن جب سبھی نے وکرم کے چہرے پر بھرپور اعتماد کی جھلک دیکھی تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ صرف سبھی نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلے پر آگے ضرور بحث ہو گی لیکن بعد میں۔

کچھ دیر سبھی اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے رہے۔ پھر بڑے میاں نے کہا، ''آپ کی گفتگو سے لگتا ہے کہ آپ اب بھی سوچتے ہیں کہ پاکستان کا بننا کیا صحیح تھا؟ لازمی تھا؟ تو میں یہی کہوں گا

کہ ہاں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔"

بڑے میاں نے اپنی بات آگے بڑھائی، "دیکھیے پاکستان مسلمانوں کے لیے ایک بنیادی ستون ہے ایک کھمبے کی طرح، ہماری طاقت اور یکجہتی کا علمبر دار ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہندوستان کے سارے مسلمان یہاں پناہ حاصل نہ کر سکے لیکن انھیں معلوم ہے کہ پاکستان اسلامی طاقت کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں ان کے اپنے بھائی اور ہم مذہب ہیں جنھیں وہ کسی بھی مصیبت کے وقت آواز دے سکتے ہیں۔ ہندوستان کے کسی بھی مسلمان سے پوچھ لیجیے وہ کھل کر بھلے ہی اعتراف نہ کرے لیکن اندر سے یہی سوچتا ہے کہ پاکستان کی شکل میں اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہے۔ یہاں مسلمانوں کی مرضی چلتی ہے۔ ان کے اوپر ہندوستان میں ہوئے مظالم کو للکارا جا سکتا ہے اور ان کا بدلہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کو وجود میں لانے کے لیے یہی جذبات کافی تھے۔"

"اور اب جب کہ آدھا پاکستان ٹوٹ کر پھر سے ہندوستان کی گود میں آ بیٹھا ہے؟" ملند نے کہا۔

"ایسا نہیں ہے،" بڑے میاں نے صفائی پیش کی۔ "ہمیں بنگلہ دیش کے بارے میں کوئی خاص فکر نہیں ہے۔ وہ ہمارے اپنے ہی ہیں۔ کچھ وقت گزرنے دیجیے آپ دیکھیں گے کہ ضرورت پڑنے پر وہ ہمارے ہی ساتھ کھڑے دکھائی دیں گے۔ ہمارے خلاف نہیں اور آپ کے ساتھ تو کبھی نہیں۔"

اشرف نے گفتگو کو سنجیدہ سمت دیتے ہوئے کہا، "بنگلہ دیش بننے کی وجہ اسلام کی گرفت کا کمزور پڑنا یا دو قومی نظریات کا انحراف نہیں تھا۔ یہ سب ہندوستانی پروپیگنڈہ ہے۔ بنگلہ دیش تو رہنماؤں کی خود حکومت کرنے کی ذاتی حسرت کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔"

"یعنی قصہ کرسی کا؟ تاج و تخت کی لڑائی؟" ہیری بولے۔

"آپ خود سمجھ سکتے ہیں،" چھوٹے میاں نے کہا۔

"ہاں۔ ادھر پنجابی تانا شاہ ادھر اقتدار حاصل کیے ہوئے مجیب۔ سامنے یحییٰ خان اور پیچھے چھپے حکومت کے اصلی دعویدار بھٹو،" ملند نے کہا۔

"مگر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مذہب مختلف مٹی سے تعلق رکھنے والوں کو جوڑنے

والی کوئی گوند نہیں ہے، جیسا کہ عام آدمی سمجھتا ہے،" ملند نے آگے کہا۔ "اقتدار کی ہوس سے ہی لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ ذرا مذہب اور تہذیب کی طوطی بجائیے مالی ناہمواریوں کو دکھایئے صحیح یا غلط، سب کو اپنے ساتھ ہوتی ناانصافیاں دکھایئے۔ چیخ چیخ کر بار بار ان پڑھ اور گنوار لوگوں کو انصاف اور خوشحالی کے خواب دکھایئے۔ کیا پتہ کتنی جلدی آپ کسی ایک ملک کے مالک بن بیٹھیں۔"

اشرف شاید اپنے ملک کے حکمرانوں کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے گفتگو کا رخ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا، "لیڈران ساتھ رہتے بھی کیسے؟ کانگریس کے ناگپور سیشن میں قائداعظم کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا؟ انھوں نے بے عزتی محسوس کی اور میٹنگ چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ نہرو کو قاعدِ اعظم کا اوپر اٹھنا قطعی پسند نہیں تھا۔ شاید انھیں خوف تھا کہ جناح صاحب دماغی طور پر سب کے اوپر حاوی نہ ہو جائیں۔ صرف گاندھی کو جناح کی اندرونی لگن اور استحکام کا اندازہ تھا اسی لیے بعد میں انھوں نے جناح صاحب کو وزیراعظم بننے کا نیوتہ بھی دیا بشرطیکہ وہ پاکستان کی مانگ چھوڑ دیں۔ مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔"

وکرم محسوس کر رہا تھا کہ سارا کا سارا کھیل ذاتیات کا ہی ہے۔ فردِ خاص ہی ملک در ملک فتح کرتا رہا ہے، حکومتیں قائم کرتا رہا ہے، جمہوریت یا عامریت کا پرچم بلند کرتا رہا ہے، اور ہتھیار ہوتے ہیں کبھی مذہب کی پکار، کبھی دولت کا خواب۔ کبھی اپنی قوم کی برتری کے لیے، کبھی دوسری قوموں کی پستی کے لیے اور کبھی صرف اور صرف جھوٹی اَنا کی تسکین کے لیے۔ لگتا ہے جیسے ہندوستان کے بٹوارے کی کہانی بھی دو انسانوں کی ذاتی رقابت کا نتیجہ ہے۔ دونوں اپنی تعلیم و تربیت، رہن سہن اور فکر و خیال میں بالکل انگریز...... ایک ہندوستانی پوشاک میں، دوسرا محض نام کا مسلمان، ایک اونچے درجے کا برہمن اور خود ساختہ مذہب بیزار، دوسرا مذہب اور اپنے بیچ طویل فاصلہ رکھنے والا، وقت ضرورت صرف شیروانی پہن کر لیگی زبان اپنانے والا اور تو اور ذاتی طور پر دونوں مزاج سے بردبار، فراخ دل اور لامذہبیت سے لبریز، ہمیشہ اپنے عوام کو سطحیت سے اوپر اٹھا کر سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں دھکیلنے کے لیے مضطرب۔ مگر دونوں مغرور، اپنی قابلیت اور ہر دلعزیز ہونے کے گھمنڈ میں اس طرح چور، کہ آپس میں مل بیٹھ کر کبھی [illegible] مشورہ کرنے کی

گنجائش قبول ہی نہ کر سکے۔ نہرو سارے ہندوستانیوں کے چہیتے نہرو، گاندھی کے بلا مقابلہ جانشین، ہندوستان میں سب سے بلند مرتبہ ہونے کے تئیں پوری طرح مطمئن برہمن اور جناح ایک جدید فراخدلانہ شاہی شخصیت۔ کثیر ہندو ممالک میں گھٹن محسوس کرنے کے اندیشے سے خوفزدہ، آخر کار پلٹ کر عہد وسطیٰ کی اس دقیانوسی ذہنیت کی طرف چل پڑے جہاں ملک کی بنیاد صرف مذہب پر منحصر ہوتی تھی۔

نہرو اور جناح دونوں کے مقدرات انھیں اختیار و اقتدار کی سمت میں لے جا رہے تھے۔ پورے ہندوستان پر نہ سہی ہندوستان کے ٹکڑوں پر ہی راج کرنا ان کا مقدر تھا اور اسی کوشش میں ایک نے گاندھی کے خیالات کو طاق پر رکھ دیا تو دوسرے نے ملک کے زیادہ تر مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

''کیا کبھی سو......دو سو سال یا ہزار سال میں ہم پھر سے ایک ہو سکتے ہیں؟'' پرسی نے نہایت ہی بھولے پن سے پوچھا۔

''نہیں میرے خیال میں تو کبھی نہیں،'' اشرف نے جواب دیا۔ ''بلکہ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم آپس میں جنگ کرنے کے بجائے اپنے غریب اور مظلوم عوام پر نگاہ رکھیں، ان سب کو نہرو اور جناح کے ان خوابوں کی اصلیت سے روشناس کرائیں جو ان دونوں نے اپنے اپنے ملک کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے دیکھے تھے۔''

تینوں پاکستانی ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اشرف نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ چلیے چند لوگوں کے درمیان ہی سہی، تھوڑی بہت سچائی تو سامنے آ ہی گئی۔

تینوں نے ہندوستانی افسروں سے ہاتھ ملائے اور وکرم سے تو کچھ زیادہ ہی گرم جوشی کے ساتھ۔

''گاڈ بلیس یو' وکرم نے کہا'' بھگوان آپ سب کا بھلا کرے۔''

''خدا حافظ'' ادھر سے بھی جواب آیا۔

وکرم کافی دیر کرسی پر آنکھیں بند کیے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ تین ملک، ایک مٹی، ایک خون بٹوارہ کب شروع ہوا؟ کب ختم ہوا؟ کیا اس کی صحیح تاریخ اور عملی حد بندیوں کا تعین ہو سکتا تھا؟ کیا

وہ مسلمان جو ہندوستان سے پاکستان چلے گئے تھے ہندوستان کے کچھ حصے اپنے ساتھ نہیں لے گئے؟ کیا پاکستان کی سرزمین اور اس کے باشندوں سے ہندوؤں اور سکھوں کا لگاؤ باقی نہیں رہا؟ بٹوارہ دلوں کے ٹوٹنے جیسا حادثہ ضرور تھا، لیکن کیا یہ ٹکڑے آج بھی ایک دوسرے کی تلاش میں نہیں ہیں۔

ایک زمانے میں ''جیت بہن'' جنھوں نے دوران بچپن مغربی پاکستان میں اپنے پورے خاندان کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا ان کے سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ آخر ایک ہی لہو کی اولادوں میں اتنی نفرت اور تشدد کی وجوہات کیا تھیں............وکرم کو ان کے الفاظ آج بھی یاد آتے ہیں کہ ــــ وہ وقت خراب تھا............آدمی برے نہیں تھے......بس وہ وقت ہی خراب تھا۔

باب تیرہ

پنجرے میں بند شیر

(جیل سے فرار-1)

لڑائی سترہ دسمبر کو ختم ہوئی تھی۔ کچھ دنوں بعد ہندوستانی قیدیوں کو آپس میں ملنے کی اجازت مل گئی تھی۔ دن میں وہ سبھی ایک ایسے آنگن میں ساتھ ساتھ رہتے تھے، جو اونچی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ دیوار کے باہر ایک اونچی جگہ سے دو رائفل بند سپاہی قیدیوں کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ چار پانچ دنوں تک تو سبھی ایک دوسرے کو جنگ سے متعلق واقعات سنانے میں مصروف رہے۔ لیکن بعد میں وقت گذاری خاصی مشکل لگنے لگی۔ ملند، گیری، پری اور شیٹی جیسے چست درست نوجوانوں نے ورزش کرنی شروع کر دی اور جن لوگوں کو چوٹیں آئی تھیں، زمین پر لیٹے لیٹے دھوپ کھاتے رہتے تھے۔ برٹی پرانے اخبار مانگ کر ان کے گولے بنانے اور سارا دن انھیں مٹھیوں میں زور زور سے دباتے رہتے۔ ایسا شاید وہ اپنے بازوؤں کی مچھلیاں ابھارنے کی کوشش میں کیا کرتے تھے۔

ایک دن نقوی آئے اور اپنے ہکلاہٹ بھرے لہجے میں گویا ہوئے — ''م......م......م میں کچھ کھ......کھ......کھیل کا سامان لایا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے شطرنج کا ایک سٹ اور تاش کا پیکٹ پیش کیا۔''

''یہ تو صرف چھ لوگوں کے لیے ہی ہے۔ باقی سارے لوگ کیا کریں گے؟'' تیمل نے فوراً ایک کمی نکالی۔ حالات کیسے بھی ہوں انھیں ہر چیز میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور دکھائی پڑ جاتی تھی۔

''ا......ا......ا......انشاءاللہ......ا... ...اور آ جائیں گے،'' نقوی نے یقین دلایا۔ تیمل اور منوہر فوراً شطرنج لے کر بیٹھ گئے۔ چار لوگوں نے ایک دوسرا گروپ بنا کر تاش کے پتے بانٹنے شروع کر دیے۔ بقیہ لوگ کھیل دیکھتے ہوئے مقابلوں پر اپنی رائے پیش کرنے لگے اور دیکھتے دیکھتے ہندوستان کے یہ مٹھی بھر قیدی دو خیموں میں بٹ گئے۔ کون کھیل رہا ہے اور کون صرف دیکھنے والا ہے، پتہ لگانا مشکل تھا۔ یوں سمجھیے کہ ہر بازی ایک دوسرے کی الزام تراشی پر زیادہ ختم ہوتی تھی شہ اور مات پر کم۔

ایک روز بھی یوں ہی مختلف قسم کی وقت گذاریوں میں مصروف تھے۔ صرف اکیلے گیری تھے جو بڑے ہی پر جوش انداز میں آنگن کے کنارے کنارے چکّر لگا رہے تھے۔ گیری کی یہ کیفیت دیکھ کر یوں سمجھ لیجیے کہ چڑیا گھر کے پنجرے میں قید کسی چیتے کی چہل قدمی یاد آئی تھی اور واقعی گیری اس وقت ذہنی طور سے کسی پنجرے میں قید چیتے یا شیر سے قطعی کم نہیں تھے۔

''آخر ہم لوگ یہاں سے کب نکلیں گے؟ آپ لوگ کبھی اس سلسلے میں بھی کچھ سوچتے ہیں۔'' گیری نے یکا یک رک کر سبھی کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے، کہیں نہ کہیں سب کے ذہن میں یہی سوال تھا۔ نیا سال شروع ہو چکا تھا لہٰذا نئی امید کرنا فطری تھا۔

''اب دیر نہیں لگے گی،'' پری نے کہا۔

''ہاں۔ ہاں بہت جلد۔ کسی بھی دن ہم لوگ واپس جا سکتے ہیں،'' تیمل نے بھی امید ظاہر کی۔ آدتیہ جو کہ جوے کا شوقین تھا، اس نے فوراً مشورہ دیا کہ سب لوگ اپنے اپنے اندازے کے مطابق تاریخ کا اعلان کریں، جس کا اندازہ سب سے قریب ہوگا ہم سبھی اس کو آدھے مہینے کی تنخواہ دے دیں گے۔

''یہ بہت زیادہ ہیں،'' برٹی نے کہا۔ ''میری غیر حاضری میں میری بیوی تو اگلے سال کی بھی تنخواہ خرچ کر کے بیٹھی ہوگی۔ اس لیے سو روپے سے زیادہ کی کوئی شرط نہیں۔''

سودا پکا ہو گیا۔ ہیری نے ایک سگریٹ کا خالی پیکٹ تلاش کیا اور گارڈ سے پنسل مانگ کر

سب کی بتائی ہوئی ممکنہ تاریخیں اس پر درج کر دیں۔

گیری کی بتائی ہوئی تاریخ دیکھ کر ہیری بھڑک اٹھے۔ ''اکتیس جولائی؟ تو تو بڑا ناامید قسم کا انسان ہے،'' ہیری بولے۔

'' دیکھتے جایئے۔ چھ مہینے تک کچھ نہیں ہونے والا ہے۔ اتنا کہہ کر گیری نے پھر سے چہل قدمی شروع کر دی۔

تھوڑی دی بعد ملند نے وکرم سے کہا،'' آپ نے دس جنوری کی تاریخ کا اعلان کر رکھا ہے، آپ کیا سوچتے ہیں کیا اتنی جلدی......؟''

'' ارے ملند! ہمیں کیا معلوم کہ دونوں ملکوں کے بیچ کیا چل رہا ہے؟ اس لیے جیسے دس جنوری ویسے ہی اکتیس جولائی،'' وکرم نے کہا۔

'' مجھے نہیں لگتا کہ حالات جلدی معمول پر آئیں گے،'' ملند نے اپنی رائے پیش کی۔

'' ویسے بھی جیت کے گھمنڈ اور ہار کی اینٹھن میں تال میل ذرا مشکل سے ہی پیدا ہوتا ہے ایک ذرا سا نظریاتی فرق، کوئی چھوٹا سا واقعہ بات چیت کو مہینوں آگے بڑھا سکتا ہے،'' وکرم نے کہا۔

'' سر! اگر ہماری واپسی دیر میں ہوتی ہے تو ہمیں کچھ سوچنا پڑے گا۔ آخر ہم کب تک یہاں پھنسے رہیں گے۔ ہمیں کسی بھی طرح یہاں سے نکلنا ہوگا،'' ملند نے کہا۔

وکرم لڑائی سے قبل کے حالات پر غور کرنے لگا۔ امن اور جنگ کے بیچ کی کشاکش، سارے لوگ انتظار میں، '' ریسر جھکا ہوا تیار'' دوڑ شروع کرنے کے لیے بے چین، خرگوش جیسی سونگھنے کی طاقت اور شکاری کتے زنجیروں میں قید۔ موت کی فکر کسے نہیں ہوتی مگر اس کا ذکر بہت کم ہی ہوتا ہے زیادہ تر ایک ہی فکر ہوتی ہے، دشمن کے ہاتھ پڑنا۔ پاکستان میں قید ہونا سب سے زیادہ پریشانی کا معاملہ تھا اور چرچا کا موضوع بھی۔

اگر تم پاکستان میں قید کر لیے جاؤ تو بات چیت سے چکمہ دینے کی کوشش مت کرنا۔ سیدھے پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ کرنا، شاید اسی سے تمھارے بچنے کا راستہ نکل سکے۔ اس کو رائے دی گئی۔

'' کوئی پکر (فکر) نہیں،'' ملیالی افسر بولا۔'' میں ٹاک نہیں کرے گا، ہائیڈ کرے گا، بھاگے گا، پھر ہائیڈ کرے گا اور زور سے بھاگے گا۔''

"مگر پاکستان میں ہائیڈ کرنے یا چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی،" کسی اور نے کہا۔ سچ بھی تھا، حملہ کرنے والے جہاز سب کی نگاہ میں ہوتے ہیں۔ ہوا میں کھلا ہوا پیراشوٹ کس کو نہیں دکھائی دے گا۔ اگر فوجیوں سے کہیں دور گرے تو عوام سے بچنا تقریباً ناممکن۔ گویا کہ کہیں پناہ کا کوئی امکان ہی نہیں۔ کثیر التعداد پاکستانیوں سے کسی طرح کی امید اپنی جگہ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے بے وقوف برتاؤ کے مقابلے میں وہاں کے ہندوؤں سے کسی طرح کی امداد کا تصور ہی بے معنی تھا۔

دشمن کی قید بڑی ہی توہین آمیز اور ذلیل کرنے والی ہوتی ہے اس لیے جو بھی جسمانی طور پر صحت مند ہوتا ہے قید سے بھاگنے کے بارے میں ضرور سوچتا ہے، بلکہ ایسا کرنا جنگ کا توسیع شدہ عمل ہی سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرح سے دشمن کو چنوتی، وہ بھی اسی کی سرزمین پر اور اسی کی قید میں۔ ہاں ناکامی کی قیمت ذرا زیادہ ہوتی ہے، زیادہ تر موت۔ لیکن کامیابی کا انبساط بھی کافی راحت بخش اور شگفتگی دینے والا ہو سکتا ہے۔ جیسے کسی خطرناک کھیل میں جیت، جیسے ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ کر پرچم لہرانا۔ جیسے "شارک" سے لڑ کر بچ نکلنا۔ دنیا کی تمام فوجوں میں ایسے بہت سے جانباز ہوتے ہیں جنھیں دشمن کی جیل میں گھٹن برداشت نہیں ہو سکتی اور ایسے لوگ جو خطرے بھری چنوتیوں سے پیچھے نہیں ہٹ پاتے۔

ملند بھی ایسا ہی باہمت افسر تھا۔ کبھی کبھی اُتاولے پن کا شکار ضرور ہو جاتا تھا لیکن زیادہ تر سوچ سمجھ کر خطرے اٹھاتا تھا۔ ایک دن جب ایسی باتیں ہو رہی تھیں، تو ملند میز پر ہاتھ مار کر بولا، "اگر میں پاکستان میں قید ہوا یا وہاں مرنے کی امید ہوئی تو جیل سے فرار ضرور اختیار کروں گا۔ میں کسی دشمن کی جیل میں سڑوں گا نہیں بلکہ کسی نہ کسی طرح قید سے نکلوں گا ضرور۔" وکرم کو کوئی شک نہیں تھا کہ ایسی حالت میں ملند ضرور ایسا ہی کرے گا۔

اور اب جیل کی فرش پر پڑے وکرم نے کہا، "اگر کوئی خطرے سے بھرا کام کرنے کی ہمت ہے تو اس کے لیے مضبوط ارادہ کرنا ہوگا اور جس مقصد کے لیے ارادہ کر لیا جائے تو اسے اکثر حاصل بھی کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح ملند! کبھی کبھی بہت بڑی کامیابی ہاتھ لگ جاتی ہے۔"

وکرم نے تفصیل سے کچھ نہیں کہا۔ اس دلیر اور ذہین نوجوان کو متحرک کرنے کے پیچھے وکرم کی اپنی سوچ تھی۔ آنے والے وقت میں ایک باہمت سردار تخلیق کرنے کا خواب تھا۔

—

باب چودہ

آزادی کی پکار

(جیل سے فرار-2)

اپنے گھر خاندان میں واپس لوٹنے کی آرزوؤں اور امیدوں میں تین ماہ گذر گئے۔ موسمِ سرما اپنے آخری مرحلے طے کر رہا تھا۔ دھوپ اب صرف صبح کے وقت ہی مزے دار لگتی تھی۔ ایک طرح کی اداسی اور ناامیدی میں دن کٹ رہے تھے۔ ملند اور گیری زیادہ تر کسی کونے میں بیٹھے کانا پھوسی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ سب کو احساس تھا کہ جیل سے نکلنے کی تدبیریں تلاش کی جا رہی ہیں۔ تینوں ممالک کے درمیان شاطرانہ پینترے بازیاں چل رہی تھیں۔ کسی بھی طرح کے سمجھوتے کی امیدیں کمزور پڑتی دکھائی دے رہی تھیں، ادھر تمام قیدیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ جیل کی گھٹن سبھی کو اس طرح کچوٹ رہی تھی گویا کوئی کیڑا اندر ہی اندر ان کے کلیجے کو چال رہا ہو۔ ایک روز بات کرتے کرتے دونوں اٹھے اور وکرم کے پاس جا بیٹھے۔

''سر! یہاں سے نکلنے کا پلان فائنل ہی کرنا ہوگا،'' ملند نے کسی ایسے بچے کی طرح کہا جسے ایک زمانے سے اپنی پسندیدہ چاکلیٹ سے دور رہنا پڑا ہو۔ ''اس چہار دیواری کے اندر آدھے راشن، بھوک اور بوریت میں ہمیں بوڑھا نہیں ہونا ہے۔''

وکرم یہ سوچ کر مسکرایا کہ ملند اور گیری کو ہر لمحہ کوئی نہ کوئی ذہنی یا جسمانی مصروفیت چاہیے تھی،

خالی بیٹھنا ان کی فطرت میں نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ جیل سے بھاگنا ان کی اہم ضرورت بن چکا ہے۔

''اچھا تو شروع کیا جائے،'' وکرم نے کہا۔ ''یہاں سے نکلنے کی کیا تدبیر سوچی ہے؟''

''یہاں سے تو نکل ہی لیں گے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم پاکستانی پنجاب کے گھنے علاقے میں ہیں۔ باہر نکلتے ہی دھر لیے جانے کا ڈر ہے۔ سندھ یا اتر کے پہاڑی علاقوں میں بہت سی آسانیاں مل سکتی ہیں مگر وہاں پہنچا کیسے جائے؟'' گیری نے کہا۔

''دوسرے رہنمائی کے لیے نقشے وغیرہ تو ہمارے پاس ہیں نہیں۔ راستہ وغیرہ تلاش کرنے میں ہمیں ان سے کچھ مدد تو مل ہی سکتی تھی،'' ملند نے دوسرا مسئلہ سامنے رکھا۔ ''ہمیں یہاں سے ہر طرف جانے والی سڑکوں، ریل لائنوں، ندیوں اور آس پاس کے پہاڑوں وغیرہ کے بارے میں تفصیلی جانکاری چاہیے۔ ایسا کوئی نقشہ ضرور چاہیے جو ''ٹریکنگ'' پر جانے والے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔''

''ارے ملند حوصلہ رکھو،'' وکرم بولے۔ ''جیل انتظامیہ نے ہمیں پڑھنے کے لیے کتابیں وغیرہ مہیا کرانے کا وعدہ تو کر ہی لیا ہے۔ تم دیکھ لینا یہ سب انگریزوں کے زمانے کی کتابیں ہوں گی جو ایک زمانے سے ان کی یونٹ کی لائبریری میں قید پڑی ہوں گی۔ ناول، خود نوشت اور تاریخ سے متعلق کتابیں تو ہوں گی ہی، بس دعا کرو کہ غلطی سے کوئی جغرافیہ کی کتاب یا کسی سیاح کا لکھا ہوا سفر نامہ ہاتھ لگ جائے۔ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی سرپھرا انگریز ان علاقوں میں پیدل ضرور گھوما ہوگا اور بعد میں مع نقشہ و تصاویر سفر نامہ بھی لکھ کر ضرور چھوڑ گیا ہوگا اگلی نسلوں کے لیے۔ ویسے سوچنے کی بات یہ ہے کہ کسی ہندوستانی نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔ ماضی میں یہاں کیا کیا تھا، کیسے کیسے واقعات پیش آئے۔ یہ سب جاننے کے لیے ہمیں آج بھی ''ہوین سانگ'' اور ''ابن بطوطہ'' کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس کے لیے کوئی رام سیوک یا اللہ بخش نظر نہیں آتا۔''

''سر! اس کا مطلب ہے ایسی کوئی کتاب یا کسی سیاح کی ڈائری ہمارے ہاتھ لگنا ضروری ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ راولپنڈی جیسے پرانے ملٹری اسٹیشن میں کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا،'' گیری نے جلدی سے بیچ میں کہا۔ اسے معلوم تھا کہ اپنے ہم وطنوں کی کوئی بھی کمی علم میں آتے ہی وکرم کی تقریر شروع ہو جاتی ہے۔

''ہاں اب یہ آپ لوگوں پر ہے کہ کس طرح نصیر یا نقوی سے ایسی کتابیں حاصل کر پاتے ہیں،'' وکرم نے کہا۔

اسکواڈرن لیڈر نصیرالدین اس وقت ہندوستانی قیدیوں کے کیمپ انچارج تھے۔ وہ بھلے انسان تھے ہاں تھوڑے سے شیخی ضرور تھے۔ ان کی شیخی اور بڑبولے پن کو تھوڑی سی ہوا دے کر ان سے کچھ بھی نکلوایا جاسکتا تھا۔ آتے ہی انھوں نے کتابیں مہیا کرانے کا وعدہ کیا تھا، اور ڈھیر سارے انگریزی ناول، سوانحی خاکے، خودنوشتیں، کہانیوں اور افسانوں کے مجموعے نیز شکار اور کھیل سے متعلق کچھ کتابیں لاکر انھوں نے دی بھی تھیں۔ اگلی بار جب وہ تشریف لائے تو ملند اور گیری نے ان کی تعریف کے پل باندھنا شروع کردیے کہ کس طرح ان کے چارج میں قیدیوں کی بوریت اور وقت گذاری کا مسئلہ آسان ہوگیا تھا۔ نصیر صاحب تعریف سے پھولے جارہے تھے۔

ملند نے بڑی مٹھاس سے کہا، ''سر ہم اس علاقے اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ خاص طور پر آپ کے این ڈبلیو ایف پی کے علاقے کے بارے میں۔ ہماری نسل کے لوگوں نے تو ان پٹھان، بلوچی اور پختون لوگوں کو دیکھا ہی نہیں صرف ان کے طنزیہ، میرا مطلب ہنسی مذاق والے چہرے اور ڈائیلاگ ہی فلموں میں دیکھے اور سنے ہیں۔ اس لیے اگر آپ کی لائبریری میں یہاں کے قبائلیوں اور ان کے دشوار گذار علاقوں سے متعلق کچھ کتابیں ہوں تو پڑھنے کا موقع ضرور دیں۔ ویسے ہم نے سنا ہے کہ یہ سارے قبائلی اسی طرح رائفل لے کر چلتے ہیں جیسے ہمارے گاؤں میں لوگ لاٹھی یا ڈنڈا لے کر گھروں سے نکلنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی سن رکھا ہے کہ رائفل یا بندوق جیسے اسلحے اور کارتوس ان علاقوں میں وزن کے حساب سے تول کر بیچے جاتے ہیں۔''

''جی ہاں! یہ لوگ تو بالکل آزاد اور اپنی مرضی کے مالک ہیں،'' نصیر بولے۔ ''ان علاقوں میں جب تک آپ تارکول کی پکی سڑک پر ہیں تب تک محفوظ، سڑک چھوڑی نہیں کہ اللہ حافظ، یہ لوگ فائر پہلے کرتے ہیں کسی طرح کی پوچھ تاچھ بعد میں۔ ان پر کسی ملک کا قانون بے اثر۔ یہ ہمیشہ اپنے ہی وضع کردہ قاعدے قانون مانتے ہیں۔''

''یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے،'' گیری نے کہا۔ ''سر! واقعی ان لوگوں کے بارے میں جانکاری بڑی ہی دلچسپ ہوگی۔ اب ان سب سے متعلق کتابیں آپ ہمیں ضرور لاکر دیجیے خاص طور سے ایسے کسی مصنف کی کتاب جو خود شمال مغرب کے اس علاقے میں گھوما پھرا ہو اور سب کچھ اس کا اپنی آنکھوں دیکھا بھالا ہو۔''

اس طرح ایک ہفتے کے اندر" چارلس ڈکسن"،" ٹامس ہارڈی" اور" جین آسٹن" وغیرہ کی کتابوں کے بیچ چھپی ہوئی ایک کتاب" مریز ٹریول بک آن انڈیا، برما اینڈ سیلون" ہندوستانی قیدیوں کے ہاتھ آ گئی۔ یہ کافی پرانی کتاب تھی اور انگریزوں کے جانے کے بعد شاید ہی کبھی کھلی ہو۔ لیکن ملند اور گیری کے لیے انمول تھی۔ مرے نامی انگریز کی لکھی اس کتاب میں ہندوستان، برما اور سری لنکا کے پیدل دورے کی داستان لکھی ہوئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ نقشوں کے ذریعے ندی پہاڑ شہر آبادی سڑکیں اور ریل لائنیں دکھائی گئی تھیں سیدھے درّۂ خیبر تک۔ درّۂ خیبر یعنی عہد وسطیٰ میں ہندوستان آنے کا راستہ، جواب افغانستان ہے لیکن ملند اور گیری کے لیے اس وقت آزادی کی راہ......

ملند اور گیری کے ساتھ ساتھ ہیری بھی اس کتاب کا بڑے ہی غور سے مطالعہ کر رہے تھے۔ ایک دن انھوں نے کہا،" ہم لوگوں کو پنجاب کے راستے ہندوستان نہیں جانا چاہیے، یہ راستہ خطرناک ہو سکتا ہے۔" ہیری نے بغیر کسی دعوت کے ہی اپنے آپ کو ملند اور گیری کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔ جیل سے فرار ہونے کی گفتگو میں وہ اس طرح حصہ لیتے تھے جیسے شروع سے یہ انھیں کی تجویز رہی ہو۔

"روٹ" یعنی راستے کی بات آتے ہی گیری نے کہا،" مگر پنجاب ہو کر ہی راستہ سب سے چھوٹا ہوگا۔ ہمیں دکن اور پورب کی سمت میں جانے والی ریلوے لائن پکڑنی ہوگی۔ دن چھپتے چھپاتے رات بھر چلتے رہیں تو لاہور اور وہاں سے واگھا یا قصور پہنچ سکتے ہیں۔ سرحد پار کرنا مشکل ہوگا مگر ہندوستانی فوج بھی بہت نزدیک ہوگی۔"

"بڑے ہوشیار ہو گیری!" ہیری نے تنک کر کہا۔" ہم خراماں خراماں تین چار رات ٹہلتے ہوئے ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتے رہیں گے اور ادھر سارا پاکستان ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا۔ دوسری طرف ہم سرحد کے آس پاس پاکستان کی فوج سے بچتے بچاتے ایک دم سے اپنے سکھ یا گورکھا سپاہیوں کے سامنے وارد ہو جائیں گے اور ہمیں ان کپڑوں میں دیکھ کر فوراً مشین گنوں سے ہمارا استقبال کیا جائے گا۔ گیری تم نہایت صبر اور مسرت سے اپنی مادر وطن کی مٹی میں دم توڑنا۔ میں نہیں۔ میں تو جاؤں گا پیشاور کے ہی راستے۔"

راستہ دکن اور پورب کا ہوگا کہ شمال مغرب کا، اس پر کئی دن بحث جاری رہی۔ ملند اور گیری

نے سمجھانے بجھانے کی بہت کوشش کی مگر ہیری اپنی بات پر اڑے رہے۔

دیکھو ہیری، ملند نے شاید ہزارویں بار اپنی بات دہراتے ہوئے کہا، ''لاہور یا قصور کی طرف کا راستہ سب سے چھوٹا ہے اور سب سے چھوٹے ''روٹ'' کا مطلب ہے سب سے کم وقت میں گرفتاری بھی اور وطن واپسی بھی۔''

نہیں میں پنجاب کے راستے ہرگز نہ جاؤں گا۔ ہیری نے صاف کہہ دیا۔

''لگتا ہے یہ جانا ہی نہیں چاہتا،'' گیری نے کہا۔ ''ڈرتا ہے۔''

ہیری اچھل کر کھڑے ہوگئے اور طیش میں بولے، ''ایک بات کا دھیان رکھنا اگر یہاں سے بھاگنے کا موقع ملا تو میں ضرور نکلوں گا۔ بلکہ یہ جیل توڑ کر آپ سب سے پہلے نکلوں گا، مگر میں پنجاب کے راستے قطعی نہیں جاؤں گا۔''

بڑے صبر سے ملند نے ہیری کو سمجھایا، جرح کے علاوہ درخواست اور التجا بھی کی۔ چیخا اور چلّایا بھی لیکن ہیری نہ تو ٹس سے مس ہوا اور نہ ہی اس نے کوئی دلیل ہی پیش کی۔ ملند آخر کار سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دو دن اسی بے حسی میں نکل گئے۔

وکرم کو بڑا تعجب تھا، جیل سے فرار اختیار کرنے کے مضبوط ارادے پر بھی اور پنجاب کے راستے کی سخت مخالفت پر بھی۔ ملند اور گیری ہٹے کٹے تندرست جوان تھے جب کہ ہیری دبلے پتلے ہونے کے ساتھ ساتھ اتنے پستہ قد تھے کہ اگر ایک آدھ سینٹی میٹر کی کمی اور رہ گئی ہوتی تو ایئر فورس میں بھرتی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ وزن میں اتنے ہلکے کہ اکثر گیری انھیں دوران ورزش اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر آنگن کے دو چار چکر لگا لیا کرتے تھے۔ ہیری کے چہرے پر کبھی مایوسی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کوئی کام کر رہے ہوں، کیسی بھی بات چل رہی ہو ایک ہلکی سی مسکان ان کے چہرے پر ہمیشہ براجمان رہتی تھی۔ اگر کبھی کوئی معاملہ پھنس جاتا تو دو چار طنز کے تیر خود پر چلا کر سب کو ہنسنے کا موقع فراہم کر دیتے اور بڑی سے بڑی گتھی لمحوں میں سلجھ جاتی۔ ظاہر طور پر ان کی زندگی کا یہ مست مولی طرز ایک ایسے پردے کی طرح تھا جس کے پیچھے چھپی ہوئی تھی ہیری کی بصیرت، ان کی صلاحیت، ان کی سنجیدہ فکر اور ایک عجیب قسم کا حوصلہ جس کا انحصار جسمانی طاقت پر نہیں ہوتا۔

وکرم پہلی بار اس سے پاکستان کی اسی جیل میں ہی ملا تھا اور جیسے جیسے اسے سمجھتا جا رہا تھا اس

کے دل میں ہیری کے لیے عزت اور محبت بڑھتی جارہی تھی۔ مگر ہیری کا یہ اڑیل رویہ اس کے بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ''ہیری! آخر تم پنجاب کے راستے کیوں نہیں جانا چاہتے؟ کم سے کم اس وقت تو اختیارات کے سارے دروازے کھلے رہنے چاہیے تا کہ چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی تجزیہ کیا جا سکے۔''

ہیری کی مسکراہٹ برقرار رہی، ہاں ان کی سگریٹ کے کش لینے کی رفتار ضرور کچھ تیز ہوگئی۔ وہ یکا یک وکرم کو پکڑ کر الگ لے گئے اور کان میں دھیرے سے بولے، ''سر، آپ جانتے ہیں کہ پنجاب کے راستے سے جانے میں ہمیں ایک بڑا دریا اور کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں پار کرنی ہوں گی۔''

''ہاں تو؟'' وکرم نے بیچ ہی میں پوچھا۔

''سر! مجھے تیرنا نہیں آتا۔'' ہیری نے کہا اور پھر تیزی سے سگریٹ کے کش لینے لگا۔ وکرم بھنویں چڑھا کر ہیری کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ اتنی بحث وتکرار، اتنا من مٹاؤ صرف اس لیے کہ ہیری کو تیرنا نہیں آتا؟ اتنی چھوٹی سی بات؟ پھر ہیری کے کردار کی روشنی میں وکرم نے جیسے ہی اس پورے معاملے کو دیکھا اپنے آپ زور سے ہنس پڑا۔ ہیری کے ساتھ کھڑے وکرم کو اس طرح قہقہہ لگاتے دیکھ کر سبھی کو حیرانی ہوئی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

''ملند! پنجاب روٹ تم نہیں لے سکتے؛'' وکرم نے ہنستے ہنستے ہی کہا۔ ''دراصل ہیری نے ایسی دلیل دے دی ہے کہ بحث کی اب کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ اب ہمیں پیشاور روٹ ہی اختیار کرنا ہوگا۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں،'' ملند بولا۔ ''آخر اس نے ایسی کون سی وجہ بتا دی کہ آپ نے آخری فیصلہ سنا دیا۔''

ایک معمولی سی بات ملند۔ ہیری کو تمھارے ساتھ ہی جانا ہے۔ مگر اس بیچارے کی مجبوری ہے کہ اسے تیرنا نہیں آتا۔

سب زور سے ہنسے۔ ''کیا گلگلی ماری ہے کمبخت نے؛'' گیری نے کہا۔ ''مگر اس کو ہمارے ساتھ آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کی وجہ سے ہم ابھی سے اپنے راستے بند کرلیں؟''

''نہیں گیری بوائے میں تمھارے ساتھ ہی نہیں بلکہ تم سے آگے ہی چلوں گا،'' اور وکرم کی

طرف مڑتے ہوئے ہیری پھر بولا۔ ''سر! اگر یہ لوگ مجھے ساتھ نہیں لے جاتے تو ''ٹیم اسپرٹ'' کا کیا ہوگا؟ باہمی تعاون اور آپسی تال میل کے کیا معنی ہوں گے؟''

''ٹیم اسپرٹ کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ ہم ساری کی ساری ٹیم کو جہنم میں ڈھکیلنے کے لیے ایک معذور انسان کے حوالے کر دیں،'' گیری بھی کم اڑیل نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

کیمی نے دھیرے سے پوچھا، ''تمھیں معلوم ہے کہ بڑے دریا دوسرے روٹ پر نہیں ہیں؟ تم نے سفر سے متعلق نقشے غور سے دیکھے ہیں؟''

''نقشے چھوڑیے،'' ہیری نے جواب دیا۔ ''سب بتاتے ہیں کہ اتر پچھمی علاقہ بالکل سوکھا ہوا ہے۔ وہاں پینے تک کا پانی آسانی سے نہیں ملتا۔''

''ہیری،'' کیمی نے آہستہ سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ یہاں سے پیشاور کے درمیان ہی آپ انڈس ندی میں غوطے لگا رہے ہوں یا اس کی تہہ میں پڑے بڑے بڑے پتھروں سے سر ٹکرا رہے ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ پنجاب کی جھیلم، چناب اور راوی کی تہہ میں صرف ریت ہے جہاں تکلیف کم اٹھانی پڑے گی۔ مگر کوئی بھی راستہ اپناؤ آخری ٹھکانہ بحر عرب ہی ہے۔''

کیمی کی بات پر سبھی ہنس دیے۔ پھر ملند نے دوستانہ لہجے میں کہا، ''ہیری یار چلو تم ساتھ ہی چلو تمھیں دریا پار کرانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ ہی لیا جائے گا۔ پریشان مت ہو سب تیاری کرو۔''

''ملند مجھے تم پر تو پورا بھروسا ہے مگر گیری؟ یہ تو مجھے منجدھار میں ہی چھوڑ دے گا۔ ادھر میں ڈوب رہا ہوں گا ادھر یہ کھڑا ہنس رہا ہوگا۔ میرے پوری طرح ڈوب جانے پر ہی اسے تسلی ہوگی۔'' ہیری بولے۔

اب گیری کی باری تھی وہ بولے، ''ہیری! میں برا آدمی تو ہوں مگر اتنا گیا گذرا انسان نہیں ہوں۔ ہندوستان پہنچتے ہی سیدھے میں تمھارے گھر جاؤں گا اور تمھارے خاندان والوں سے مل کر بتاؤں گا کہ کس بہادری کے ساتھ تم نے اس دنیا سے کوچ کیا ہے۔ تکلیف تو ہوگی لیکن تمھاری بہادری اور جانبازی کے قصے سن کر انھیں تسلی ضرور ہوگی۔ تمھاری کبھی نہ ختم ہونے والی غیر موجودگی میں میں والدین کے تئیں تمھارے فرائض بھی نبھانے کی پوری کوشش کروں گا اور ہاں تم نے جس طرح یہ فرائض نبھائے ہیں مجھے کوئی خاص مشکل بھی نہیں آنی چاہیے۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ انھیں

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

گیری نے یہ مذاق ہیری اور اس کے خاندان کے بیچ چل رہی کشاکش کے بارے میں کیا تھا۔ کیوں کہ سننے میں آیا تھا کہ بدلتے زمانے کو دیکھتے ہوئے ہیری کے والدین نے اپنی خاندانی روایات سے ہٹ کر بہو ڈھونڈنے میں بیٹے کی رائے جاننے کا بھی فیصلہ کیا۔ اس طرح ہیری سے بار بار پوچھا گیا کہ اس کو کیسی لڑکی پسند ہے، صرف گوری چٹی یا کچھ دبا رنگ بھی چل سکتا ہے؟ قد کیسا ہونا چاہیے؟ انگلش اسپیکنگ اور بال روم ڈانسنگ ضروری ہے یا بھارت ناٹیم کی مہارت سے ہی گاڑی چل سکتی ہے؟ نئے زمانے کی آب و ہوا کو دیکھتے ہوئے کہیں بیوی کے ہاتھ کا پکا کھانا ہی کھانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ ہیری نے اپنے گھر والوں سے بڑی نرم روی کے ساتھ کہہ رکھا تھا کہ یہ کام انھیں کا ہے اور ان کا ہر فیصلہ اسے منظور ہوگا لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ جانے کیسی لڑکی اس کے سر مڑھ دی جائے۔ بہر حال اگلے ہی روز سے رجسٹری کے ذریعے بہت سی لڑکیوں کے فوٹو اور ان کے تعارفی خاکے موصول ہونے لگے۔ تقریباً روز ہی کسی نئی لڑکی کی تصویر اور اس کے عیب و ہنر اس کے سامنے ہوتے۔ ہیری کی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں، اٹھتے بیٹھتے جاگتے سوتے کھاتے پیتے غرض کہ ہر وقت اور ہر جگہ اسے یہی تصویریں نظر آتی رہتی تھیں یہاں تک کہ اب کوئی سلیقے کا خواب دیکھنا بھی اسے میسر نہیں تھا۔ رات کے کسی حصے میں کوئی اسمارٹ سکریٹری ہوتی تو کبھی سجی سجائی چکی پڑی کرنے والی سانولی سی لڑکی۔ ہیری کی ان پریشانیوں کے ساتھ ساتھ اس کی سگریٹ اور شراب بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کو لگنے لگا کہ اب زیادہ دن وہ ان تصوراتی لڑکیوں کو جھیل نہیں پائے گا۔ اس کے لاکھ منع کرنے پر بھی رجسٹریوں کا یہ سلسلہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر ایک رات وِسکی کے سرور میں ہیری نے اپنے والد کو ایک خط تحریر کر ڈالا جس کا لب و لباب یہ تھا کہ وہ خود کوئی فیصلہ کرنے میں قاصر ہے پھر بھی اس سلسلے میں اگر اس کی پسند ناپسند جاننا ہی چاہتے ہیں تو جان لیں کہ اس کی ضرورت صرف ایک انسانی مؤنث سے پوری ہو جائے گی۔

خطوط کا سلسلہ فوراً بند ہو گیا۔ خاندان کی طرف سے زبردست خاموشی۔ بیٹے کی بے باکی سے زخمی والدین کا الگاؤ......... جب تک ہوش آتا ہیری کی زندگی کا ایک باب بند ہو چکا تھا

جیسے ساری کی ساری لڑکیاں اسے ایک ساتھ ہی چھوڑ کر چلی گئی ہوں اور اس کے فوراً بعد ہی جنگ کا بگل بج گیا۔

''تم فکر نہ کرو گیری۔ میں تمہیں اتنے احسان کا موقع دینے والا نہیں۔'' ہیری نے جواب دیا پھر ملند کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک مضبوط رسّی کا انتظام کرتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ تم مجھے کھینچ کر ندی پار کرا لو گے۔ اس گیری کے بچے کو تو میں اپنے پرانے جوتے تک رکھنے کے لیے نہیں دے سکتا کیا معلوم ان سے کیا کیا کام لے۔''

اس ہنسی مذاق اور نوک جھونک سے ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ جیل سے بھاگنے والوں میں بھی تین ہوں گے۔ کچھ تو زخمی ہونے کی وجہ سے جسمانی طور پر معذور تھے اور کچھ دوسرے اتنے باہمت نہیں تھے۔ خود تو ڈرتے ہی تھے ان تینوں کی حوصلہ شکنی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

سب سے پہلے سوچنا تھا کیمپ سے نکلنے کا طریقہ۔ سارے قیدیوں کو کل ملا کر آٹھ کمروں میں رکھا گیا تھا۔ ان میں سات تو نئے لاک اپ تھے۔ چاروں طرف سے مضبوط، کنکریٹ بلنک، لوہے کی سلاخوں والا دروازہ۔ جس کمرے میں وکرم کو رکھا گیا تھا وہ کسی پرانے بنگلے کا حصہ تھا۔ بڑا کمرہ۔ پرانی چوڑی دیواریں اور شاید چونے سے جڑائی کی ہوئی اینٹیں۔ اس کی پچھلی دیوار کے اس پار پاکستان ایئر فورس کے کرونگ آفس کا بڑا میدان تھا۔ میدان کے دوسری طرف ایک چھ فٹ اونچی دیوار اس کے پار کھلی عام سڑک۔ پری نے ایک سویلین ملازم سے بات چیت کے درمیان پتہ لگا لیا تھا کہ کرونگ آفس میں وردی والے گارڈ تعینات نہیں ہوتے تھے۔ غالباً وہاں کوئی ڈھیلا ڈھالا چوکیدار ہی ہوگا جو زیادہ تر یا تو اونگھتا رہتا ہوگا یا بیڑیاں پیتا رہتا ہوگا۔ اس لیے جیل توڑنے کے لیے یہی کمرہ سب سے موزوں رہے گا۔ کمرے سے باہر نکلنے کے لیے کم سے کم 21X15 انچ کا ایک ہول بنانا ضروری ہوگا۔ دیوار کی چوڑائی ڈیڑھ اینٹ یعنی چودہ انچ معلوم ہوتی ہے اس کا سیدھا سا مطلب تھا کہ تقریباً چھپن اینٹیں ڈھیلی کر کے نکالنی ہوں گی۔ اینٹوں کے ساتھ نکلنے والا ملبہ بھی ایک مسئلہ ہوگا۔ لیکن یہ اینٹیں کیسے اور کس طرح ڈھیلی کی جائیں؟

سب نے تلاش شروع کر دی۔ کچھ بڑی کیلیں باتھ روم سے نکالی گئیں کچھ دوسری پرانی دیواروں سے۔ اتفاقاً کوئی تار کا ٹکڑا وغیرہ دکھائی دے گیا تو فوراً جیب میں۔ پری نے تو بجلی ٹھیک

کرنے آئے ایک میکینک کا اسکریوڈرائیور ہی ماردیا۔ جو بعد میں سب سے زیادہ کام آیا۔ یہ سب سے بڑا کمرہ تھا اس لیے دن کی دھوپ یا بارش کے اوقات میں زیادہ تر لوگ یہیں بیٹھتے تھے۔ تاش اور شطرنج وغیرہ بھی یہیں کھیلے جاتے تھے۔ یہاں وکرم کی چارپائی کے علاوہ ایک دوسری کھاٹ اور کچھ کرسیاں بھی اوروں کے بیٹھنے کے لیے رکھی گئی تھیں۔ پورب کی دیوار میں لوہے کی تیلیوں کا دروازہ اور ایک بڑی کھڑکی تھی۔

دن میں کمرے کے اندر ہونے والی چھوٹی سی چھوٹی حرکت بھی باہر سے دیکھی جاسکتی تھی اس لیے دیوار میں شگاف کرنے کا کام رات میں ہی کیا جاسکتا تھا۔ جس کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ ایک دولوگ یہاں رات میں بھی رہنے لگیں اور اس کے لیے اگر نصیرالدین کو راضی ہی کرنا تھا تو کیوں نہ ملند اور کیری کو ہی یہاں منتقل کیا جائے۔

وکرم کی پیٹھ کا پلاسٹر کٹ چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے کچھ ورزش کرنے کی صلاح دے رکھی تھی ایک روز وکرم نے ورزش کے دوران کراہنا اور بعد میں چیخنا چلانا شروع کیا۔ زمین سے اٹھنے کے لیے کسی کی مدد مانگی تو گارڈ نے اندر آکر اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ایسے ڈرامے تقریباً روز ہونے لگے، پھر یہ مانگ کی گئی کہ وکرم کی مدد اور اس کی مالش وغیرہ کے لیے کسی اور بھی ہندوستانی قیدی کا اس کمرے میں ہر وقت ساتھ رہنا ضروری ہے۔ اس طرح ملند نے اپنا تولیہ منجن برش صابن شیونگ کا سامان غرضیکہ اپنا سارا کا سارا اثاثہ لے کر سیل نمبر-5 میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

اتفاق ہی کہیے کہ دو چار روز بعد ہی ایک دن سپولیا کھیلتے وقت ملند کا پیر پھسلا اور وہ زمین پر مور سے گرا۔ زمین پر گرتے ہی ملند اس طرح تڑپنے لگا جیسے اسے کوئی دورہ پڑ گیا ہو۔ ایک پولیس کارپورل فوراً بھاگ کر آیا اور ملند کو اسپتال لے جانے کا انتظام کرنے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اسے ہوش آنے لگا۔ اس طرح اسپتال جانے کی ضرورت تو نہیں رہ گئی لیکن شام ہوتے ہوتے کیری وغیرہ ملند کو اٹھا کر اسی کمرے میں لے آئے اور اس کی تیمارداری میں لگ گئے۔ کیری نے نقوی کو سمجھایا کہ اگر رات میں کسی طرح کی پریشانی ہوئی تو وکرم صاحب اکیلے تو ملند کو سنبھال نہیں پائیں گے اس لیے اس کا ان لوگوں کے ساتھ یہیں رہنا ضروری ہوگا۔ نقوی مان گئے اور اس طرح کیری کا داخلہ بھی اسی خاص کمرے میں ہوگا۔

پاکستانی سیاست میں اس وقت حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ جنرل یحییٰ کی حکومت ختم ہونے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نئے حکمراں کے طور پر ابھرے تھے۔ وہ گھوم گھوم کر اپنی تقریروں سے اس ستم رسیدہ ملک میں پھر سے خود اعتمادی کا احساس جگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے ملک والے چاہتے تھے کہ وہ ہندوستان کے قبضے سے شکرگڑھ وغیرہ کی زمین کے ساتھ اپنے سوا لاکھ قیدی بھی رہا کروالیں۔ سب کی نگاہیں انھیں دو معاملات پر مرکوز تھیں۔ ہر طرف یہی چرچا تھی۔ پاکستان کا مشہور روزنامہ "دی ڈان" بھی اکثر کچھ ایسے ہی اشارے دیتا تھا کہ مندرجہ بالا دونوں معاملات میں جلد ہی کوئی سمجھوتا ہونے والا ہے۔ ایسے ماحول میں پاکستانیوں کی طرف سے ہندوستانی قیدیوں کے لیے کچھ نہ کچھ مراعات اور غفلت فطری تھی۔ جب تک رات میں قیدیوں کی گنتی سہی اترتی رہے انھیں کسی دوسری بات کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح دھیرے دھیرے ایک کمرے میں تین قیدیوں کا ایک ساتھ رہنا سہنا عام بات سمجھی جانے لگی۔

کمرہ نمبر 5 میں وکرم، ملند اور گیری دیر رات تک باتیں کرتے، گارڈ کو احترام سے مخاطب کر کے اس سے جلدی بجلی نہ بجھانے کا اصرار کرتے تاکہ یہ لوگ دیر تک تاش کھیل سکیں اور تو اور یہ تینوں ہرزور نقوی اور پولیس کارپورل سے یہ کہنا کبھی نہ بھولتے کہ اگر ایک چوتھا کھلاڑی بھی میسر ہوتا تو رات کتنے مزے میں گذرتی۔ جیل کے کارکن مطمئن تھے کہ یہ ہندوستانی قیدی یہاں سے بھاگنے والے نہیں ہیں۔ اب یہ آرام کے ساتھ سرکاری سہولت سے ہی واپس جائیں گے اس لیے چوتھے کھلاڑی کے لیے روز روز کی یہ درخواست اوپر تک پہنچائی گئی اور جسے ایک دن منظور تو ہونا ہی تھا۔ پاکستانی ملازمین کی موجودگی میں وکرم نے سبھی کو ایک ایک کر کے اس کمرے میں آنے کے لیے مدعو کیا۔ سانٹھ گانٹھ کے مطابق سبھی نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر وہاں رہنے سے منع کر دیا سوائے ہیری کے۔ جس نے بعد میں بڑے ہی انمنے ڈھنگ سے سیل نمبر پانچ میں آکر رہنا منظور کیا۔

تین خاص لوگ اس کمرے میں آپہنچے تھے۔ ہیری نے ایک دن کہا جب ہم لوگ یہاں سے نکلیں تو ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت ملنا چاہیے تاکہ راولپنڈی سے جس قدر ممکن ہو دور جاسکیں۔ فاصلہ جس قدر زیادہ ہوگا دشمن کے لیے ہمیں ڈھونڈنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔

"تو کیا کرنا چاہیے؟" منوہر نے پوچھا۔

ہمارے جانے کے بعد ہمارے کسی ایک ساتھی کو اس کمرے میں رہنا ہی نہیں بلکہ اسے تھوڑی تھوڑی دیر پر ایسا کچھ نہ کچھ کرتے رہنا پڑے گا جس سے ہماری غیر حاضری کی طرف کسی گارڈ کا دھیان نہ جاسکے۔ کم سے کم صبح ناشتے کے وقت تک۔ ہیری نے سمجھایا۔ فوراً اس کام کے لیے سب سے معقول آدمی کی تلاش شروع ہوئی۔ شیٹی نے ایک دن خود ہی اپنے اوپر یہ ذمے داری لینے کی بات کہہ کر یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ وہ بڑا ہی چست درست اور نڈر قسم کا افسر تھا۔ اس لیے ان تینوں کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کے لیے سبھی نے اسے صحیح پایا۔ اب شیٹی کو اس کمرے میں لانے کے لیے ایک نئی پلاننگ کی گئی۔

نصیر الدین جب اگلی بار قیدیوں کے ساتھ آ کر بیٹھے تو وکرم نے اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے ہی ادھر ادھر جنبش کی اور دھیرے دھیرے کراہنا شروع کیا۔ سبھی ایک ساتھ ہی وکرم کی طرف بڑھے اور ان کی خیریت جاننی چاہی۔ ملند نے موقع پا کر کہا،'' سر جب تک آپ اس ڈھیلی چارپائی پر لیٹے رہیں گے تب تک آپ کا درد ٹھیک ہی نہیں ہو سکتا۔ جب کہ سبھی آپ سے کہتے ہیں کہ اگر یہاں تخت کا انتظام نہیں ہے تو زمین پر ہی لیٹا کیجیے۔''

''نہیں۔ ہرگز نہیں۔ زمین پر یہ رینگتے ہوئے کیڑے میں ہرگز نہیں برداشت کر سکتا،'' وکرم نے کہا۔

''تو آپ کسی ایسی سیل میں جائیے جہاں کی فرش کنکریٹ کی بنی ہو، اس طرح آپ کو ہموار زمین مل جائے گی اور پیٹھ کا درد بھی جاتا رہے گا،'' برٹی نے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے،'' وکرم نے کراہ کر کہا۔'' اگر نصیر صاحب کی اجازت مل جائے تو میں کسی اور سیل میں چلا جاؤں لیکن ذرا باتھ روم سے قریب ہونا چاہیے جیسے یہ کمرہ۔''

''بیشک آپ سیل نمبر ایک میں شفٹ کر لیں،'' نصیر بولے۔

اسی رات وکرم سیل ایک میں اور شیٹی سیل نمبر پانچ میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح پوری ٹیم کو ایک کمرے میں اکٹھا ہونے میں بیس روز لگ گئے۔

اب اگلا قدم کیا ہوگا اس پر نگاہ ڈالنا ضروری تھا۔ آپسی بحث و مباحثے کے بعد طے پایا گیا کہ تین لوگوں کے لیے سویلین کپڑوں کے علاوہ کم سے کم تین چار دنوں کا راشن اور پاکستانی کرنسی

میں کچھ رقم کا بندوبست ہونا ضروری تھا۔ پہلی دو ضرورتوں پر تو غور کرنا ہوگا لیکن تیسری ضرورت یعنی نقد رقم کے لیے شاید فوراً بھی کچھ کیا جا سکتا تھا۔ پاکستانی سرکار نے ہر قیدی کو ساٹھ روپے فی ماہ بھتہ دینا منظور کیا تھا اور اس روپے سے یہ لوگ اپنی روزمرّہ کی ضرورتوں کے سامان جیسے تیل، صابن، سگریٹ اور پیسٹ وغیرہ منگا سکتے تھے۔ ضرورت کے حساب سے نقوی ہی سب کے لیے سامان لایا کرتے تھے اور روپے پیسے کا حساب بھی انھیں کے پاس رہتا تھا۔ اس طرح قیدیوں نے کچھ نہ کچھ نقدی حاصل کرنے کی گنجائش تلاش کر لی تھی۔

ایک دن جب کچھ سامان لے کر نقوی آئے تو ملند نے کہا، ''نقوی صاحب! دیکھیے ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہماری ضرورت کی سبھی چیزیں آپ ہمیں مہیا کراتے ہیں یہاں تک کہ سگریٹ نوشوں کو سگریٹ تک کی کوئی کمی نہیں ہے۔ پھر بھی آپ کو ان اخراجات کے لیے ہمارے الگ ناموں سے فنڈ تو ملتا ہی ہوگا۔''

''م......م...... میں بتا چکا ہوں ک......ک...... کہ ساٹھ روپیہ ملتا ہے،'' نقوی صاحب بولے۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ میرا جو جی چاہے ساٹھ روپے میں منگاؤں؟'' ملند نے کہا، ''جیسے کہ اگر میں آفٹر شیو لوشن استعمال کرنا چاہوں تو؟''

''آ......آ...... آپ قید میں ہیں نہ کہ م...... م......میس میں،'' نقوی بولے۔

''نقوی صاحب،'' برٹی نے واضح کیا، ''بات یہ ہے کہ اگر یہ ساٹھ روپے میرے نام کے ہیں تو مجھے حق ہونا چاہیے کہ میں انھیں اپنی مرضی سے خرچ بھی کر سکوں۔''

''ب......ب...... بالکل ٹھیک ہے،'' نقوی صاحب راضی ہو گئے۔

''بالکل نقوی صاحب،'' سنتنا زور دے کر بولے۔ جیسے مجھے دیکھیے میں سگریٹ نہیں پیتا ہوں۔ میں کہہ کہہ کے ہار چکا ہوں کہ مجھے داڑھی کا ''فکسو'' چاہیے مگر آپ کبھی سنتے ہی نہیں۔ دوسری طرف وکرم صاحب کو روز تین تین پیکٹ سگریٹ تھما دیتے ہیں شاید میرے ہی پیسوں سے۔''

سکھ کی داڑھی چپکانے والی اس فکسو کا ذکر آتے ہی نقوی ہنس کر بولے، ''م......م...... میں کیا کروں؟ ف......ف...... فکسو اس ملک میں بنتا ہی نہیں۔''

اب منوہر بول پڑے، "میں سگریٹ نہیں پیتا نقوی صاحب۔ تو میں اپنے بھتّے سے انڈے اور بسکیٹ کیوں نہیں منگوا سکتا؟"

نقوی ہندوستانی قیدیوں میں ذاتی لالچ اور آپسی جلن اور حسد کی جھلک دیکھ کر کافی خوش ہوئے اور بولے "م......م......میں نے س......س......سوچا کہ سارا پیسہ سبھی کے کام آتا رہے گا۔ ل......ل......لیکن اگر آپ بھی چ......چ......چاہتے ہیں تو آج سے سب کے کھاتے الگ الگ رکھوں گا۔"

"کھاتے آپ کیوں الگ رکھیں گے؟" برٹی نے کہا۔ "آپ خود کو پریشان نہ کریں بلکہ آپ سیدھے سیدھے روپیہ ہمیں دے دیا کریں۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوگی آپ کو اس کا پیسہ دے کر ہم منگالیا کریں گے۔ حساب کتاب سب ختم۔ اور دیکھیے میرا خرچ بیس روپیہ فی ماہ سے زیادہ نہیں ہے اس لیے میں اپنے روپئے بچاؤں گا۔ کوئی دوسرا کیوں میرے روپئے سگریٹوں میں پھونکے؟"

"میرا بھتّہ بھی میرے ہاتھوں میں آنا چاہیے،" منوہر نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "باری باری سب نے ایک ہی بات دہرائی، کسی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کیا معلوم ان کا پیسہ کہاں جا رہا تھا۔" نقوی جیسے شریف اور ایماندار انسان کو یہ بات کھل گئی وہ ذرا طیش میں آکر جب بولے تو ان کی ہکلاہٹ میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔

"آ......آ......آ......آپ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھیے۔" اس کے بعد وکرم اور نیکی کی طرف مڑ کر کہنے لگے، "ن......ن......ن......نقصان آپ ہی کا ہے۔ جس قدر سگریٹ پیتے ہیں ایک دن پ......پ......پ......پاخانے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے صابن نصیب نہ ہوگا۔"

اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو نقوی سب کا سامان ہی نہیں لائے بلکہ حساب سمجھا کر سب کو بچے ہوئے پیسے بھی نقد دے کر گئے۔ سب ملا کر تین سو روپئے بچے تھے۔ منوہر نے حساب لگایا کہ اگر جیل سے بھاگنے کی تیاریوں میں دو مہینے بھی لگے تو تینوں کے پاس کم سے کم دو دو سو کی رقم تو ہو ہی جائے گی۔ جو بہت زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ سب سے کہا گیا کہ پیسہ خرچ نہ کریں بلکہ ہو سکے تو اور بچائیں۔ وکرم نے اپنی الگ اسکیم بنائی۔ وہ سگریٹ کے بارے میں نقوی کے جملے بھولا نہیں تھا۔ اس لیے اگلی بار جب نصیر اور نقوی ساتھ ساتھ آئے تو وکرم نے کہا، "نصیر صاحب آدتیہ کے کھانسنے

پر اس کے منہ سے خون آتا ہے اور آپ کے ڈاکٹر ہیں کہ کہتے ہیں کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔"

"میں نے رپورٹ دیکھی ہے،" نصیر بولے۔" آرام کریں، کھائیں پئیں بس ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"کیا کھائیں پئیں؟" وکرم نے کہا۔" آپ جو راشن دیتے ہیں اس سے پیٹ ہی کہاں بھرتا ہے؟ خیر آپ میرے بھتیجے سے آدتیہ کے لیے روز ایک انڈا منگوا دیجیے۔ کافی کچھ یہ اپنے پیسوں سے بھی منگوا لیتا ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی،" نصیر نے کہا۔

"مگر آپ کی سگریٹ؟" نقوی نے وکرم کی سگریٹ سے متعلق فضول خرچی کی طرف اشارہ کیا۔ وکرم اس وقت بھی سگریٹ پی رہا تھا۔

"سگریٹ؟ یہ — دیکھیے — یہ گئی۔" آدھی سے زیادہ بچی ہوئی سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے وکرم نے اپنی بات پوری کی۔" سگریٹ پینا اسی وقت سے ختم۔"

نصیر اور نقوی دونوں ہی وکرم کی طرف غور سے دیکھتے رہے۔ سگریٹ نوشی ترک کرنا آسان نہیں ہوتا وہ بھی جب کوئی کسی جیل میں الجھن بھرے شب و روز گذار رہا ہو۔ ہندوستانیوں میں کسی کو اس بات پر کوئی شک نہیں تھا کہ وکرم واقعی سگریٹ چھوڑ چکا ہے۔ کیوں کہ سبھی جانتے تھے کہ اگر وکرم نے سنجیدگی سے کوئی اعلان کر دیا تو اس پر عمل بھی ضرور ہوگا۔ لیکن اس فوری فیصلے کی وجوہات کے بارے میں سبھی کشمکش کے شکار ضرور تھے اور وکرم؟ وہ صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ اپنے کسی ساتھی کی مدد کے لیے وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی دوسروں کو بچت کے لیے تنبیہ یا ہدایت کرتے وقت وہ خود اپنے ساتھ کیا کیا کر سکتا ہے۔ ویسے دل ہی دل میں وکرم نے اپنے آپ سے صرف اتنا ہی کہا کہ — کمبخت سگریٹ بہت بڑھ بھی رہی تھی۔

اگلی مشکل پر غور کرتے ہوئے کیمی نے کہا۔" یہاں سے نکلتے وقت یہ لوگ کپڑے کون سے پہنیں گے؟ پاکستانی ایئر فورس کی یہ بدرنگ وردیاں اور کینوس کے جوتے تو فوراً سارا راز ہی کھول کر رکھ دیں گے۔ یہاں کے عوام کے بیچ گم ہونے کے لیے تو لمبی قمیص شلوار اور مقامی جوتی چاہیے مگر کیسے اور کہاں سے؟"

سنتا کچھ یاد کر کے بولے،" ارے وہ ریڈ کراس پارسل میں جو کپڑے آئے تھے؟" سنتا کا دھیان چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوب جاتا ہے۔ یہ اور بات کہ زندگی میں کوئی بھی مسئلہ ان سے حل نہ ہو سکا ہو۔

سب کو یاد آیا کہ تقریباً دو مہینے پہلے ایک دن نقوی پاکستانی گارڈس سے کچھ پیک ڈبے اٹھوا کر اس کمرے تک لے آئے تھے۔ دراصل یہ ریڈ کراس کے ذریعے قیدیوں کے لیے ہندوستان سے بھیجا ہوا کچھ سامان تھا۔ بغیر کسی تاخیر کے جلدی جلدی ڈبے کھولے گئے ان میں زیادہ تر نہانے دھونے سے متعلق سامان ہی تھا۔ بنیائیں، انڈرویئرس، ہوائی چپلیں اور ڈھیر سارے کینوس کے جوتے۔ ان کے علاوہ گیتا اور بائبل کے نسخے بھی تھے۔ کھانے پینے کا کوئی سامان نہ پا کر قیدیوں میں ایک طرح کی مایوسی بھی ابھری لیکن یہ جو کچھ بھی تھا سامان نہیں تھا بلکہ یہ تھا اپنے ہم وطنوں کی محبتوں اور ان کے خلوص کی علامت۔ دوسرے اتنا ہی بھیجنے کے لیے ہندوستان کے ڈپلومیٹک سیاست دانوں کو جنیوا اور نیویارک جیسے جانے کتنے سمجھوتوں کا حوالہ دیتے ہوئے کس قدر بحث اور مباحثوں سے گذرنا پڑا ہوگا اور کتنی جدوجہد کرنی پڑی ہوگی۔

اتنے میں پرسی نے ایک پلاسٹک کی تھیلی نکالی جس میں ایک نیلا گرم سوٹ، ٹائی اور دو عدد ٹیرالین کی قمیصیں تھیں۔ "یہ کیا؟" پرسی نے پوچھا۔

"یہ میرا سامان ہے،" ملند نے اپنے کپڑے پہچانتے ہی جھپٹ کر اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اسی طرح ایک ایک سوئیٹر برٹی اور منوہر کے لیے بھی آئے تھے۔ وہ تینوں اپنی اپنی چیزیں سینے سے لگا کر تھوڑی دیر کے لیے گھر خاندان کی یادوں میں کھو گئے۔

"ہمارے گھروں سے کچھ نہیں آیا؟" سنتا نے قدرے ناامیدی سے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے کہ ریڈ کراس کے ذریعے سامان آنے کی اطلاع سب کے گھروں تک پہنچ ہی نہ پائی ہو،" گیری نے کہا۔

ملند بولا،" میری بہن بڑی تیز ہے۔ وہ ریڈ کراس والوں کے پیچھے ہی پڑ گئی ہوگی۔ ہوشیار بھی بہت ہے دیکھیے نہ کتنا بڑھیا سوٹ اور ٹائی بھیجی ہے اس نے۔ بیچاری نے سوچا ہوگا کہ پردیس میں بھائی کے پاس سلیقے کے کپڑے تو ہونا ہی چاہیے۔"

اور آج جب وقت فرار کے لیے کپڑوں کی ضرورت پر غور کیا جارہا تھا تو وہ سارے کے سارے کپڑے چارپائی کے نیچے سے دوبارہ نکالے گئے۔ قمیصیں، جرسیاں اور پتلون الگ ڈبوں میں رکھے گئے کیوں کہ یہ آگے کام آنے والے کپڑے تھے۔

جیل کا چپراسی اورنگ زیب بڑا ہی پر خلوص شخص تھا۔ گفتگو میں ماہر اور چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے ہمیشہ تیار۔ اکثر وہ قیدیوں کے لیے بازار سے کباب اور فرنی وغیرہ خرید کر لا دیا کرتا تھا اور خاص بات یہ کہ اسے اس کام کے لیے کسی طرح کی ٹپ یا کمیشن کا لالچ بھی نہیں تھا۔ ڈیوٹی کے علاوہ فالتو اوقات میں اورنگ زیب درزی کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ ملند کو ایک دن دور کی سوجھی اس نے اورنگ زیب سے کہا، ''میاں آپ اس شلوار سوٹ میں بلا کے اسمارٹ لگتے ہیں۔ آپ نے خود ہی سلا ہے؟''

''جی۔ میں اپنے بچوں کے کپڑے خود ہی سلتا ہوں،'' اورنگ زیب نے کہا۔

''ہمارے یہاں اس قسم کی ڈریس نہیں ملتی۔ جب کہ میرا بہت جی کرتا ہے یہ شلوار سوٹ پہننے کا۔ کتنا کپڑا لگتا ہوگا اس میں؟'' ملند نے دریافت کیا۔

''آپ کے لیے سات میٹر۔'' پھر ہیری کی طرف مڑتے ہوئے لمبے تڑنگے اورنگ زیب نے کہا'' لیکن— آپ کے لیے صرف پانچ میٹر ہی۔'' ہیری نے مسکرا کر اورنگ زیب کے اس مذاق کا بھرپور مزہ لیا۔

پرسی نے اورنگ زیب پر زور دینا شروع کیا۔ ملند کا بڑا شوق شلوار سوٹ پہننے کا۔ پتہ نہیں ہم لوگ یہاں سے کب چلے جائیں۔ اگر آپ سل سکیں تو ہماری ملاقات کی یہ ایک یادگار ضرور ساتھ جائے گی۔

اس طرح اورنگ زیب نے ایک ہلکے ہرے رنگ کا شلوار سوٹ بڑی ہی واجب قیمت میں ملند کو دے دیا۔ بے چارے نے اپنی سلائی کے پیسے بھی نہیں لیے۔ اس طرح جیل سے بھاگنے کے لیے ملند کو بالکل صحیح پوشاک میسر ہوگئی تھی۔

اپنی اس حرکت پر ملند کو دکھ کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی ہوئی۔ کیوں کہ اس نے ایک سیدھے سادے انسان سے یہ کام تو کرا لیا تھا مگر جیل سے فرار کے بعد جب یہ راز کھلے گا تو اورنگ

زیب بے چارہ مصیبت میں پڑ جائے گا۔ ملند نے جب یہ بات وکرم کے سامنے رکھی تو وکرم نے اس کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے کہا، "ملند! سیدھے سادے غریب آدمی پر ہی ہمیشہ مار پڑتی ہے۔ وہ چاہے دنگے ہوں، چاہے جنگ ہو یا پھر جیل سے بھاگنا۔ تم اپنا کام کرو۔ اس وقت صحیح اور غلط کا فیصلہ اوپر والے پر چھوڑ دو۔"

"بلاوجہ کی نرمی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" کیمی بڑے ہی پرجوش لہجے میں بولے۔ "آپ سب اس بات کو دھیان میں رکھیں کہ یہ سب دشمن ہیں۔ آپ صرف اپنا کام کریں ان میں سے کون کیا بھوگتا ہے اس سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔"

کیمی ویسے بھی بیچ کا راستہ قطعی پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال بالکل واضح ہوا کرتا تھا۔ کون صحیح کون غلط، کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں۔ اپنوں کی حفاظت اور دشمن کا خاتمہ۔ یہی ایک سپاہی کا سب سے بڑا فرض اور سب سے اہم عمل ہوتا ہے، اور اس مسئلے میں کبھی بھی کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ تھی اس وقت کیمی صاحب کے دماغ میں صرف ایک بات تھی اور وہ یہ کہ جیل سے فرار اختیار کرنے والوں کی کس طرح مدد کی جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلے تو یہ رائے دی کہ چپل کباب یا کھانے پینے کی دوسری اشیا کی جگہ اگر سفر کے لیے ابھی سے کچھ سوکھے میوے اور بسکٹ وغیرہ تھوڑا تھوڑا منگوا کر اکٹھا کیے جائیں تو جیل کے باہر دو تین دن آرام سے ان کے سہارے گذر سکتے ہیں۔ ساتھ انھوں نے برٹی سے کہا کہ اپنے فلائنگ اوورآل جو خوش قسمتی سے ابھی انھیں کے قبضے میں ہے سے اندر کی ربر ٹیوب ہوشیاری سے نکال لیں۔ جہاز میں تو یہ جسم پر ہوا کہ دباؤ بنانے کے کام آتا ہے لیکن زمین پر اس سے اور بھی کام لیے جاسکتے ہیں۔ کیمی نے ملند، گیری اور ہیری کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس میں پانی بھر کر لے جانا مگر کسی بیگ میں چھپا کر۔ پینے کے لیے اتنا پانی چوبیس گھنٹوں کے لیے کافی ہوگا۔ اس لیے جہاں بھی موقع ملے اسے دوبارہ بھر لینا اور ہاں ہیری اگر ندی پار کرنی پڑ جائے تو اس ٹیوب کا پانی نکال کر اس میں منہ سے ہوا بھر لینا اور اسے گردن اور سینے پر لپیٹ کر پانی میں گھس جانا۔ ڈوبو گے نہیں۔ ہیری کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے اسے الا دین کا چراغ مل گیا ہے۔

کیمی نے ان کی مدد کے لیے خاص قسم کے دو اوزار بھی تیار کیے۔ جس میں سے ایک کا نام

"بجوکا" تھا جو ماچس کی تیلیوں اور تار کے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اسے کسی بھی پلگ میں ڈال دیا جائے بس سارے کے سارے کیمپ کی بجلی غائب۔ جیل سے فرار ہوتے وقت اندھیرا کرنے کے لیے اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ دوسرا اوزار بھی بالکل کمال ہی کا تھا۔ یہ تھا سمت بتانے والا قطب نما۔ وہ بھی ایک فاؤنٹن پین کے اندر۔ اس کی بناوٹ کچھ اس طرح تھی کہ جب پین کی کیپ کھولی جائے تو ایک بٹن کے اوپر لپٹی ہوئی دو لمبی سوئیاں نکلتی تھیں۔ دونوں سوئیاں دھاگے سے الگ الگ بٹن کے اوپر بندھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی دو چھوٹی سوئیاں بھی تھیں۔ پتہ نہیں کس طریقے یا کس "جگاڑ" سے کیمی نے دونوں بڑی سوئیوں میں سے اس قدر بجلی پاس کرائی کہ ان سوئیوں میں مقناطیسیت پیدا ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بٹن کو جب بھی اٹھا کر چھوٹی سوئی کی نوک پر رکھا جاتا بڑی سوئیاں فوراً گھوم کر اتر اور دکھن کی سمت میں آ کر ٹھہر جاتیں۔ سوئی کی نوک یعنی اگلا سرا اتر کی طرف اور پچھلا سرا دکھن کی طرف۔ یہ تھا کام چلاؤ قطب نما جو رات ہو یا دن سمت کا صحیح اندازہ کرا سکتا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس قطب نما کو اپنے کٹے پھٹے کپڑے سینے کے لیے کیمپ سے مانگ جانچ کر اکٹھا کیے گئے دھاگے اور سوئیوں سے بنایا گیا تھا۔

اب باقی رہ گیا ایک کام اور وہ تھا تین عدد تھیلوں کا بندوبست۔ نہ صرف یہ کہ سامان وغیرہ رکھنے کے لیے بلکہ ان تینوں کو عام مسافروں کی شکل دینے کے لیے بھی۔ سب لوگ پھر اسی عظیم موجد یعنی کیمی کی طرف امید بھری نگاہ سے دیکھنے لگے۔ بھلا اس کے علاوہ اور کون ایسا انتظام کر سکتا تھا۔ خیر کیمی نے دو ہی دن میں راستہ ڈھونڈ لیا۔ اس کی چوٹوں کی وجہ سے اسے جیل انچارج کا فرنگی اسٹائل والا باتھ روم استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ کیمی نے دیکھ رکھا تھا کہ باتھ روم کی کھڑکیوں پر دو پردے سمٹے ہوئے لٹکے تھے۔ کیمی نے ان پردوں کو پھیلایا کھنچا ہوا کبھی نہیں دیکھا۔ شاید اس لیے کہ کھڑکی کی دوسری طرف جگہ بالکل خالی تھی اور ادھر سے بے پردگی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا کیمی صاحب کی قمیص میں چھپ کر ایک پردہ قیدیوں کی سیل تک آ گیا اور رات کے اندھیرے میں بلیڈ سے کاٹ کر اسے تھیلے میں تبدیل کر دیا گیا۔ جب دو چار روز باتھ روم کے پردے کا کوئی تذکرہ نہ سنائی دیا تو دوسرے پردے کے ساتھ بھی وہی سب ہوا جو پہلے والے کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ تھیلے

بھی کمرہ نمبر پانچ میں ہی محفوظ کر دیے گئے۔ تیسرے تھیلے کے لیے کیمی نے شیٹی کے اس پیراسوٹ کا استعمال کیا جو نہ جانے کیسے کیمی کے پاس ہی چھوڑ دیا گیا تھا اور آج بھی اس کے قبضے میں ہی تھا۔ اس پیراشوٹ کو کیمی کسی بہانے سے اپنے سیل میں لائے اور اس کے ٹکڑے کر کے ایک بڑے تھیلے کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے تھیلے بھی بنائے۔ جنھیں ربر ٹیوب اور کھانے پینے سے متعلق سامان رکھنے کے کام آنا تھا۔ رات کے اندھیرے میں کیمی یہ تک نہ دیکھ سکے کہ پیراشوٹ کے ان ٹکڑوں میں جگہ جگہ خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ دراصل پیٹ میں گولی لگنے کے بعد اسی پیراشوٹ سے شیٹی نے اپنا بہتا ہوا خون روکنے کی کوشش کی تھی۔

—

باب پندرہ

تیاریاں اور اندیشے

(جیل سے فرار-3)

''ٹام تقریباً تیار ہے،'' ملند نے شام کے وقت آنگن میں ٹہلتے ہوئے وکرم سے کہا۔ سب کو معلوم تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں انگریز قیدیوں نے جرمنی کی ایک جیل سے نکلنے کے لیے تین سرنگیں تیار کی تھیں اور انھیں نام دیے تھے، ٹام، ڈک اور ہیری۔ یہی وجہ تھی کہ ملند اپنی سرنگ کے بارے میں کچھ بتاتے وقت ''ٹام'' کے خصوصی اشارے کا استعمال کرتا تھا۔

''ارادہ ابھی بھی پکا ہے؟'' وکرم نے پوچھا۔

''بالکل،'' ملند نے جواب دیا۔

''اور باقی دو؟''

''جب سارے قیدیوں کی واپسی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں تو ان کے ارادے کچھ کمزور پڑنے لگتے ہیں۔ ویسے وہ میرے ساتھ ضرور جائیں گے۔''

''تقریباً کب تک؟ مطلب متوقع دن تاریخ؟''

''ستائیس یا اٹھائیس،'' ملند وقت کے بارے میں کافی مطمئن لگتا تھا۔ آج تھی پچیس جولائی، دیوار توڑنے کے لیے ایک دورات کا کام ابھی باقی تھا۔ ساری محنت ملند اور گیری نے کی

تھی۔ روز کا ایک ہی معمول ہوتا تھا۔ پہلے پچھلی دیوار سے چارپائی آگے کھسکانا، پھر ریڈکراس کے سامان میں آئے دفتی کے ڈبے ہٹا کر جگہ بنانا، دیوار کا پلاسٹر اکھاڑنا، پھر بیچکس اور کیلوں کی مدد سے اینٹوں کے بیچ کا مسالہ کھرچنا اور دھیرے دھیرے اینٹوں کو ڈھیلا کر کے باہر نکالنا اور آخر میں سارا ملبہ اکٹھا کر کے دفتی کے ڈبوں میں بھر کر چھپانا۔ ڈبوں سے دیوار کے چھید کو ڈھاکنا، پلنگ واپس اپنی جگہ پر رکھنا اور پھر سونا۔ چاروں نے پروگرام طے کر رکھا تھا رات کے کھانے کے بعد جب سارے قیدی اپنے اپنے کمروں میں لوٹتے تھے تو یہ چاروں تاش کھیلنے بیٹھ جاتے تھے اور جیل کی طرف سے دیے ہوئے ٹرانسسٹر پر پورے والیوم کے ساتھ گانے بجاتے تھے۔ ریڈیو کے شور میں کمرے کے اندر ہو رہی توڑ پھوڑ کی آواز دبی رہتی تھی۔ تقریباً ساڑھے دس بجے ایک ایک کر کے سب پاخانے جاتے تھے اور گارڈ سے کہہ کر اندر کی بجلی، جس کا بٹن کمرے کے باہر تھا، بند کرواتے تھے۔ جیسے سونے کی تیاری میں ہوں۔ ہیری اور شیٹی زمین پر ہی دروازے اور کھڑکی سے لگ کر لیٹتے تھے۔ ملند اور گیری میں سے جو کھدائی کر رہا ہوتا تھا، اس کے بستر پر چادر اور تکیوں کی 'ڈمی' بنا دی جاتی تھی۔ اس طرح اگر کوئی باہر سے دیکھ بھی لیتا تو ہلتے ڈلتے تین آدمی اور گہری نیند میں سوئی ہوئی ایک 'ڈمی' دکھائی دیتے۔ ہیری اور شیٹی ہوشیاری سے گارڈ کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ گارڈ جب زیادہ قریب آنے لگتا تھا تو پھسپھساہٹ سے ''بوگی'' کہہ کر بقیہ دونوں کو ہوشیار کر دیا جاتا تھا۔ دراصل ہوائی لڑائی میں ''بوگی'' کہہ کر ہی دشمنوں کی نشاندہی کی جاتی ہے، اس لیے یہ لفظ کانوں سے ٹکراتے ہی چارپائی کے نیچے کام کرنے والا ساری حرکتیں روک دیتا تھا اور اوپر سے مدد کرنے والا جھٹ سے اپنی پلنگ پر لیٹ جاتا تھا۔ گارڈ جب دور چلا جاتا تو کام پھر شروع۔ اس طرح کام کی رفتار ضرور دھیمی تھی، لیکن اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ بھی نہیں تھا۔

ملند اور گیری اپنی عادت کے مطابق ہنسی مذاق سے باز نہیں آتے تھے۔ دیوار میں سوراخ بنانا ان کے لیے کھلواڑ جیسا تھا۔ ملند کی منشا تھی کہ ''بجوکا'' کی آزمائش کر لی جائے، کبھی نے لاکھ سمجھایا کہ تنا کام ہونے والا ہتھیار نہیں ہے، پر یہ لوگ کہاں ماننے والے۔ ایک رات کام ختم کرنے کے بعد ملند نے ''بجوکا'' کو پلگ میں لگایا اور جھٹکے سے اندر کر دیا۔ و..... ہو وو ش ش ہش کرتی ہوئی ایک سنسناتی سی آواز آئی، ایک لمحے کے لیے کمرہ ''نیوون'' جیسی روشنی سے جگمگایا اور پورے کیمپ

میں روشنی غائب ہوگئی۔ ہاتھ میں ٹارچ لیے ہوئے گارڈ بھاگتا ہوا کمرے میں آیا اور ٹارچ کی روشنی میں اندر دیکھنے لگا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"یہاں سے کچھ عجیب سی آواز آئی تھی۔ کیا ہوا ہے اندر؟" گارڈ نے سوال کیا۔

"آواز؟ کیسی آواز؟" ملند نے بھولے پن سے جواب دیا۔ "یہاں تو کوئی آواز نہیں آئی، ہاں میں ریڈیو کا بینڈ ضرور بدل رہا تھا اور شاید والیوم بھی تیز تھا۔"

تھوڑی دیر میں بجلی تو ٹھیک کر لی گئی، لیکن اس دن سے گارڈ کافی چوکنا ہو گئے۔ پہریداروں میں سب سے زیادہ شکی شمس الدین تھا۔ اس کی ڈیوٹی کے دوران ان لوگوں کو بہت ہوشیاری برتنی پڑتی۔ ایک رات شمس الدین کو کمرہ نمبر سے کچھ عجیب سی آواز آتی سنائی دی جیسے کوئی بلی اپنے پنجوں سے زمین کھرد رہی ہو۔ اسے کچھ شک ہوا، ویسے بھی وہ اس کمرے پر خاص طور سے نظر رکھتا تھا۔ کیوں کہ اسی کمرے میں سب سے زیادہ چست درست قیدی تھے۔ پتہ نہیں کب کیا کر بیٹھیں؟ شمس الدین دبے پاؤں دروازے کی طرف آ رہا تھا، لیکن ادھر شیٹی بھی کم چوکنا نہیں تھے، جیسے ہی شمس الدین دروازے پر پہنچا، شیٹی اس طرح کود کر اس کے سامنے آئے گویا کہیں سے نازل ہو گئے ہوں۔ شمس الدین نے ٹارچ جلائی تو پوری کی پوری روشنی شیٹی کے اوپر، دوسری طرف سے ہیری بھی سامنے آگئے اور دونوں نے مل کر ٹارچ کی روشنی کے دائرے کو اس طرح "کور" کیے رکھا کہ شمس الدین دیوار پر کھدائی کر رہے ملند اور گیری کو دیکھ ہی نہیں پایا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" شیٹی نے یکایک شمس الدین سے پوچھا۔

ہیری نے بھی فوراً ایک سوال داغ دیا، "شیٹی کیا تم نے پاخانہ جانے کے لیے کسی گارڈ کو بلایا ہے؟"

شمس الدین چپ رہا پھر کچھ سوچتا ہوا واپس چلا گیا۔ شاید اس نے سوچ لیا ہو کہ صرف شک کی بنیاد پر کسی دوسرے کو نہ تو آواز ہی دی جا سکتی ہے اور نہ تفتیش ہی آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ آخر براہِ راست قیدیوں کی طرف سے کوئی گڑبڑ یا کسی کارروائی کا کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے۔

شمس الدین سے متعلق رات کے واقعے پر دوسرے دن صبح غور و خوض کیا گیا۔ شیٹی نے

کہا، جب تک ریڈیو بجتا تھا گارڈ کچھ زیادہ چوکنا رہتے تھے۔ ریڈیو بند ہوتے ہی وہ بھی تھوڑا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں شاید یہ سوچ کر کہ قیدی سو گئے ہوں گے اور رات کے سناٹے میں ہلکی سی آواز بھی ان کے کانوں تک ضرور پہنچ جائے گی۔ اس وقت ان کی گشت بھی کم ہو جاتی تھی اور اکثر پہرے دار سامنے والی بیرک کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اونگھ بھی لیا کرتے تھے۔ ان تمام وجوہات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا گیا کہ اب ریڈیو پرسی کی سیل میں، جو سب سے دور ہے، رات ڈیڑھ بجے تک فل والیوم میں بجایا جائے گا۔ تاکہ سارے پہریداروں کا دھیان بٹا رہے۔

تقریباً ہفتہ بھر بعد ہی یہ لوگ پھر مصیبت کا شکار ہوتے ہوتے بچے۔ ہوا یوں کہ کام کرنے کے بعد ملند تو اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ گیری کی چارپائی ابھی دیوار سے دور ہی تھی۔ اس کے من میں آیا کہ کیوں دیوار سے سٹے ڈبّوں اور ان کے سامنے رکھے جوتوں اور کمبلوں وغیرہ پر ایک نگاہ اور ڈال کر اطمینان کر لیا جائے کہ دیوار کا وہ حصہ جسے چھپائے رکھنا ابھی ضروری تھا، صحیح طریقے سے ابھی ڈھکا ہے یا نہیں جس طرح گیری چارپائی پر دراز ہو کر اور ہاتھ دوسری طرف کر کے سامانوں کو ادھر ادھر سرکا رہا تھا، دور سے دیکھنے پر اس کے دونوں پیر ہاتھی کے دو سفید دانتوں کی طرح اوپر دکھائی دے رہے تھے اور بقیہ جسم غائب۔ ایک دم سے باہر لگے سوئچ کے دبنے کی آواز آئی۔ اندر لیٹے قیدیوں کو لگا، جیسے سب کے سروں پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو، بلب کی روشنی میں نوجوان گارڈ کی نگاہ گیری کی ٹانگوں پر پڑی اور وہ حیرت سے دیکھنے لگا کہ ان ٹانگوں کا بقیہ جسم کہاں غائب ہے۔ اتنے میں گیری کا بھاری سر چارپائی کے پیچھے سے اٹھتا ہوا اور دِھوا۔ گیری نے آنکھیں بھینچتے ہوئے، جیسے گہری نیند سے جگا دیا گیا ہو، کہا، ''کمبخت سونے بھی نہیں دیتے آرام سے۔ بولو کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

گیری کے ہڑبڑا کر بولنے کی اداکاری نے گارڈ کو بھی بوکھلا دیا۔ وہ عجیب سی کشمکش میں پڑا رہا، شاید سوچ رہا تھا کہ خطرے کی گھنٹی بجائے یا اوروں کو آواز دے کر پکارے۔ اسی تذبذب میں کچھ لمحے گذرے اور کوئی فیصلہ نہ کر پانے کی صورت میں آخر وہ لائٹ بجھا کر چلا گیا۔ یہ گارڈ یا تو غلطی کرنے کی ڈر سے کچھ زیادہ ہی گھبراتے تھے، یا ہندوستانی قیدی کچھ زیادہ ہی خوش قسمت تھے یہ فیصلہ کر پانا مشکل تھا۔

اگلے دن شام کو آنگن میں ٹہلتے وقت ملند آگے چل رہے وکرم اور ہیری کے ساتھ ہولیا۔
''دورات کا کام اور باقی ہے،'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔
ہیری نے بھی دبی زبان میں کہا،'' ملند! ابھی ہم لوگ'' روٹ'' طے کرنے کی بات کر رہے تھے۔ یہ فیصلہ فوراً ہونا ضروری ہے۔ اس میں میرے تیرنے یا ڈوبنے کی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کہ ہمیں دشوار گذار پہاڑیوں اور جنگلی راستوں پر کئی دن چلنا ہوگا، بلکہ بات کچھ اور ہے۔''
وکرم نے ملند کے نظریات جاننے کے لیے اس کی طرف سوالیہ نظریں دوڑائیں،'' سر ابھی تک تو اسی پلان پر غور وفکر چل رہا ہے کہ یہاں سے نکل کر ہم لوگ اتر پورب کی سمت میں جائیں گے۔ پورب میں واہ اور اسلام آباد ہیں جہاں پاکستانی حکومت کے دفتروں اور عمارتوں کی بہتات ہے۔ ان سے دور رہنا ہی اچھا ہی ہوگا۔ تھوڑا اتر کی طرف دب کر پہاڑیوں میں پہنچیں۔ پہاڑیوں کے اس پار جھیلم ندی ہے، اس کے پار پاکستان کے'' کوٹلی'' اور'' پنچھ'' کے بیچ کی سمت میں سرحد پار کی جائے گی۔''
''پورا راستہ سومیل سے کم نہیں ہوگا،'' وکرم نے کہا۔'' تم لوگ اتنا چل پاؤ گے؟ یہاں اتنے دنوں تک تو آرام اور سستی سے ہی واسطہ رہا ہے۔''
ملند نے اعتماد سے کہا،'' میرے رائے میں گیری آسانی سے چل لے گا اور جب تک گیری چلتا رہے گا میں بھی ساتھ نہیں چھوڑوں گا، چاہے ارادوں کی طاقت کے سہارے ہی چلنا پڑے۔''
دونوں نے اب ہیری کی طرف دیکھا۔ ہیری کے خیال میں ایک انگریزی فلم کا سین چل رہا تھا، جس میں جنگل میں کھویا ہوا ایک آدمی، سکڑا سہا، ہڈیوں کا ڈھانچہ، جگہ جگہ چوٹ کھایا ہوا، آخر میں گرتا پڑتا ایک آبادی میں داخل ہوتا ہے اور صحت مند ہونے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ ہیری کو بھی اپنی حالت کچھ ایسی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اب پیچھے بھی تو نہیں ہٹا جا سکتا تھا ورنہ بزدلی کا دھبہ ساری زندگی لگا رہے گا۔
ایک گہری سانس لیتے ہوئے ہیری نے کہا،'' سر ہمارے فرار ہونے کی خبر ریڈیو پاکستان پر فوراً آجائے گی۔ اعلان ہوتے ہی بچے بوڑھے جوان مرد عورت سبھی ہمیں تلاش کرنا شروع کردیں گے۔ ٹرین میں، بس میں، پہاڑوں میں، وادیوں میں، بازاروں میں، ڈھابوں میں،

یہاں تک کہ نالیوں میں اور جوتیوں کے تلووں تک میں۔ یہ ہندوستان نہیں ہے جہاں شاید آدھی آبادی کو آج بھی معلوم نہ ہو کہ حال ہی میں اتنی سنگین جنگ لڑی جا چکی ہے۔ معاف کیجیے اس ملک میں ایک ہی چیز ہماری حفاظت کے لیے مددگار ہو سکتی ہے کہ ہم کتنی جلدی زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لیں۔"

"میں اور پری غپ شپ کے بہانے یہاں کے ملازمین سے ریلوں اور بسوں کے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ پیشاور جانے کے لیے بس اڈہ یہاں سے بہت قریب ہے، مشکل سے تین چار سو میٹر کی دوری پر۔ یہ بھی پتہ لگا ہے کہ پیشاور اور لاہور دونوں جگہوں کے ہر آدھے گھنٹے پر بسیں روانہ ہوتی رہتی ہیں اور یہ سلسلہ چوبیس گھنٹے چلتا رہتا ہے۔ میری سمجھ سے پیشاور کا راستہ ہی مناسب رہے گا اور بس سے بہت جلدی بہت دور تک پہنچا بھی جا سکتا ہے،" ہیری نے پتی تلی بات کہی۔

کچھ دیر سب چپ رہے۔ وکرم نے گیری کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ ملند اور ہیری فوراً پیچھے ہو گئے۔ وکرم نے ہیری کی گفتگو تفصیل سے گیری کے سامنے رکھی۔ پھر پیشاور روٹ کے بارے میں بات کی۔ سب سے بڑا فائدہ بس کے سفر میں لگتا تھا اور دیر رات کے جب قیدیوں کے بھاگنے کا امکان تھا، اس وقت سیدھے سادے پٹھان لوگ ہی بسوں میں سفر کرتے ملیں گے۔ بلکہ لاہور کے راستے میں ہوشیار اور شک کرنے والے لوگ زیادہ مل سکتے ہیں۔

"آپ نے سوچ سمجھ تو لیا ہی ہے، مجھے یہ پلان منظور ہے،" گیری نے پورے اعتماد سے کہا۔ گیری اگر کسی پر بھروسا کر لیتا تھا تو زیادہ سوال نہیں پوچھتا تھا اور ساتھ دینے کو ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ وکرم کو بھی اس بات کا پورا اعتماد تھا کہ کسی بھی خطرناک مہم کے لیے گیری سے زیادہ بھروسے مند ساتھی شاید ہی کوئی مل سکے۔

دونوں چلتے چلتے تھوڑا اسار کے تو ملند اور ہیری بھی ساتھ آ گئے۔ وکرم نے کہا، "گیری بھی پیشاور کے راستے سے سفر کے لیے متفق ہے۔ کیوں گیری! تم متفق ہو نا؟ ایسے حالات میں سب کے سامنے حامی بھروانی ضروری تھی۔"

"ہاں، ہاں میں تیار ہوں،" گیری نے کہا۔

''پھر تو تین لوگ ہم خیال ہو گئے،'' ملند دھیرے سے بولا مگر زور سے ''ٹھہاکا'' لگا کر ہنسا۔ سب لوگ یہاں تک کہ گارڈس بھی ان چاروں کی طرف دیکھنے لگے۔ سبھی یہ سوچ رہے تھے کہ ضرور ملند نے کوئی زبردست لطیفہ سنایا ہوگا۔

وکرم اکیلا ٹہلتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جیل سے تین قیدیوں کے فرار ہونے سے حالات میں کشیدگی ضرور آئے گی۔ مشکلیں بڑھیں گی۔ پاکستانیوں کی طرف سے اذیتیں بھی پہنچائی جائیں گی اور کیا ٹھیک کہ دو ایک کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔ لیکن اب قدم واپس نہیں لیے جا سکتے تھے۔ آخر یہ کوئی بچوں کی طرح فرضی کھیل تو کھیلا نہیں جا رہا تھا۔ جو کام، جو باہمت قدم تیاری اور پلاننگ میں صحیح اور لازمی دکھائی دے رہے تھے۔ عمل میں لانے پر کیسے غلط ہو سکتے تھے؟ آخر یہ فیصلہ دھیرے دھیرے، ٹکڑوں میں، قسطوں میں، پلوں میں، مہینوں میں لیا گیا تھا۔ اب تو صرف اس پر عمل کرنا باقی ہے۔

''ملند.....'' وکرم نے پکارا۔ ملند کے آتے ہی وکرم نے کہا، ''سب کو بتا دو کہ ''ڈی۔ ڈے'' میں دو دن باقی ہیں۔ یہ بھی سمجھا دو کہ جو کچھ بھی ہو، کتنی ہی اذیتیں کیوں نہ جھیلنی پڑیں، کم سے کم چوبیس گھنٹوں تک کوئی بھی منہ نہیں کھولے گا۔ کسی کو کچھ بھی نہیں بتائے گا، اور اس کے بعد بھی جب تک ممکن ہو ''راہِ فرار'' کی نشاندہی نہ کی جائے۔ تم لوگوں کے بھاگنے کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے باقی بچے ان دو دنوں میں طے کر لیں گے۔

ملند نے فوراً سب کو الگ الگ اطلاع دی اور سمجھا بھی دیا۔ اس کے بعد شام کے کھانے کا وقت ہو گیا اور سب آنگن سے رخصت ہو گئے۔ دوسرے دن صبح جب سارے قیدی کمرہ نمبر 5 میں اکٹھا تھے، ماحول میں عجیب سا تناؤ تھا۔ آپس میں بات چیت بہت کم ہو رہی تھی شاید سبھی اس ہونے والے دھماکے سے کچھ دبے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد برٹی ہلکے سے کھانسے اور بولے،

''اخبار میں آج پھر ہندوستان پاکستان سمجھوتے اور ہماری واپسی کے چرچے ہیں۔''

''ہاں ایک دو روز سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی کچھ اسی طرح کا ذکر چل رہا ہے۔ اب سمجھوتہ ہونے میں دیر نہیں لگے گی،'' منوہر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''تو؟'' پری جوش میں بولا۔ ''ایسی جانے کتنے چرچے پچھلے سات مہینوں سے سن رہے ہیں۔''

''نہیں۔ یہ معمولی بات نہیں ہے، یہ سنجیدہ مسئلہ ہے۔'' برٹی نے کہا۔ پھر انھوں نے اٹھ کر دروازے کے باہر جھانکا کہ کہیں کوئی گارڈ آس پاس کھڑا کچھ سن نہ رہا ہو۔ ''سمجھوتہ ہونے میں اگر کچھ دن یا کچھ ہفتے لگ بھی جائیں تو کیا اس کے لیے انتظار کرنا بہتر نہیں ہوگا؟ نہ کہ جوش میں نکل بھاگیں اور باہر..... کاپٹ۔ کاپٹ کہتے وقت انھوں نے اپنا ہاتھ اپنی گردن پر ایک طرف سے دوسری طرف کھینچا جیسے چاقو سے گلا کاٹا جا رہا ہو اور واضح کرتے ہوئے انھوں نے کہا، جیل توڑ کر بھاگنا بالکل غیر ضروری اور بے وقوفی کا کام ہوگا۔ میں اس کی حمایت میں نہیں ہوں۔''

''اب قدم واپس لے لینا ڈر میں جا گھنے جیسی بات نہیں ہوگی؟'' ملند نے تنک کر کہا۔

''کوئی قسم تو کھائی نہیں ہے ملند،'' منوہر برٹی کی حمایت میں بولے۔ ''سب کچھ جہاں کا تہاں روکا جا سکتا ہے اور بھلائی بھی اسی میں ہے۔''

''وکرم! تم ان سے آگے کی کارروائی رکوانا طے کرو۔ بے وقوفی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' برٹی اب وکرم کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

وکرم کے لیے یہ جملہ احکام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے سوچا کہ موجودہ حالات میں اس طرح حکم دینا جائز نہیں تھا۔ اس لیے اس کی خلاف ورزی بھی ناجائز نہیں ہوگی۔ اس نے سامنے رکھے ہوئے تاش کے پتوں کو پھینٹنا شروع کیا۔ قدرتی طور پر وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے لیے ذمے داری سنبھالنے یا معاملات سے ہاتھ کھینچ لینے کا وقت آ گیا تھا۔ وقت آ گیا تھا یہ فیصلہ کرنے کا کہ یہ تین باحوصلہ نوجوان آگے بڑھ کے ''ہیرو'' بنیں گے یا دبک کر بزدلوں کی قطار میں پناہ لیں گے، آگے کی پیڑھیوں کے لیے بہادری کی کوئی مثال پیش کی جائے گی یا یہ بیچارے چوہے ہی بنے رہیں گے۔

''دیکھیے یہ فیصلہ انھیں لوگوں کو کرنا ہے،'' وکرم آسانی سے بولا۔ ''میں یا کوئی اور اس مسئلے میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔''

پھر وکرم نے آنکھیں بھینچ کر کچھ سخت آواز میں کہا۔ ''مگر یہ لوگ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور [illegible] اس کی حمایت دل و جان سے کروں گا۔''

سبھی حیرت زدہ تھے وکرم کے ان لفظوں سے۔ آخر میں وہ ملند وغیرہ کی جانب مڑ کر دیکھنے

لگے۔ گیری نے مضبوط ارادوں کے ساتھ کہا، ''اگر ملند جاتا ہے تو میں ساتھ ضرور جاؤں گا۔''

''میں بھی۔'' ہیری بولا۔

ملند زور سے ہنسا اور بولا۔ ''سر! فیصلہ تو یہاں آنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔'' اس نے گیری اور ہیری دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی طرف گھسیٹا۔ اس وقت ان دونوں کے اٹوٹ اعتماد پر اسے فخر ہو رہا تھا۔ ''تو پھر......فائنل۔'' ملند نے دونوں کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔

برٹی خوش نہیں تھے۔ وہ بولے۔ میں متفق نہیں ہوں، اور نہ کوئی ذمے داری ہی قبول کروں گا۔ اب یا بعد میں۔ انھوں نے گارڈ کو آواز دی اور اپنے آپ کو اپنی سیل میں لے جانے کے لیے اس سے کہا۔

پرسی نے برٹی کو جاتے ہوئے دیکھا تو ان سے کہا، ''کم سے کم اپنا منھ تو بند رکھیں گے؟'' اس کے آگے کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ایک دو لوگوں نے کتابیں پڑھنی شروع کر دیں، بقیہ لوگ ادھر ادھر لیٹ کر سو گئے۔ راتیں تو جاگتے ہی گذر رہی تھیں۔ شام کو سارے لوگ باہر نکالے گئے، ''والی بال'' ہوا اور اس کے بعد آنگن میں چہل قدمی۔ وکرم اور کیمی ساتھ ساتھ تھے۔ منوہر بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ سب کی سمجھ میں آ گیا کہ منوہر کو ابھی اور بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ آخر اس نے شروع کیا، ''اس طریقے سے یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ انھیں اس طرح پلاً نہیں جھاڑنا چاہیے۔'' منوہر کا اشارہ برٹی کی طرف تھا۔ وہ آگے بولا، ''سب کے اپنے اپنے خیالات ہیں پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔''

''کچھ کیا......وہ سب کچھ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ یہ تینوں جان کا خطرہ مول لے رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور تو اور یہاں بچے رہنے والوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ہی ٹوٹیں گے،'' کیمی بولے۔

منوہر کیمی کی بات کا مطلب غلط سمجھ بیٹھے اور بولے۔ ''تو آپ روکتے کیوں نہیں۔''

''منوہر!! ان کا فیصلہ آپ سن چکے ہیں۔ میں تو اس لیے پریشان ہوں کہ خود ساتھ جانے کے قابل نہیں ہوں۔'' کیمی کے انداز گفتگو سے بے حد لاچاری محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے وکرم نے فوراً اس کا کندھا تھپتھپایا لیکن کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

منوہرابھی بھی بات کوروکنے کے لیے تیارنہیں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایسے انسانوں کی طرح تھے جو زیادہ تر درمیان کا راستہ اپناتے ہیں۔ بایاں بھی صحیح اور داہنا بھی ٹھیک اور ایسا کرتے کرتے اکثر دور تک کامیاب ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت تو وہ اپنے دوستوں کی حفاظت کے تئیں فکرمند دکھائی دے رہے تھے۔

''میں آپ سے پوچھتا ہوں وکرم سر،'' وہ بولے۔ ''اگر ملند آپ کا بیٹا ہوتا تو آپ اسے جانے دیتے؟''

یہ ''تو بہت مشکل سوال ہے،'' وکرم نے پلٹ کر منوہر کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''منوہر! میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر میرا بیٹا ایسے حالات میں ہو اور اپنا فیصلہ لے رہا ہو تو میں کم از کم اس کے آس پاس بھی رہنا نہیں چاہوں گا۔ مگر تمھارے سوال پر واپس آتے ہوئے میں یہ بھی کہوں گا کہ میں اپنے بیٹے کے سامنے مثبت اور منفی دونوں قسم کی دلیلیں رکھوں گا، خاص طور سے منفی دلیلیں تو ضرور۔ جیسا ملند وغیرہ کے ساتھ اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ اس کے بعد فیصلہ اسی پر چھوڑ دوں گا۔ پھر آخر میں پلکوں پر خشک آنسو سجائے ہوئے دل ہی دل میں اس کی سلامتی کی دعائیں کروں گا اور خود پر قابو رکھنے کی کوشش میں اپنے دن رات کاٹوں گا۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ میں آج کر رہا ہوں۔''

کیمی نے جذباتی ہو کر بڑے ہی احترام سے وکرم کی طرف دیکھا۔ کچھ لمحوں کے بعد منوہر پھر بولا، ''سر! مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایئر فورس کو، یا پھر دیش کو اس کی کامیابی سے کیا مل جائے گا؟ جو اتنا بڑا خطرہ مول لیا جائے۔''

''اگر کچھ حاصل کرنا ہے، وہ بھی خاص طور سے ہمارے پیشے میں، تو کچھ نہ کچھ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ ایورسٹ پر کیوں چڑھا جائے، ''ہلیری بننے کے لیے۔'' بغیر کوئی نقشہ ساتھ رکھے دور سمندر میں جہاز کیوں لے جایا جائے۔ ''کولمبس بننے کے لیے۔''

سنتا وغیرہ بھی پاس آ گئے۔ ایسے موڈ میں وکرم کی باتیں سننے کے لیے سبھی بے قرار رہتے تھے۔ ہماری ایئر فورس کا ''ہیرو'' ابھی بھی ''ڈگلس باڈر'' ہی ہے، جس نے مصنوعی پیر لگا کر جہاز اڑایا تھا اور جرمنوں سے جنگ کی تھی۔ دشمن کی قید کا تصور کرو تو فلمی ہیرو ''اسٹیو میکون'' ہی دکھائی

دیتا ہے۔ اسی طرح ہماری زمینی فوج کے لیے آج بھی رومیل، میکارتھر اور پیٹن نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ہماری بحری فوج صرف ''نیلسن'' سے ہی تحریک لیتی ہے۔ سمجھ میں آیا ہمارے مثالی بہادر کون کون اور کہاں کے ہیں۔ آخر کبھی ہمارے اپنے بھی اس درجہ بندی میں کہیں دکھائی دیں گے یا نہیں؟

وکرم نے پھر کہنا شروع کیا، ''ہاں...... ہمارے لیے نمونہ ہیں، ''ویرارجن''۔ پتہ نہیں حقیقت تھے یا تصوراتی۔ لیکن ''رانا پرتاپ''، ''رانی لکشمی بائی'' اور ''نیتا سبھاش چندر بوس'' جیسی کچھ مثالیں ضرور ہیں۔ مگر گاڑی وہیں کی وہیں رکی ہوئی ہے۔ کیا جدید ہندوستان، تازہ ترقیوں کا ہندوستان نئے آدرش نئے بہادر یا نئے زندہ دل انسان تخلیق نہیں کرے گا؟ ہاں ایسی کسی کوشش میں جان جا سکتی ہے، مصیبتیں آسکتی ہیں۔ مگر ہر پیڑھی میں کچھ نہ کچھ جانباز نکلتے ہی ہیں، جن میں کئی تو خود سے اوپر اٹھ کر کچھ کر دکھانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ قوم و ملک کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے اور ہماری یا ہم جیسے لوگوں کی ذمے داری ہے کہ ہم ان کا حوصلہ بڑھائیں۔''

کچھ دیر سب کے سب خاموش رہے پھر وکرم کی طرف دیکھتے ہوئے ہیرنی نے کہا، ''اب سمجھ میں آیا کہ آپ ہم سب کی حوصلہ افزائی کیوں کرتے رہے۔''

اس سے زیادہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

باب سولہ

کوچ

(جیل سے فرار-4)

دیوار کے باہر کی طرف پلاسٹر کی ایک موٹی پرت باقی تھی۔ ملند اور گیری نے اسے بڑے ہی صبر کے ساتھ چھوا پھر انگلی مار مار کر ٹیسٹ کیا۔ اس ہلکی ٹھونک پیٹ سے خالی ڈبے جیسی آوازیں برآمد ہوئیں جو ان کے لیے کسی ترانے کی سرگم سے کم نہیں تھیں۔

''اب اس کو ایسے ہی چھوڑتے ہیں،'' ملند نے کہا'' بس ایک دھکا، گیری ہائے اور سٹ سے باہر.........کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال تو یہ ہے کہ پھٹا پھٹ اینٹیں ٹھیک سے اپنی جگہ لگاؤ۔ اور دعا کرو کہ یہ راز کسی طرح کھلنے نہ پائے؛'' گیری نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

آج سبھی کام پورا ہونے کی خوشی میں چین کی نیند سوئے۔ دوسرے دن سب سے بچی کھچی نقدی اکٹھا کی گئی اور تینوں بیٹھ کر آپس میں ساتھ جانے والے سامانوں کا تجزیہ کرنے لگے۔ وکرم نے دھیرے سے کہا،'' جانے کے لیے تیار رہو مگر آخری فیصلہ شام کو کھانے کے وقت کریں گے۔''

شام کو ٹہلتے وقت ہیری نے کہا،'' کل جمعرات ہے پرسوں چھٹی کا دن ہے۔ صبح کے وقت سبھی آرام کے موڈ میں ہوں گے۔ اس لیے ہماری غیر حاضری شاید کافی دیر تک چھپی رہے۔''

وکرم کو بات پسند آئی۔ چھٹی کے دن کوئی بھی زیادہ ہلنا ڈلنا پسند نہیں کرتا۔ ہر کام بڑی ہی سست رفتاری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ وکرم نے ہیری کے اس خیال کو ملند تک پہنچایا۔ اسے بھی لگا کہ اگلے دن ہی جیل سے نکلنا بہتر رہے گا۔ شام کا جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ کچھ ہی دیر میں کھانے کے لیے سبھی اندر جانے والے تھے۔ اتنے میں افق پر بجلی کڑکی اور دیکھتے ہی دیکھتے پچھم کی طرف سے کالے کالے بادل اُمڈنے گھمڑنے لگے۔ ''لگتا ہے طوفان آنے والا ہے،'' ملند نے کہا۔ ''اگر پانی برسا اور بادل گرجے تو فوراً نکلنا ہی ٹھیک رہے گا۔ طوفان کے بیچ باہر نکل کر دیوار پھاندتے شاید کوئی نہ دیکھ پائے۔ بارش نہ ہونے کی صورت میں تو پھر کل چلنا ہی ہے۔''

کھانا ختم ہوتے ہوتے بادل پوری طرح اوپر آ چکے تھے، بجلی کڑک رہی تھی جس کے کڑاکوں میں ساری آہٹیں دبی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے اشاروں سے سب سمجھ گئے تھے کہ جانے والے تینوں ترنت جانے والے ہیں۔ اپنی اپنی سیل میں جانے سے پہلے سب نے ان کو ہاتھ پکڑ کر یا پیٹھ تھپتھپا کر خاموش بدائی دی۔ یہ وقت بڑا ہی جذباتی تھا کسی کو کچھ کہنا نہیں تھا صرف گہری سانسوں اور ڈبڈبائی آنکھوں میں انجانے خوف کا احساس لے کر ہی الوداع کہا جا سکتا تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی ہیری نے چارپائی کے نیچے سے ربر ٹیوب نکالی، اسے قمیص کے اندر جسم پر لپیٹا اور ضروریات کے بہانے باتھ روم میں گھس گیا۔ وہاں ٹیوب نکال کر اس میں پانی بھرا اور پھر سے جسم پر لپیٹ کر شرٹ پہنتے ہوئے کمرے میں واپس آ گیا۔ یہی ایک ضروری تیاری کمرے سے باہر ہونی تھی۔ باقی سارا سامان کمرے کے اندر ہی تھا۔ چاروں نے ہر روز کی طرح تاش کے پتے بانٹے۔ کھیلنا تو تھا نہیں صرف دکھاوا کرنا تھا اور باتیں کرنی تھیں۔ ملند نے شیٹی کو پھر سمجھایا کہ ان کے جانے کے بعد اسے کیا کرنا ہوگا۔ جیل کے دوسرے حصے میں پریہ کا ریڈیو پورے وولیوم کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا۔ روز کی طرح اس ریڈیو کو ڈیڑھ دو بجے ہی بند ہونا تھا جس سے گارڈس کو سب کچھ عام سا لگے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے سبھی ایک ایک کر کے پاخانے کے لیے گئے اور لائٹ آف کر دی گئی۔ شیٹی اور ہیری روز کی طرح دروازے اور کھڑکی کے پاس لیٹ گئے، گیری اور ملند نے شلوار سوٹ میں۔ جوتے تینوں نے کریچ کے ہی پہن رکھے تھے کیوں کہ ان کا کوئی بدل میسر نہیں ہو سکا تھا۔ جب سب تیاری ہو گئی تو شیٹی نے اپنی جیب سے دوا کی کچھ گولیاں

نکال کر پکڑائیں یہ کہہ کر یہ اسے ڈاکٹر نے دانت کے درد کے لیے دی تھیں شاید ان کے کام آئیں اور کچھ دینے کو تھا ہی نہیں تو یہی سہی۔

آدھی رات کے قریب طوفان اپنی انتہا پر تھا۔ بادل گرج رہے تھے۔ بارش تیزی پر تھی۔ ملند نے کمرے کے اندر لگا بلب ہولڈر سے نکال لیا۔ کیمی کی ''بجوکا'' آواز بہت کرتی تھی اس لیے اس کا استعمال نہیں کیا گیا۔ گیری نے چارپائی آگے سرکائی اور اس کے پیچھے جا کر جلدی جلدی ساری اینٹیں دیوار کی سرنگ میں سے نکال کر الگ کیں۔ ہاتھ سے پلاسٹر کی بچی ہوئی پرت توڑنے کے ارادے سے دھکا دیا۔ لیکن وہ تو جوں کی توں رہ گئی، ٹس سے مَس تک نہ ہوئی۔ ملند نے بھی اسے توڑنے کی کوشش لیکن ناکام۔ اس نے پیچھے ہٹ کر لات بھی ماری لیکن اس پرت کو نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹی۔ سب اتاولے ہو رہے تھے، ملند بار بار لات مار رہا تھا۔ بہت کوشش کے بعد ایک ٹینس کی گیند کے برابر سوراخ ضرور ہوا لیکن کنکریٹ کا یہ پلاسٹر پوری طرح نہ ٹوٹا۔ بارش اور تیز ہواؤں کا سنہرا موقع ہاتھ سے جا رہا تھا۔ ایسے موسم میں رکروٹنگ آفس کا میدان پار کر کے دیوار پھاندنا کس قدر آسان ہوتا۔

جب تک یہ لوگ اور کوئی طریقہ سوچتے۔ شیٹی نے آواز دی ''بوگی''۔ دراصل اس نے بارش میں شمس الدین کو اپنے کمرے کی طرف بھاگ کر آتے ہوئے دیکھ لیا۔ شمس الدین نے لائٹ کا سوئچ دبایا...... کچھ نہیں۔ بلب تھا ہی نہیں، حالانکہ اسے کیا معلوم۔ کتنی بار سوئچ آن آف کیا گیا لیکن کمرے میں بدستور اندھیرے کی حکومت قائم رہی۔ شیٹی اٹھ کر سامنے کھڑا ہو چکا تھا، اس نے کہا، '' کیا بات ہے شمس الدین؟ اس طرح بارش میں کیوں بھاگ رہے ہو؟''

شمس الدین کسی طرح کا جواب دینے کے بجائے شیٹی کی بغل سے اندر جھانکنے کی مستقل کوشش کرتا رہا، لیکن جس طرف شمس الدین جھکتا شیٹی بھی اسی طرف جھک کر شمس الدین کے سامنے آ جاتا۔

''ابھی یہاں کیسی آواز ہوئی تھی؟'' شمس الدین نے دریافت کیا۔

'' آواز؟ کیسی آواز؟ یہاں تو کوئی آواز نہیں ہوئی۔ تم نے بادلوں کی گھن گرج سنی ہوگی،'' شیٹی نے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ شمس الدین اس کی اس بات پر یقین نہیں کرے گا۔ مگر ان حالات

میں اس کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔ اس وقت شمس الدین ایک ایسی بلی کی طرح نظر آ رہا تھا جو صوفے میں دبکے ہوئے چوہوں کو سونگھ تو سکتی تھی پر ان تک پہنچ نہیں سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دھیرے دھیرے واپس چلا گیا۔

اگر بلب ہوتا اور کمرے میں روشنی ہو گئی ہوتی تو شمس الدین کے سامنے ہوتے بیچ کمرے میں رکھے ہوئے تین تین تھیلے، اپنی جگہ سے آگے کھسکی ہوئی چارپائی، ان کے نیچے تتر بتر ڈبے اور جوتے وغیرہ اور سب سے دلچسپ ہوتا بستروں کا نظارہ، ہیری اور ملند جہاں سوتے تھے وہاں پر تکیوں اور کمبلوں سے تیار شدہ "ڈمی" تو گیری کی چارپائی پر خود گیری اور ان کے پہلو میں آرام کرتی ہوئی ان کی اپنی "ڈمی"۔ بوگی کی کال سنتے ہی گیری کود کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا، ہیری دروازے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑے ہو گئے اور تو اور ملند فرش پر دیوار کے ساتھ دبکے پڑے رہے۔ دیوار کے اس پار کنکریٹ کے بنے مضبوط پلاسٹر کو توڑنے کی جلد بازی اتنے دنوں کی پلاننگ اور محنت پر آج لمحوں میں پانی پھیر سکتی تھی۔

شمس الدین کے ہٹتے ہی ملند نے سب سے پہلے ایک کپڑا پلاسٹر کے سوراخ میں ٹھونسا پھر سارا سامان جلدی جلدی ٹھیک سے اپنی اپنی جگہ لگایا۔ آج تو بال بال بچ گئے۔ مگر ایک بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ پہلے پلاسٹر کو کھرچ کھرچ کر اتنا ہلکا اور کمزور کرنا پڑے گا کہ صرف ہتھیلی کے ذرا سے ہی زور سے بات بن جائے مگر گارڈ اتنے چوکنے ہو گئے تھے کہ سرنگ پر کام کرنا آسان نہیں رہ گیا تھا۔ یہ بھی خدشہ تھا کہ کسی بھی وقت دیوار کے باہر سے کسی کی نظر پلاسٹر کے سوراخ اور اس میں ٹھونسے ہوئے کپڑے پر پڑ سکتی تھی، کیوں کہ بے شمار لوگ دیوار کے سہارے سائکلیں کھڑی کرنے آتے تھے۔ مگر جیسا عموماً ہوتا ہے کہ لوگ دیکھتے تو ہیں لیکن ایسے معاملات میں گہرائی سے نہیں سوچتے اور درگذر کر جاتے ہیں اور بات دبی کی دبی رہ جاتی ہے لیکن ایک دن کسی نے اس کپڑے میں اپنی دلچسپی ظاہر ہی کر دی۔ قریب ہفتے بھر بعد جب ملند نے ایک روز سرنگ پر کام کرنے کے ارادے سے اینٹیں ہٹائیں تو دیکھا کہ باہر سے کوئی وہ کپڑا گھسیٹ رہا تھا، ملند نے جھٹ سے کپڑے کا اندرونی حصہ پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر تک کھینچا تانی چلتی رہی ملند نے گیری کو آگاہ کیا کہ کوئی باہر سے کپڑا گھسیٹ رہا ہے اور خطرہ ہو سکتا ہے اتنی دیر میں ایک "میاؤں" کی سریلی سی

مگر کرخت آواز نے یہ بتایا کہ کپڑا گھسیٹنے والا کوئی اور نہیں بلکہ ایک عام سابلاّ تھا۔ ارے یہ تو بلا ہے، کہتے ہوئے ملند نے کپڑا کھینچ لیا اور باہر کی طرف جھانکا تو آنکھیں سیدھے بلے کی چمکتی ہوئی آنکھوں سے جا ٹکرائیں۔ بے شک آواز اور حرکت سے واقفیت کے بعد ہی وہ بلا اپنے شکار کی تلاش میں آیا تھا ملند نے سوراخ سے نہ کہ صرف بلے کو بلکہ رات کی چاندنی میں شرابور باہر کا میدان اور باونڈری کی دیوار بھی دیکھی۔ یہ تھی آزادی کی ایک ہلکی سی جھلک جس نے اتنے دنوں کی تکان لمحہ بھر میں ہی اچھی خاصی کم کردی۔

یہ اگست کی شروعات تھی۔ ہندوستان میں پھنسے پاکستانی فوجی قانونی طور پر بنگلہ دیش کے قیدی تھے۔ ایک طرف بنگلہ دیش کی مانگ تھی کہ پاکستان پہلے اسے قبولیت دے اور اس کے ''وجود'' کو تسلیم کرے تبھی کسی طرح کی گفتگو ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف تقریباً آدھا ملک گنوا دینے سے زخمی اور دکھی پاکستان صرف حیلہ حوالی کرنے پر مجبور تھا۔ قیدیوں کا تبادلہ اس سیاسی مسئلے سے جڑ کر ہر طرف ناامیدی کا سبب بن گیا تھا۔ پھر بھی اصحاب قلم اور اخبار نویس اندازہ لگا رہے تھے کہ بھٹو پاکستان کی آزادی کے دن یعنی چودہ اگست کے روز بنگلہ دیش کو ضرور قبولیت بخش دیں گے۔ دونوں طرف کے قیدی بھی اس اعلان کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ منوہر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ملند وغیرہ کی ناکامی کے پیچھے کوئی غیبی طاقت تھی کیوں کہ ان لوگوں کو سب کے ساتھ ہی عام طریقے سے محفوظاً اپنے وطن واپس لوٹنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملند وغیرہ پر اور دباؤ پڑنے لگا کہ جیل توڑ کر راہِ فرار اختیار کرنا صرف اور صرف بے وقوفی ہوگی۔ مگر جہاں تک ملند وغیرہ کا سوال تھا تو تیاریوں میں رتی بھر بھی کمی نہیں تھی۔ اس درمیان سرنگ کے پلاسٹر کو گھس گھس کر اتنا پتلا کر لیا گیا تھا کہ ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی بھی اس کا کام تمام کردینے کے لیے کافی تھی۔

گیارہ اگست کو ذوالفقار علی بھٹو کی تقریر ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والی تھی۔ ہندوستانی قیدیوں کے اصرار پر انھیں ڈائننگ ہال میں ٹی وی دکھانے کا انتظام کیا گیا۔ بنگلہ دیش کے بارے میں بھٹو صاحب نے صاف اعلان کیا کہ اس ملک کو منظوری دینے کے سوال پر نیشنل اسمبلی میں کسی طرح کی بحث کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیوں کہ نام نہاد بنگلہ دیش پاکستان کے سامنے ایسی شرطیں رکھ رہا تھا جو پاکستان کو کسی صورت میں قبول نہیں ہو سکتی تھیں۔ ہندوستانی قیدیوں کی امیدوں پر پانی

پھر گیا۔ سبھی حیرت زدہ منہ لٹکائے بیٹھے رہ گئے۔

''اب اور انتظار کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا'' ملند کے جملے نے خاموشی توڑی۔ اس کے چہرے پر اس وقت ایک قسم کے مضبوط اور مستحکم ارادوں کی چمک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

''تو...... کل!'' ہیری بھی اسی لہجے میں بولا۔ ''ویسے وقت بھی ٹھیک ہے۔ تیرہ اور چودہ کو چھٹیاں ہیں۔ کسی طرح کے ردِ عمل کی صورت میں انتظامیہ اتنا مستعد نہیں رہے گا جتنا کہ عام دنوں میں رہ سکتا ہے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت بھی مل جائے گا۔''

اگلے دن شام کے کھانے کے بعد پچھلی تمام کوششوں کو آخری جامہ پہنایا گیا۔ بارہ اگست کی آدھی رات بلکہ تیرہ اگست کی صبح صفر بج کر پندرہ منٹ پر ہی گیری سرنگ کا باقی پلاسٹر توڑ کر اس طرح سرنگ میں لیٹا ہوا تھا کہ اس کا آدھا دھڑ کمرے سے باہر تھا۔ جیل سے باہر چاروں طرف اسے آزادی ہی آزادی نظر آ رہی تھی۔ جلدی سے ہیری نے الوداع کہا اور سرک کے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد شیٹی اور سب سے آخر میں ملند۔ ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ دھول کے غبار چاروں طرف اٹھ رہے تھے۔ باہر نکل کر تینوں بلڈنگ کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے۔ اب اگلے اقدام کا فیصلہ کرنا تھا۔ طوفان میں شدت آتی جا رہی تھی۔ دھول کے بادل بڑھتے جا رہے تھے۔ رکروٹنگ آفس کا چوکیدار ٹھیک ان کے سامنے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر ہی بیٹھا ہوا تھا مگر خود کو اپنی چادر میں پوری طرح لپیٹے ہوئے۔ گیری چپ چاپ اٹھ کر دیوار کے پاس پہنچا اور اپنے آپ کو اوپر اٹھا کر باہر کی سڑک کا پوری طرح جائزہ لیا۔ اس وقت کافی تعداد میں لوگ طوفان سے بچنے کے لیے خاصی رفتار میں ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے قریب ہی کے کسی سنیما گھر کا آخری شو ختم ہوا ہو۔ گیری دیوار کے پہلو میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب پھر شیٹی نے دیوار سے اوپر سر نکال کر دیکھا تو خاصہ سناٹا ہو چکا تھا۔ اس نے ہیری اور ملند کو اشارہ کیا اور ایک پل میں تینوں نے دیوار پھاند کر سڑک پر آ گئے۔ مال روڈ سے پنڈی پیشاور ہائی وے کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ اس وقت تقریباً بارہ بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔

ہائی وے پر پہنچتے پہنچتے ہیری پر خوشی کا نشہ سوار ہونے لگا اس نے گنگناتے ہوئے پنجاب کا روایتی بھنگڑہ شروع ہی کیا تھا کہ گیری نے پیچھے پلٹ کر ایک دولتی جڑتے ہوئے کہا، ''چپ رہ

آزادی کے دیوانے۔ سفر بہت لمبا ہے۔ سارا نشہ یہیں نہ اتار لے۔"

ہیری نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ انھیں اب کیا کرنا ہے۔ ہاں سب سے پہلے عام آدمی کی طرح چال ڈھال اور برتاؤ۔ لہٰذا اس نے فوراً جیب سے ایک پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگائی اور کش لیتے ہوئے اس طرح سڑک پر چلنے لگا جیسے کوئی کسی سنیما گھر سے نکل کر جا رہا ہو۔ دوسری چیز ایک دوسرے کو آپس میں نئے ناموں سے پکارنا۔ ملنداب "جان مسیح" تھا۔ جان مسیح پاکستانی ایئر فورس کے ایک ایسے عیسائی ایئر مین ہیں جو اس وقت لاہور میں تعینات تھے۔ پٹھانوں کے رنگ روپ والا گیری اب علی امیر تھا وہ بھی ایئر مین کی ہی حیثیت سے لاہور ہی میں تعینات تھا۔ ان تینوں میں ہیری سب سے الگ انگریزوں جیسی طبیعت کے تھے۔ انھیں اردو اور ہندی بھی ٹھیک سے بولنی نہیں آتی تھی۔ اس لیے ان کی نئی شناخت مسٹر ہیر اللہ جیکب کے طور پر تھی۔ ہیر اللہ اینگلو پاکستانی تھے جو کراچی کے ایک بینڈ میں ڈرم بجاتے تھے۔ تینوں کراچی میں تعیناتی کے دوران ہی ایک دوسرے سے ملے تھے اور اب آپس میں ایسے دوست ہو گئے تھے جن میں کسی طرح کے کسی تکلف کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ تینوں اس وقت چھٹی پر تھے اور اتر پچھمی علاقوں میں سیر و تفریح کی غرض سے گھومنے جا رہے تھے۔

"علی!!!" ہیری نے پیچھے سے پکارا۔

"علی امیر..........." اس نے دوبارہ آواز دی۔

"کیا بک رہا ہے یار،" گیری نے کہا۔

"میں تجھ ہی سے بول رہا ہوں اور تو ہے کہ سن ہی نہیں رہا ہے۔ تجھے اپنا نام تک یاد نہیں؟"

ہیری کا حساب برابر تھا۔

جیسے ہی وہ اوڈین سنیما کے سامنے سے گذرے۔ بارش کی بوندیں گرنا شروع ہو گئیں۔ اچھی بات تھی سڑک پر شاید کوئی نہ ملے۔ ہائی وے کی طرف مشکل سے سوگز آگے بڑھتے ہی علاقے کی بجلی غل ہو گئی۔ اس پورے ضمنی برّ اعظم میں دوران طوفان بجلی کا غائب ہونا ایک عام سی بات مانی جاتی ہے۔ چاروں طرف کا گھپ اندھیرا تینوں کو اور بھی راس آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ قسمت پوری طرح مہربان ہے۔

''مجھے شیٹی کی بہت فکر ہو رہی ہے،'' ملند نے کہا۔ ''ہم لوگوں کے فرار ہونے کا راز کھلتے ہی پتہ نہیں اس بے چارے پر کیا گزرے گی۔ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک ہو۔ گارڈ اس کو گولی بھی مار سکتے ہیں یہ دکھانے کے لیے کہ تین تو بھاگ گئے لیکن چوتھے کو گرا لیا گیا اس سے ان کی لاپروائی قدرے کم دکھائی دے گی۔''

''ہاں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے،'' گیری نے کہا۔

اس کے بعد وہ دبی زبان میں کبھی کا ذکر کرنے لگے۔ اس نے کس طرح ہر طریقے سے ان کی مدد کے لیے سامان تیار کیے۔ ذہنی طور سے وہ برابر ہمارے ساتھ شریک رہا یہ اور بات کہ جسمانی طور سے وہ ہمارے ساتھ آنے میں لاچار تھا۔ جس کا آخر تک اسے افسوس بھی رہا۔ پھر وکرم کی شروع سے آخر تک مکمل حمایت اور رہنمائی۔ لیکن ملند یہ بھی سوچنے لگا کہ مقصد کی حصولیابی کی طرف بڑھتا ہوا وکرم کیا انسانیت کو بھی اتنی اہمیت دیتا تھا جتنا کہ مقصد کو؟ وہ ہمیشہ خاص کارنامے انجام دینے کے لیے خاص لوگوں کا انتخاب کرتا تھا۔ انھیں ٹریننگ اور رہنمائی کا فائدہ بھی دلواتا تھا۔ پھر نشانے کی حصولیابی کی طرف دھکیل دیتا تھا۔ کامیابی بھی اسے زیادہ تر نصیب ہی ہوتی تھی، اور اگر ناکامی کا سامنا ہوا تو اس کا ردِ عمل بھی یہی ہوتا تھا کہ ناکامی کی وجوہات دوبارہ گہرائی سے سوچا جائے۔ کسی مہم میں اگر کسی کو کوئی نقصان ہو جائے تو وکرم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جیل سے بھاگنے کی اس کوشش میں اگر کوئی نقصان ہوتا ہے یا کسی کی جان بھی چلی جاتی ہے تو وکرم کا دماغ صرف وجوہات ڈھونڈنے میں ہی مصروف رہے گا تاکہ آئندہ کبھی ایسی غلطیوں کا امکان نہ رہ جائے۔ ہاں وہ بہت ہی خوبصورت اور دل کو چھو لینے والا خط فوراً گھر والوں کو ضرور لکھے گا۔ دل سے، دکھاوے کے لیے نہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کسی اور مقصد، کسی اور آدمی کی تلاش شروع کر دے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ کسی بھی طرح کے حالات کا سامنا ہو خود بھی پیچھے نہیں رہ سکتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اگر کبھی اوپر پہنچ گیا تو فوراً ٹھوڑی پر ہاتھ ٹکا کر یہ سوچنے میں مصروف ہو جائے گا کہ آخر موت اور ناکامی کی صحیح وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

چلتے چلتے وہ ایک تانگہ اسٹینڈ سے گزرے۔ ایک دو تانگے والے جو جگ رہے تھے ان کی طرف دھیان سے دیکھتے رہے لیکن بولے کچھ نہیں۔ یہ تینوں اور چوکنا ہو گئے۔ شاید وہ عام لوگوں

سے الگ دکھائی دے رہے تھے۔ تقریباً آدھا میل اور چلنے کے بعد پیشاور کا بس اڈہ ملا۔ سڑک کے کنارے کھڑی ایک بس کا ڈرائیور پیشاور...... پیشاور...... چلا کر مسافروں کو بلا رہا تھا۔ تینوں نے اپنے مقدر کو پھر سراہا اور فوراً بس میں سوار ہو گئے۔ ملند بائیں طرف کی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ گیری اور ہیری اور اس کے پیچھے کی سیٹ پر قبضہ جمایا۔ گیری کو اپنے داہنے ہاتھ میں پڑا کڑا بری طرح کھٹک رہا تھا۔ دراصل علی امیر کے کردار سے اس کڑے کا کوئی میچ ہی نہیں تھا۔ گیری نے جیل میں اس کڑے کو اتارنے یا کاٹنے کی بہتری کوششیں کر ڈالیں مگر اسے کسی طور پر بھی کامیابی نہ مل سکی۔ بس میں کافی سیٹیں ابھی بھی خالی تھیں اس لیے چلنے میں دیر ہو سکتی تھی۔ تھوڑی دیر میں ڈرائیور نے اندر کی لائٹ جلا دی، ملند سوچنے لگا کہ اگر ہم لوگ کچھ وقت اندھیرے میں باہر رہ کر ہی گذارتے تو بہتر ہوتا۔ لیکن باہر کا بھی کوئی بھروسا تو تھا نہیں۔ آخر اجالے سے بچنے کی جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی تو تینوں نے اپنے سر اگلی سیٹوں پر جھکا دیے بالکل ویسے ہی جیسے بے خبر سو رہے ہوں۔ رات کے تقریباً ڈھائی بجے بس چلی ہی تھی کہ ایک لڑکا کرایہ وصول کرنے کی غرض سے آ کر سر پر سوار ہو گیا، ملند نے جیب سے روپئے نکال کر دیے اور پیچھے بیٹھے ہیری اور گیری کی طرف اشارہ کر کے تین ٹکٹ لے لیے۔

بس دو گھنٹے متواتر چلتی رہی۔ ان لوگوں نے اس دوران ایک نیند بھی لے لی۔ راستے میں ایک ڈھابے پر بس رکی سب لوگ نیچے اترے تو یہ بھی ساتھ ہو لیے۔ سبھی پہلے ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے جا رہے تھے لہٰذا ان تینوں نے بھی خود کو سب کے ساتھ شامل کر دیا۔ ہیری سوچ رہا تھا کہ انگریز چاہے جتنی مخالفت کریں لیکن اپنے پوربی علاقوں میں کھلے میدان کی فراغت ایک قسم کا الگ ہی مزہ دیتی ہے۔ نہ تو کسی سے پاخانے کی جگہ پوچھنی ہے اور نہ ہی کہیں کوئی حمنت ہی کرنا ہے۔

ملند نے یکایک ہنستے ہوئے کہا، "یار مجھے تو احساس ہی نہیں ہو رہا ہے کہ ہم کسی خطرناک اور جان لیوا مہم پر ہیں۔"

"بالکل ایسا لگ رہا ہے کہ ہم کسی بس میں بیٹھ کر دلّی سے امبالا جا رہے ہیں۔ بس فرق اتنا سا ہے کہ جیمس بانڈ کی فلم کی طرح بیک گراؤنڈ میوزک نہیں ہے،" ہیری نے اپنے تصورات بتائے۔

اس طرح تینوں ہنسی مذاق کرتے ہوئے ڈھابے کے باہر پڑی ہوئی ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئے۔ گیری کی نگاہ سیدھے ایک نوجوان سے ٹکرائی جو اتنی بھور میں ہی چائے کے ساتھ ایک موٹا پر اٹھا کھا رہا تھا۔ مگر ملند نے سب کے لیے صرف چائے ہی منگوائی یہ اور بات کہ گیری نے چائے کا ایک دوسرا گلاس بھی طلب کیا۔

صبح ہوتے ہی بس پیشاور پہنچ گئی۔ تینوں پہلے ہی اسٹاپ پر اتر کر سامنے ہی ایک ڈھابے میں جا بیٹھے اس وقت آئندہ پیش آنے والے حالات کا جائزہ لینا اور آگے کے لیے سوچنا سمجھنا ضروری تھا۔ ایک لڑکا چینی مٹی کی کیتلی میں چائے لے کر حاضر ہوا۔ چین کی بنی بہت ہی پرانی سی اس کیتلی نے ڈھابوں کے ذریعے جانے کتنی نسلوں کو چائے پلائی ہوگی۔ اس وقت تک اس کے بے شمار ٹکڑے ہو چکے تھے لیکن کسی طرح کی گوند یا کسی مخصوص قسم کے مسالے سے اس کے ٹکڑوں کو اس ہوشیاری سے جوڑا گیا تھا کہ اپنے آپ میں کسی جدید ڈیزائن کا نمونہ معلوم ہو رہے تھے۔ کیتلی کو بڑی ہی احتیاط سے تار کا ایک جال بنا کر اس میں قید کر دیا گیا تھا تا کہ اس کے ٹکڑے پھر سے الگ نہ ہونے پائیں۔ بہر حال اس میں رساؤ بالکل نہیں تھا اور اس کیتلی سے بھاپ اٹھتی ہوئی گرما گرم، کڑک اور میٹھی چائے تیزی سے لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ ہیری بڑی ہی چاؤ سے کیتلی کا جائزہ لے رہے تھے۔ اگر وہ عام حالات میں سفر کر رہے ہوتے تو بابا آدم کے زمانے کی ایسی نایاب کیتلی حاصل کرنے کی ضرور کوشش کرتے۔

''یقین نہیں ہوتا کہ ہم لوگ صرف پانچ گھنٹوں میں پیشاور پہنچ گئے،'' گیری نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں مگر اب آگے تو بڑھئے۔ پاکستان ریڈیو پر صبح کی خبر میں ہمارے جیل سے بھاگنے کا ذکر ہو سکتا ہے،'' ملند نے کہا۔

سڑک پار کر انھوں نے ایک خالی تانگہ روکا۔ گیری اپنے رنگ روپ اور پنجابی لب و لہجے میں مہارت کے بل بوتے پر کرایہ وغیرہ طے کرنے کی غرض سے آگے آگئے۔ ادھر کچھ آٹو رکشا بھی آ جا رہے تھے۔ ملند اور ہیری نے دیکھا کہ ہر ایک ڈرائیور کارتوسوں سے بھری ایک پیٹی کمر میں ضرور لگائے ہوئے تھا ساتھ ہی ان کے ہینڈل سے ایک عدد رائفل بھی ضرور ٹنگی ہوئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ یہ ڈرائیور حضرات کسی بھی وقت آپس میں فائرنگ شروع کر سکتے ہیں ملند نے آٹو کا خیال ہی

ذہن سے نکال دیا۔

''کہاں جانا ہے؟'' تانگہ والے نے دریافت کیا۔

''ہمیں جمرود روڈ جانا ہے۔ کتنے لو گے؟'' گیری نے پوچھا۔

''جمرود روڈ یا جمرود چوک؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ہاں جمرود چوک ہی۔ پتہ ہے،'' گیری نے کہا۔

تانگے والا انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ اسے کچھ نہ کچھ اٹپٹا ضرور لگ رہا تھا لیکن شاید اسے دن کی پہلی 'بوہنی' کی زیادہ فکر تھی لہٰذا اس نے فوراً چار روپئے بتا دیے۔

''چا.....ر روپئے؟'' گیری نے اچنبھے سے پوچھا۔ ''وہ بھی اتنے کم راستے کے لیے؟ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ تین روپئے لے لیں، ہم تینوں کے ایک ایک روپئے کے حساب سے۔''

''جناب اس سے بہتر تانگہ اور اس سے خوبصورت گھوڑا پورے پیشاور میں نہیں ہے دوسرے اور کوئی تانگہ مشکل سے ہی ملے گا،'' تانگے والے نے فیصلہ سنا دیا۔

''اچھا چلیے مگر ذرا تیز چلیے گا،'' گیری نے بڑی سنجیدگی سے اس لیے کہا کہ تانگے والے سے بازی ہار کر کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ خود وہ سامنے بیٹھ گیا ملند اور ہیری پیچھے۔ چابک ہوا میں لہرائی اور گھوڑا مستی کی چال چل پڑا۔

''جمرود چوک..........'' تانگے والا بولا۔ ''جمرود چوک میں کس جگہ جانا ہے؟'' اس نے جب سے ان کچھ بے تکوں پر نظر ڈالی تھی تبھی سے ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری اکٹھا کر لینے کے فراق میں پڑا ہوا تھا۔ وہاں ایک اخبار کا دفتر ہے ہم آپ کو بتا دیں گے۔ گیری نے جواب دیا۔ پنجابی کا پنجابی میں، یہ سوچ کر جواب دیا گیا کہ یہ ان پڑھ تانگے والا اخبار اور لکھنے پڑھنے کے بارے میں زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کرے گا۔

''آپ لوگ اخبار نویس ہیں؟'' تانگے والے نے آسانی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں ہمیں اس اخبار کے دفتر کے پاس ہی ایک جگہ جانا ہے،'' گیری نے جلدی سے کہا۔ ''آپ وہاں ملازم ہیں؟'' تانگے والا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

''نہیں ہم لوگ نوکری کے لیے انٹرویو دینے جا رہے ہیں،'' گیری نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔'' آج چھٹی کے دن انٹریو؟''

ملند اس گفتگو سے فکر مند ہو کر کچھ کہنے ہی والا تھا لیکن یہ سوچ کر خاموش رہ گیا کہ گیری کا پنجابی میں ہی بات کرنا مناسب تھا۔

گیری نے پینترا بدلا اور تھوڑا جھنجھلاتے ہوئے کہا،'' دیکھئے ہم یہاں کام سے آئے ہیں اور آپ ہیں کہ پولس والوں کی طرح سوالوں کا جال بچھائے چلے جا رہے ہیں۔ خیر جاننا ہی چاہتے ہیں تو سنئے آج ہم وہ جگہ اور دفتر وغیرہ دیکھ لیں گے' کل یہاں سیر کریں گے، گھومیں پھریں گے اور پھر پرسوں انٹرویو کے لیے حاضر ہو جائیں گے اور کوئی سوال؟''

کچھ ہی لمحوں میں وہ چوک پہنچ گئے۔'' آپ یہیں اتریں،'' تانگے والے نے کہا۔ ہیری نے جیب سے ایک پانچ کا نوٹ نکال کر دیا جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے تانگے والے نے انگریزی میں کہا،'' نو چینج۔''

''رکھیے کوئی بات نہیں،'' ہیری نے احتیاط سے ہندوستانی میں کہا۔

تانگے والا انھیں دھیان سے دیکھتا رہا۔ معمولی سے کپڑوں میں یہ تین نوجوان نوکری کی تلاش میں یہاں آئے تھے پھر بھی سات منٹ کا سفر کا چار روپیہ دے بیٹھے اور ایک روپیہ بخشیش بھی۔ ضرور کہیں کچھ عجیب سا تھا۔ لیکن صحیح جگہ پر وہ انگلی نہیں رکھ پا رہا تھا۔ اگر تھوڑا وقت اور مل جاتا تو یہ گتھی سلجھائی جا سکتی تھی۔

''اگر پتہ بتا دیں تو میں آپ کو وہیں پہنچا دوں، آپ کو دقت بھی نہیں ہوگی اور کرایہ بھی زیادہ نہیں دینا پڑیگا،'' تانگے والے نے کہا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ابھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم لوگ کچھ دیر یہیں گھومیں پھریں گے۔ بعد میں جہاں جانا ہے جائیں گے،'' اتنا کہتے کہتے گیری نے اپنی چال تیز کر دی۔ جمرود چوک کی سڑک پر کچھ دور آگے جانے کے بعد ہیری نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو تانگے والا وہیں کھڑا ان کی طرف گھورتا دکھائی دیا۔

'' تانگے والے کو کچھ شک ہو گیا ہے اس لیے جلدی سے کسی طرف مڑ کر اس کی نظروں سے

کچھ سوالات کر لیے تو سمجھ لیجئے یہیں قصہ ختم،'' ہیری نے کہا۔

ملند کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر بولا۔ ''اگر ہم پھر کوئی بس پکڑ کر آگے چلیں تو؟'' یہ بات سبھی کو مناسب لگی۔ اگر چھپنے کی کوئی جگہ میسر نہیں ہے تو آگے ہی بڑھیں۔ واپس سڑک پر آتے ہی ایک بس دکھائی دی۔ یہ لوگ سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ تین تین سواریاں دیکھ کر ڈرائیور نے بس روک دی اور انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بس کچھا کچھ بھری ہوئی تھی۔ ایک مچھر تک اندر نہیں گھس سکتا تھا۔ کچھ لوگوں کو بس کی چھت پر بیٹھا دیکھ کر یہ تینوں بھی پیچھے سے اوپر چڑھ کر بیٹھ گئے اور بس تیزی سے چل پڑی۔ راستے میں تقریباً پانچ یا چھ جگہ روکی گئی اور ہر بار وردی دھاریوں نے بس کے اندر اور اوپر رکھے سامانوں کی جانچ کی اور چلے گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں۔ کیونکہ سامانوں کے معائنے کے بعد بس چھوڑ دی جاتی تھی۔ جب جب تلاشی ہوئی یہ تینوں ہر بار بھگوان کے سہارے خاموشی سے بیٹھے رہے۔ اس طرح ٹھیک نو بجے یعنی جیل سے بھاگنے کے نو گھنٹے بعد بس جمرود فورٹ پہنچ چکی تھی۔

سرحد کے اس علاقے میں دکھائی دینے والے ہر فرد کے کاندھے پر بندوق یا رائفل ضرور ٹنگی رہتی تھی ساتھ ہی سب کی پیٹیاں گولیوں اور کارتوسوں سے بھری رہتی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہاں آدمی آدمی کے درمیان اسلحوں کی ہوڑ اپنی انتہا پر تھی۔ صرف وہ بچے جنھیں ابھی سلیقے سے مونچھیں بھی نہیں آئی تھیں، نہتے گھومتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ افق پر پہاڑیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ پہاڑوں کے درمیان میدان بالکل صاف تھے۔ حد ہے کہ سڑکوں کے کنارے بھی کوئی پیڑ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ میدانی علاقوں میں قلعہ نما مکانات پتھروں سے تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ مکان ایک دوسرے سے کم سے کم پانچ سو گز کے فاصلے پر تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ خاص قبیلوں نے رائفل کی مار کو ذہن میں رکھ کر یہ مکانات دور دور تعمیر کروائے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی ان کے قریب سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ ملند سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طریقے سے یہ میدان پار کر لیا جائے تو پہاڑوں سے ہوتے ہوئے آسانی سے افغانستان پہنچا جا سکتا تھا۔ اسی غور فکر کے درمیان ہیری وغیرہ کی نگاہ اس طرف جا کر ٹھہری جہاں کچھ بورڈ لگے ہوئے تھے۔

''خبردار''

''باہر سے آنے والوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ سڑک سے نیچے نہ جائیں۔''

پھر

''آپ قبائلی علاقے میں داخل ہو رہے ہیں۔''

اور

''قبائلی عورتوں کی تصویر کشی پر سخت پابندی ہے۔''

اور پھر

''دّرہ خیبر صرف دن میں ہی پار کریں۔''

اور آخر میں

''خیبر میں آپ کا استقبال ہے۔''

ان اشتہارات کو غور سے پڑھنے کے بعد ہیری نے کہا۔ ایک بورڈ اور ہونا چاہیے جس پر لکھا ہو کہ............

''اب آپ صرف خدا کے سہارے ہیں''

سڑک پر آگے چل کر یہ لوگ خیبر گیٹ سے گذرے۔ قبائلی مڑ مڑ کر انھیں دیکھ رہے تھے۔ ایک چھوٹا بچہ سڑک پر سائیکل کے ٹائر سے کھیل رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ٹائر پر تھا اور دوسرے ہاتھ میں کھیلنے کی پستول۔ ہیری کے پاس آ کر اس نے پستول تانی اور زور سے بولا۔ 'بینگ'

ہیری نے پھر اپنی انگلی اس کی طرف اٹھا کر کہا۔ بینگ .... بینگ بچہ زور سے ہنسا اور بولا انگریز ہے؟

''نہیں انگریز نہیں پاکستانی ہے،'' ہیری نے جلدی سے کہا۔

''نہیں پاکستانی نہیں ہندوستانی ہے،'' بچہ پھر ہنس کر بولا۔

اتنا سنتے ہی تینوں سن رہ گئے۔ اگر ایک چھوٹا سا بچہ اس طرح سوچ سکتا تھا تو اور لوگ کیا کیا سوچ سکتے ہیں۔

ہیری نے کچھ گھبراہٹ اور غصّے میں کہا،'' بہت بدتمیز ہے ہمیں ہندوستانی کہتا ہے؟ بھاگ یہاں سے۔'' بچے نے تیزی سے ٹائر گھمایا اور آگے نکل گیا۔ مگر کبھی کبھی مڑ کر ان لوگوں کی طرف

اوجھل ہو جایا جائے،" ہیری نے کہا۔

یہ لوگ بائیں طرف جاتی ہوئی پہلی سڑک پر فوراً مڑ گئے۔ اس کے بعد دوبار داہنے مڑ کر واپس جمرود روڈ آ گئے۔ دراصل یہ لوگ ادھر ادھر گھوم پھر کر کوئی ایسی جگہ تلاش رہے تھے جہاں دن بھر چھپ کر آرام کیا جا سکے مگر تین میل چلنے کے بعد بھی مکان و دوکان سے خالی کوئی جگہ نہ ملی۔ ایسے گھنے علاقے میں رفع حاجت کے علاوہ سڑک چھوڑنے پر کسی کو بھی شک ہو سکتا تھا۔ مگر کیا کیا جائے؟ افغانستان کی سرحد یہاں سے صرف چھبیس میل دور تھی۔ اتنا راستہ دو منزلوں میں پورا کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ بھی ایک مسئلہ تھا کہ چھپا کہاں جائے؟ اپنے کپڑوں میں یہ لوگ ویسے بھی سب کی آنکھوں میں چبھ رہے تھے۔ دو لوگ ڈھیلی ڈھالی قمیص اور پینٹ میں، ایک ہرے رنگ کے پٹھانی سوٹ میں جاتے ہوئے راہگیر انھیں دیکھ کر لوٹ پڑتے تھے، سائیکل سوار تو ان کے چاروں طرف" ایک چکر لگا کر انھیں غور سے دیکھتے تھے۔ کچھ تو سائیکل سے زمین پر ایک پیر ٹیک کر ان کا معائنہ کرتے تھے۔ ان کی بے چینی بڑھنے لگی شک میں کوئی پوچھ بیٹھے گا اور پھر پکڑے جائیں گے۔ ہیری فوراً سو قدم پیچھے ہو گیا، یہ سوچ کر کہ اکیلا آدمی ایک جوڑا آنکھ میں نہیں گڑتا۔ تین لوگ کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہوئے ضرور دیکھے جاتے ہیں۔

ہیری یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ نئی عمر کا ایک پٹھان لڑکا اپنی سائیکل دھیمی کر کے ہیری کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اردو میں پوچھا،" تھیلے میں کیا لے جا رہے ہو؟"

" کچھ نہیں۔ کھانا اور پینے کا پانی،" ہیری نے کہا۔

" کھانا؟ کھانا کیوں؟" لڑکے نے پوچھا۔

" ایسے ہی ہم لوگ گھومنے نکلے ہیں۔ کہیں کھلی جگہ پر بیٹھ کر دن میں ساتھ کھائیں گے،" ہیری نے کہا۔

" صرف کھانا ہے یا آٹا لیے جا رہے ہو؟" لڑکے کے پوچھنے پر ہیری بھانپ گیا کہ ہو سکتا ہے کہ علاقے میں آٹا کم ملتا ہو یا راشننگ پر ہو اور اس کی اسمگلنگ ہوتی ہو اور اس وقت یہ لڑکا ایسا ہی چوری کا مال خریدنے کی کوشش میں ہو۔

" نہیں نہیں آٹا نہیں صرف پکا ہوا کھانا ہے،" ہیری نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ " مگر یہ تھیلا تو بڑا ہے۔ بھاری بھی ہوگا۔ چلیے میں اسے سائیکل پر لیے چلتا ہوں اور چاہیں تو

آپ پیچھے بیٹھ بھی لیں۔''

''میں اکیلا نہیں ہوں،'' ہیری نے کہا۔'' میرے ساتھ دو اور لوگ ہیں سب کو سامان کے ساتھ لے چل پاؤ گے؟''

پٹھان لڑکے نے سڑک پر تھوڑا آگے آگے چلتے ہوئے ملند اور گیری کو دیکھا۔ ایک تو ٹھیک تھا مگر تین تین اسمگلروں سے ایک ساتھ پار پانا مشکل ہو سکتا ہے۔ شاید یہی سوچ کر وہ نوجوان اپنی سائیکل موڑ کر پیچھے کی طرف لوٹ گیا۔

سورج سر پر آچکا تھا۔ دھوپ اور گرمی تیز ہوتی جارہی تھی۔ جیل سے بھاگنے کا جوش اور خوف ساتھ ہی راستے کی تھکاوٹ۔ ان سب کا اثر تینوں پر ظاہر ہونے لگا تھا۔ وہ آبادی سے ہٹ کر کہیں چھپنے اور آرام کرنے کی جگہ ڈھونڈنے کے لیے اتاولے ہو رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف مکانات اور دکانیں آپس میں اس طرح ملے ہوئے تھے کہ بیچ میں کوئی خالی جگہ ہونے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس لیے بائیں طرف جاتی ہوئی پہلی سڑک پر ہی تینوں مڑ گئے۔ یہ لوگ کوئی ہزار گز ہی آگے گئے ہوں گے ایک ریلوے لائن ملی۔ انھوں نے سوچا شاید یہی خیبر کی طرف جاتی ہو۔ لیکن یاد آیا کہ 'مرے' کی کتاب میں تو یہ چھوٹی لائن بتائی گئی تھی' مگر یہ میٹر گیج تھی۔ اس کا مطلب یہ وہ لائن نہیں ہے جس کے سہارے وہ آگے بڑھ سکتے۔ آخر کار وہ پھر جمرود روڈ واپس آگئے۔ تھوڑا آگے بڑھنے پر کچھ مکانات تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے دکھائی دیے۔ انھیں یقین ہونے لگا کہ جلدی ہی چھپنے کی کوئی جگہ ضرور مل جائے گی۔ مگر ابھی آرام کا وقت نہیں آیا تھا۔ کیونکہ سامنے ہی کچھ دور پر ایک پولس چوکی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ گیری فوراً مڑ کر ایک ایسے میدان میں سب کو لے آیا۔ جہاں بورڈ پر لکھا تھا'' اسلامیہ یونیورسٹی'' یہاں بیٹھ کافی دیر تک یہ لوگ حالات کا جائزہ لیتے رہے۔

''مجھے نہیں لگتا کہ ہمیں چھپنے کی کوئی جگہ مل پائے گی۔ یہاں باغ باغیچے، کھیت کھلیان، جیسی کوئی چیز تو دکھائی نہیں دیتی،'' گیری نے کہا۔

''مگر ان کپڑوں میں یہ تھیلے ہاتھ میں لے کر چلنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ جسے دیکھو ہمیں ہی پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ اگر کوئی با اختیار ملازم یا کسی پولس والے نے کہیں روک کر

طرف لٹکی ہوئی ٹوکریوں میں تازہ سبزیاں بھر کر لے جا رہا تھا۔

''اس سے کچھ مدد مانگی جائے؟'' ہیری نے کہا۔

''نہیں نہیں ڈر سے خود ہی ہمارے بارے میں بتا دے گا۔''

گیری کو اپنے سکھ بھائیوں پر بڑا ہی ناز تھا۔ اس لیے اس نے کہا اگر میں بات کروں تو وہ ہماری مدد کرے نہ کرے، ہمیں دشمن کے حوالے ہرگز نہ کرے گا۔ حالانکہ گیری کو اس سکھ کے امتحان کا موقع ہی نہیں مل سکا کیوں کہ بات ہی بات میں وہ ایک گلی میں مڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

ملند نے چائے لانے والے لڑکے کی ٹوپی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، ''یہ پیشاوری ٹوپی کہاں ملتی ہے؟''

تقریباً پچاس گز کی دوری پر جہاں کچھ لوگ پہلے سے کھڑے تھے لڑکے نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا— ''وہاں۔''

وہ جگہ کوئی دکان نہ ہو کر صرف دیوار میں ایک بڑے سوراخ سی نظر آ رہی تھی۔ ملند اٹھ کر اس طرف جانے لگا۔ ہیری نے چائے کا پیمنٹ کیا اور گیری کو ساتھ لے کر ادھر ہی چل پڑا۔ ہیری کو اس بات کی فکر ہو رہی تھی کہ اس علاقے میں ان لوگوں کی نمائش کچھ زیادہ ہی ہو چکی تھی اس لیے جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل لینا ضروری ہے۔ اس کے باوجود ہیری نے ملند سے یہ کہہ دیا کہ وہ اینگلو پاکستانی کے کردار میں ہے اس لیے اس کی خاطر ٹوپی قطعی نہ لائے۔

ملند نے لڑکے کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر دیکھا تو وہ بڑے سے سوراخ جیسی دکھائی دینے والی دکان دراصل نیچے تہہ خانے میں تھی۔ اس تہہ خانے میں دنیا کے کونے کونے سے لائی ہوئی چیزیں بک رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اسمگلروں کا ملکہ تھا۔ ملند نے دو گول ٹوپیاں خریدیں۔ گیری کی ٹوپی کچھ چھوٹی پڑ گئی اس لیے اسے بدلنے کی غرض سے ملند کو پھر اس دکان کی طرف جانا پڑا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ چائے کی دکان پر اتنا وقت صرف کرنا، بھرے بازار میں گھومنا پھرنا اور خریداری کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لیکن جب آپ ہر طرف سے دشمنوں کے گھیرے میں ہیں، یقین اور بے یقینی کے جھولے میں ہیں، جب دل اور دماغ ایک عجیب طرح کی کشاکش کے

شکار ہوں۔ جب ہر لمحہ یہ دکھائی دے رہا ہو کہ کسی بھی غلط فیصلے کا انجام کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ جب سارے حالات اور ساری ترکیبیں صاف نہ ہوں پھر بھی کوئی نہ کوئی فیصلہ تو ہر حال میں لینا ہی ہو تو شاید ایسی ہی کسی وجہ نے ملند کو کچھ وقت گذارنے یا تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومنے پھرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ جس سے وہ دوبارہ اس دکان کی طرف چل پڑا۔

گیری اور ہیری گلی میں کھڑے رہے۔ صرف ملند ہی نیچے ٹوپی بدلنے گیا تھا۔ ملند کا ادھر جانا تھا کہ ادھر چائے والا لڑکا تیزی سے گیری کے پاس آیا اور اونچی آواز میں بولا، ''آپ کو لنڈی خانہ جانا ہے؟ ٹیکسی والے نے کرایہ کم کر دیا ہے۔ آپ صرف پچیس روپئے دے دینا۔''

''نہیں!!! ابھی بھی زیادہ ہیں،'' گیری نے کہا۔

ہیری نے سرگوشی کے انداز میں کہا، ''گیری ٹیکسی لے لو اور فوراً یہاں سے نکلا جائے مجھے کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا ہے۔''

ملند بھی آ پہنچا۔ تینوں ٹیکسی کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ڈاڑھی رکھے ہوئے ایک بزرگ سا آدمی جو آنکھوں پر کالا چشمہ پہنے ہوئے تھا آیا اور دریافت کیا، ''آپ لوگ لنڈی خانہ جانا چاہتے ہیں؟''

''جی ہاں،'' ملند نے جواب دیا۔

''اچھا تو آپ..... لنڈی خانہ جانا چاہتے ہیں؟ مگر کیوں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہم لوگ سیر کرنے نکلے ہیں۔ اس علاقے میں گھوم پھر کر ہمیں بہت سے مقامات دیکھنا ہے،'' ملند نے معصومیت سے کہا۔ لیکن اس کی آواز خاصی کمزور لگ رہی تھی جسے اس بوڑھے انسان نے باقاعدگی سے بھانپ لیا۔

''آپ لوگوں کا تعلق اس علاقے سے تو ہے نہیں، پھر لنڈی خانہ کے بارے میں آپ لوگوں کو کیسے معلومات ہوئی؟''

''ہاں ہم یہاں کے نہیں ہیں ہم لوگ لاہور سے آئے ہیں۔ مگر لنڈی کوتل اور لنڈی خانہ کون نہیں جانتا ہے؟ یہ سب جغرافیہ کے نقشے میں دیکھنے کو ملتے ہیں،'' ملند نے صفائی پیش کی۔

''بکواس!! جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔ لنڈی خانہ سرے سے کسی نقشے میں ہے ہی نہیں۔''

ضرور دیکھتا یہ لوگ سڑک پر ہی چلتے رہے۔ سڑک چھوڑنے کا مطلب تھا دشمنی کا اعلان کرنا۔ اور دوسری طرف سے صرف ایک ہی ردّ عمل ہونا تھا، رائفل کی گولی۔ دونوں طرف کے میدان خطرناک دشمنوں سے بھرے معلوم ہوتے تھے صرف بس یا دیگر سواریاں ہی اب آگے بڑھنے کا واحد ذریعہ رہ گئی تھیں۔

اتنے میں ایک چودہ پندرہ برس کا لڑکا آ کر ان کے اردگرد منڈلانے لگا۔ ملند نے ''السلام علیکم'' سے اس کا استقبال کیا۔ وعلیکم السلام کہتا ہوا وہ ان کے پاس آ گیا اور انھیں ایک پلیا پر بیٹھا کر ان سے باتیں کرنے لگا۔ ملند نے اسے بتانا شروع کیا کہ وہ پاکستان کے ایئر مین ہیں اور لاہور، کراچی سے اس علاقے میں گھومنے آئے ہیں۔ لڑکے کے پوچھنے پر ملند نے بتایا کہ سرکار نے ان لوگوں کو ٹریننگ کے لیے امریکہ بھیجا تھا، اس کے بعد دو برس کے لیے ان کی ڈیوٹی سعودی عربیہ میں بھی لگی تھی۔ بچے کو ان اجنبیوں سے باتیں کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ ملند نے اپنے ساتھ گھومنے کے لیے اسے لنڈی کوتل چلنے کی دعوت دی۔ بچے نے اس کے لیے تو منع کر دیا شاید لاہور یا کراچی کی بات ہوتی تو تیار ہو جاتا۔ مگر اس نے اتنا ضرور بتایا کہ لنڈی کوتل کے لیے بس آرہی ہوگی اور واقعی تھوڑی دیر میں بس آ گئی۔ بچے نے بیچ سڑک پر ہی کھڑے ہو کر بس روکنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا اور یہ تینوں جلدی جلدی اس میں سوار ہو گئے۔

یہ علاقہ بڑا ہی خشک تھا۔ چاروں طرف چھوٹے بڑے پتھر بجری اور روڑے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑیوں سے اوپر قلعہ نما مکانات کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ جو ڈھلان سے دور تک دکھائی دیتا تھا۔ جیسے پتھروں کے بنے یہ مکانات نہ ہوں بلکہ لوگوں نے پہاڑیوں میں گپھائیں کاٹ کاٹ کر رہائش گاہ تیار کر لی ہو۔ ادھر ادھر کتے بھی اچھی تعداد میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس طرح دن ہو یا رات مین روڈ کے علاوہ خود کو اور کہیں بھی محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

راستے میں جگہ جگہ چیک پوسٹ تھی، جہاں بسوں کو روک کر صرف سامانوں کی تلاشیاں لی جاتی تھیں۔ ایک پوسٹ پر باوردی سپاہیوں نے چاول سے بھرے دو بورے اٹھا کر بس سے نیچے گرا دیے۔ ایک لمبا تڑنگا پٹھان بوروں کے ساتھ ہی نیچے کود پڑا اور انھیں بوروں پر ایک پیر رکھ کر فلموں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک گرما گرم بحث و تکرار اور گالی گلوج کا سلسلہ دونوں طرف

سے چلتا رہا۔ آخر میں چاول کے بورے قبائلی کو واپس کرنے پڑے۔ ثابت ہوا کہ ان علاقوں میں چاول اور آٹے کی قلت رہتی ہے اور اسی لیے اس طرف ان چیزوں کی اسمگلنگ زوروں پر تھی۔

تھوڑی دیر میں لنڈی کوتل آ گیا اور یہ لوگ بس سے اتر گئے۔ یہاں سے افغانستان صرف پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ سفر اتنی جلدی طے ہو چکا تھا کہ جسمانی طور پر یہ لوگ اس مقام تک ضرور آ گئے تھے لیکن ذہنی طور پر اپنی مہم کے آخری پڑاؤ کے لیے خود کو تیار نہیں پا رہے تھے۔ کچھ مشکوک اور حیرت زدہ تھے کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔ کیوں کہ آگے کی حکمتِ عملی سے ذہن پوری طرح مطمئن نہیں تھا اس لیے ہیری وغیرہ گلی میں گھس کر ایک چائے خانے میں جا بیٹھے۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ملند نے چائے لانے والے لڑکے سے پوچھا، ''یہاں سے ''لنڈی خانہ'' کتنی دور ہے؟'' اس نے ایسے دیکھا کہ جیسے اس سے ٹرانسلوانیہ کی دوری پوچھ لی گئی ہو۔ ملند وغیرہ کو حیرت تھی کہ اس شہر سے تقریباً پانچ میل کی دوری پر واقع کسی جگہ کے بارے میں پوچھنے پر یہ نوجوان اتنی بھونچکا کیوں ہو گیا قریب ہی بیٹھے ایک پٹھان نے بتایا۔ لنڈی خانہ یہاں سے قریب چار میل۔

''کچھ دیکھنے یا گھومنے پھرنے کے لائق اچھی جگہ ہے کیا؟'' ملند نے پوچھا۔ اس نے ایک سیاح کی طرح ہی بات کرنا مناسب سمجھا۔ پٹھان نے منھ بنا کر اس طرح کندھے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو کہ بھلا اس علاقے میں دیکھنے کے لائق کیا ہو سکتا ہے۔

''وہاں جانے کے لیے کوئی سواری مل سکتی ہے؟'' ملند نے پھر پوچھا۔

''اس طرف کوئی بس نہیں جاتی۔ آپ اس سڑک سے پیدل جا سکتے ہیں۔ یا ٹیکسی لے سکتے ہیں،'' اس نے جواب دیا۔ ''ٹیکسی کا کرایہ کتنا ہوگا؟'' ملند نے پوچھا۔

''کرایہ تو ایک روپیہ فی سواری ہے۔ شرط ہے کہ تیس سواری ہو جائے، نہیں تو تیس روپیہ۔'' ملند نے سوچا کہ یہ تو ہر طرف سے تیس ہی روپے ہوں گے پھر تو یہ زیادہ ہیں۔ یہ سن کر پٹھان نے پھر اپنے کندھے اچکا دیے۔ باہر سڑک پر کچھ انگریز سیاح گھومتے دکھائی دیے ساتھ ہی فرنٹیر علاقے کے ایک سکھ پر بھی نگاہ پڑی جس کے جسم پر سفید شلوار قمیص اور سر پر سفید پگڑی تھی۔

''دیکھ گیری تیرا برادر،'' ہیری نے کہا۔ وہ سکھ کندھے پر رکھے ہوئے بانس سے دونوں

"جناب میں نے زندگی اسی علاقے میں گذاری ہے۔ مگر آپ لوگوں جیسا لباس میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ گرمی کے موسم میں اونی پتلون اور اس پر کینوس کے جوتے۔ شلوار قمیص یا سوتی پتلون بھی پہنی تو اس پر بھی کینوس کے ہی جوتے اور سونے پر سہاگہ یہ پیشاوری ٹوپیاں۔ ظاہر ہے کہ آپ پیشاور ہو کر آئے ہوں گے لیکن پیشاوری ٹوپیاں آپ کو لنڈی کوتل میں خریدنے کی سوجھی۔ کیوں؟ کیوں کہ اس علاقے میں بہت سے لوگ یہ ٹوپیاں پہنے دکھائی دیے ہوں گے اور سن لیجیے جتنے بنگالی آج تک یہاں پکڑے گئے ہیں اپنی ایسی ہی چھوٹی موٹی غلطیوں کی وجہ سے پکڑے گئے ہیں۔" یہ کہتے کہتے بوڑھے نے ایک تھیلے سے دو اونی جرسیاں نکالیں اور سب کو دکھاتے ہوئے کہنے لگا "دیکھیے ہر بنگالی گرم کپڑے لے کر ضرور چلتا ہے کیوں کہ یہاں تو گرمی ہے لیکن کابل میں تو ٹھنڈی ہوگی۔"

اس کے بعد اس نے پیراشوٹ سے بنایا ہوا ایک تیسرا تھیلا نکالا اس پر کہیں کہیں خون کے دھبے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ دھبے دیکھتے ہی وہ بری طرح چونکا اور تینوں کو بڑی ہی غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی سارا سامان تھیلوں میں واپس بھرا اور اپنے علاقے کے ہی تین لوگوں کو ایک ایک تھیلا پکڑا دیا اور سختی کے ساتھ کہا۔ میرے ساتھ چلیے۔ وہ سڑک پر آگے آگے چلنے لگا۔ ملند، ہیری اور گیری اس کے پیچھے پیچھے اور ان کے پیچھے تین مقامی لوگ ان کے تھیلے لیے ہوئے ساتھ ساتھ کچھ تماش بین۔ بڑے میاں نے خون کے دھبوں کو ذہن میں لاتے ہوئے سوچا کہ شاید کچھ بڑے ہی خطرناک لوگ ان کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔

تھوڑی دیر میں یہ بھیڑ ایک سرکاری عمارت کے سامنے پہنچی۔ یہ مقامی تحصیلدار کا دفتر تھا۔ جسے کسی کو بھی جیل بھیجنے کے اختیارات حاصل تھے۔ ذرا سے انتظار کے بعد تحصیلدار صاحب تشریف لے آئے۔ اپنی کرسی پر براجمان ہوئے اور لوگوں کو پاس ہی پڑی ایک چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شلوار سوٹ پر کتھئی رنگ کی ایک کوٹ پہنے ہوئے موٹے اور گنجے تحصیلدار نے کاغذ قلم منگایا اور تفتیش شروع کی۔

"آپ کے نام؟"

"ایل۔ اے۔ سی۔ جان مسیح۔ پاکستان ایئر فورس، اسٹیشن لاہور اور ولد اینڈ و مسیح،

عیسائی۔'' ملند نے کہا۔

گیری بولا، ''ایل۔اے۔سی۔علی امیر لاہور ایئر فورس اسٹیشن ولد ٹامس ایئر عیسائی۔''

ہیری نے کہا، ''ہیر اللہ جیکب ولد میتھیو جیکب ملازم لا بیلا ہوٹل کراچی۔''

'' آپ لوگ ایک دوسرے کو کتنے دنوں سے جانتے ہیں؟'' تحصیلدار نے دریافت کیا۔

''ہم لوگ ایک ہی جگہ ڈیوٹی پر ہیں،'' گیری نے ملند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اور ہیری میرا مطلب ہیر اللہ جیکب سے ہم لوگ کراچی میں ملے تھے جب ہم دونوں وہاں تعینات تھے۔ہم تینوں عیسائی ہیں۔''

'' یہاں کیوں آئے ہیں؟'' اگلا سوال۔

'' دیکھیے ہم لوگ چھٹیاں ہمیشہ ایک ساتھ ہی لیتے ہیں اور ہر بار کسی نئے علاقے میں گھومنے جاتے ہیں۔اس بار ہم نے ادھر آنے کا پروگرام بنالیا'' ملند نے سمجھاتے ہوئے بتایا۔

'' آپ دونوں.........'' اس نے ملند اور گیری کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا،'' آپ کے پاس شناخت کے لیے کوئی کاغذ یا چھٹی کی اجازت کا کوئی سرٹیفکیٹ وغیرہ تو ہوگا؟''

'' جی نہیں جناب۔چھٹیوں میں کہیں باہر جانے پر کاغذات کھو نہ جائیں اس لیے ساتھ نہیں رکھتے،'' گیری بولا۔تحصیلدار کچھ سوچنے لگا جیسے ملند وغیرہ کے چہرے دیکھ کر ان کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔آخر تھک ہار کر اس نے ایک کاغذ پر انگریزی میں ''سسپکٹس''،یعنی مشکوک لوگ لکھ کر تینوں کو دکھایا پھر کچھ رک کر بولا،'' آپ لوگ لنڈی خانہ جانا چاہتے ہیں جب کہ کوئی لنڈی خانہ جاتا ہی نہیں ہے۔آپ گرم کپڑے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ظاہر ہے کہ آپ کی منزل کوئی ٹھنڈی جگہ ہے۔دوسرے آپ اپنی شناخت بھی ثابت نہیں کر پا رہے ہیں،اس سب کے علاوہ آپ لوگوں کے پاس خون آلودہ کپڑے بھی ہیں۔''

سارے تماش بین فیصلے کے انتظار میں کھڑے تھے اور فیصلہ سنانے میں تحصیلدار نے بہت زیادہ دیر بھی نہیں کی۔

'' فی الحال آپ لوگ جیل میں رہیں گے کیوں کہ میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں،آپ حضرات کے سلسلے میں تفصیلی تفتیش جاری رہے گی۔''

ملند حواس باختہ ہو چکا تھا، اس نے اپنا سر کھجلانا چاہا لیکن کچھ سوچ کر اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ "مرے" نے یقیناً لنڈی خانہ کے بارے میں لکھا تھا، خدا اس کی روح کو تسکین بخشے، وہ خود بھی وہاں ہو کر آیا تھا لیکن ملند بمشکل تمام اتنا ہی کہہ سکا کہ "اس کے بارے میں زیادہ کچھ تو میں نہیں کہہ سکتا مگر میں لاہور اور کراچی میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو یہاں سے گھوم کر گئے ہیں۔"

"لاہور..... اور..... کراچی میں؟" بوڑھے نے کڑکتے ہوئے قدرے تیز آواز میں پوچھا۔ "آپ تینوں ہیں کون؟"

گیری جلدی سے پنجابی میں بولا "ہم گو پاکستان ایئر فورس کے ایئر مین ہیں۔ مگر آپ یہ پوچھ تاچھ کیوں کر رہے ہیں اور ذرا اپنی تعریف بھی تو بتائیں کہ آخر آپ ہیں کون؟"

فی الحال یہ فکر چھوڑیے کہ میں کون ہوں، بوڑھے نے زور سے کہا۔ ان کے ارد گرد بھیڑ اکٹھا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ بوڑھے نے پھر کہا۔ "ذرا ایئر فورس کے شناختی کارڈ تو دکھائیے۔"

"چھٹی جانے پر ہم "آئی کارڈ" نہیں لے جاسکتے۔ سکیورٹی کا معاملہ ہے،" گیری نے کہا۔ "تو چھٹی منظور ہونے کا کوئی سرٹیفکیٹ وغیرہ تو ہوگا؟" بوڑھا نہلے پر دہلا لگائے جا رہا تھا۔

"دیکھیے! ہم لوگ اپنے ہی ملک میں سیر و تفریح کرنے نکلے ہیں۔ چھٹی پر رہتے ہیں تو دس طرح کے کاغذات لے کر نہیں نکلتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ہم سے اس طرح کے سوالات کیوں پوچھ رہے ہیں؟" گیری نے کہا۔

"بتاؤں کہ میں کیوں پوچھ رہا ہوں؟" بوڑھے نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔ "دراصل ایک زمانے سے لنڈی خانہ نام کی کوئی جگہ ہے نہیں۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ہی لنڈی خانہ ختم ہو چکا ہے۔ نئی عمر کے لوگ یہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ اس نام کی کوئی جگہ آس پاس ہے یا کبھی تھی۔ اب وہاں ایک ریلوے لائن جو قطعی استعمال میں نہیں ہے اور ایک ٹوٹی پھوٹی چھوٹی سی عمارت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور آپ ہیں کہ آج انگریزوں کے جانے کے پچیس برس بعد لنڈی خانہ ڈھونڈتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔"

ملند وغیرہ کو یکایک اس بات کا احساس ہو گیا کہ انھوں نے جو اطلاعات اکٹھا کی تھیں ان

کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن ''مرے'' نے جب لکھا تھا تب یہ ساری جگہیں تھیں مگر آزادی کے فوراً بعد پاکستان گورنمنٹ نے ریلوے کو لنڈی کوتل ہی محدود کر دیا اور لنڈی خانہ اجڑ گیا۔ وہاں سانپوں اور بچھوؤں کی حکومت ہوگئی، آب و ہوا نے جنگل قائم کر دیے اور عمارت کھنڈر بن کر تیز دھوپ میں بھیڑوں اور بکریوں کے سر چھپانے کا مسکن بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس علاقے کے لوگ اس جگہ کا نام تک بھول چکے ہیں۔

آس پاس بھیڑ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کی ذہنی کشمکش اور خوف بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے۔ ایک نے کہا، تینوں بہت بڑے اسمگلر ہیں۔ سوک بازار میں بار بار سودا کرنے جا رہے تھے۔ دوسرے نے کچھ اور تیسرے نے کچھ اور کہا۔ بس خیریت تھی کہ ابھی تک کسی نے انھیں ہندوستانی نہیں کہا تھا۔ سب سے بڑا ڈر یہی تھا کہ اگر بھیڑ کے سامنے ان کے ہندوستانی ہونے کا راز ظاہر ہو گیا تو قیامت ہی آ جائے گی اور خدانخواستہ کہیں یہ پتہ چل گیا کہ یہ ہندو ہیں تب تو لاٹھیوں ڈنڈوں سے ہی پیٹ پیٹ کر مار ڈالیں گے۔ محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ بچا تھا۔ اس بھیڑ سے الگ ہو کر کسی سرکاری آفیسر کی تحویل میں پہنچنا۔

''میرے ساتھ آیئے'' بوڑھے نے کہا۔ یہ لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے ساتھ میں بھیڑ بھی۔ مگر وہ ان لوگوں کو ایک خالی دکان تک ہی لے گیا جہاں اس کے اشارے پر دوسروں نے ان کے سامان کی باقاعدہ تلاشی لینی شروع کر دی۔

''آپ ہمیں خوامخواہ کیوں روکے ہوئے ہیں؟ اور کس بنیاد پر ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے؟'' گیری نے پوچھا۔

''میں بتاتا ہوں جناب کہ میرے شک کی بنیاد کیا ہے،'' بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔ ''میری رائے میں آپ لوگ بنگالی ہیں اور افغانستان کے راستے ڈھاکہ بھاگنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔'' پاکستان والے پوربی پاکستان کو صرف ''ڈھاکہ'' کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ انھیں اس نئے ملک کو بنگلہ دیش کہنے میں چڑھ ہوتی تھی۔

''بنگالی؟'' گیری نے تنک کر کہا۔ ہم بنگالی نظر آتے ہیں؟'' آپ نے بنگالیوں کو غور سے دیکھا بھی ہے۔ خدا کی قسم ہم بنگالی نہیں ہیں۔''

میں موجود ہیں۔ یہاں تحصیلدار ہمیں جیل بھیجنے کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''کیا؟'' عثمان صاحب چلا کر بولے۔ انھیں سارا ماجرہ سمجھنے میں پورا ایک منٹ لگ گیا۔ وہ ذہین آدمی تھے فوراً سارے حالات سمجھ گئے۔ ملند کا کہنا کہ وہ لنڈی کوتل سے بول رہا ہے اور اس کے ساتھ دو لوگ اور بھی ہیں ظاہر کر رہا تھا کہ یہ لوگ راولپنڈی سے بھاگ کر وہاں پکڑے گئے ہیں۔ عثمان صاحب نے ملند سے تحصیلدار کو فون دینے کے لیے کہا۔

تحصیلدار جس نے پہلے تو اپنا نام شاہجہاں بتایا تھا، پہلے تو لچھے دار زبان میں ان تینوں کو گرفتار کرنے کا بیورہ دینے لگا، لیکن تھوڑی ہی دیر میں، یس سر، جی سر اور ہاں سر پر آ گیا۔ اس وقت عثمان صاحب ضرور اسے کچھ احکامات دے رہے تھے۔ تحصیلدار کے ٹیلی فون رکھتے رکھتے ملند کے چہرے پر اچھی خاصی خوشی نظر آنے لگی تھی۔

''دیکھا! میں شروع سے ہی سوچ رہا تھا کہ دال میں کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔ ہاں پاکستانی ایرمین ضرور ہیں۔ عثمان صاحب نے بتایا۔ مجھے بھی لگ رہا تھا کہ آپ اس معاملے میں جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ تینوں خطرناک لوگ ہیں۔ ضرور کوئی بڑا جرم کر کے فرار ہوئے ہوں گے اس لیے اگلی ہدایت تک آپ لوگوں کو حفاظت کے ساتھ بند رکھا جائے۔''

تینوں مایوس سی شکل بنائے کھڑے رہے۔ دل کو اتنی راحت تھی کہ غلط لوگوں کے سامنے اصلیت ظاہر ہونے سے بچ گئی۔ اس طرح ایک بار پھر بال بال بچے تھے۔ بھگوان کی بڑی مہربانی تھی۔ ایک بات اور..... ابھی تک ان کے جیل سے بھاگنے کی خبر کسی کو نہیں تھی کیونکہ ایسے حادثات کی اطلاع سب سے پہلے ایر چیف کے دفتر یعنی عثمان صاحب کے پاس ہی جاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شیٹی اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے کیمپ میں اتنا اچھا ڈھونگ پیش کیا تھا کہ ابھی تک کسی کو بھی ان کے فرار ہونے کی خبر نہیں ہو پائی۔

ملند، گیری اور ہیری کو تھوڑی دیر میں حوالات کے حوالے کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے پاکستان میں بہت سی جیلیں اور حوالاتیں دیکھ رکھی تھیں لیکن گندگی اور بدبو میں یہ جگہ سابقہ سبھی جگہوں کو مات دے رہی تھی۔ حوالات کے اندر ان کی تلاشی لی گئی اور تینوں کے پاس جنگی قیدی ہونے کے شناختی کاغذات ملے۔ جنھیں ایک سپاہی نے تحصیلدار کے سامنے رکھا۔

''تم لوگوں نے کیا نام بتائے؟'' تحصیلدار نے ترنت پوچھا۔ اس بار تینوں نے اپنے وہ صحیح نام بتائے جو ان کے شناختی کارڈ میں لکھے ہوئے تھے۔ شاہجہاں کا چہرہ سرخ ہو چلا تھا اور سانسیں تیز ہو چکی تھیں اس نے غصّے کی حالت میں مزید سوالات پوچھنے شروع کیے۔

''تم لوگ جنگی قیدی ہو؟

ہندوستانی ہو؟

ہندو ہو؟

تم پھر تم لوگ لگاتار جھوٹ کیوں بول رہے تھے؟ کیوں؟''

شاہجہاں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ملند وغیرہ کی خاطر تواضع بھی ہو سکتی تھی کیونکہ وہ پہلے قدم پر ہی بری طرح دھوکا کھا چکا تھا اور شاید اس بات سے دکھی تھا کہ ہندوستان کے خلاف جنگ کو آگے لے جانے کا یہ موقع ان فطرتی اور چالاک ہندوؤں نے اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ لیکن یہ لوگ مقدر کے دھنی تھے۔ کیونکہ اسی وقت خاکی وردی میں ایک شخص نے آ کر تحصیلدار سے کہا کہ علاقے کے سیاسی ایجنٹ یعنی مرکزی سرکار کے اعلیٰ نمائندے برقی صاحب نے تینوں قیدیوں کو فوراً پیش کرنے کا حکم دیا۔ تینوں کو حوالات سے نکال کر ہتھکڑی پہنائی گئی۔ دھیرے دھیرے تحصیلدار کے چہرے کی سرخی غائب ہونے لگی اور وہ اپنے گیہویں رنگ میں واپس آ کر قیدیوں کے ساتھ خود اعلیٰ افسر کے دفتر کی طرف چل پڑے۔

جیسے ہی ملند وغیرہ اس افسر کے سامنے لائے گئے تینوں نے فوراً اٹینشن کی حالت میں کھڑے ہو کر خالص فوجی انداز میں انھیں سیلوٹ پیش کیا اور کہا۔ ''گڈ مارننگ سَر''

''ان کی ہتھکڑیاں کھول دیجیے'' یہ برقی صاحب کا پہلا حکم تھا۔ ''ان لوگوں کے ساتھ بالکل وہی سلوک ہوگا جیسا کسی پاکستانی افسر کے ساتھ ہوتا ہے۔'' شاہجہاں کے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ملند وغیرہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ تقدیر نے کس طرح پلٹا کھایا ہے۔

تھوڑی دیر بعد برقی صاحب کرسی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور ہندوستانی قیدیوں کو بلا کر کہا۔ ''آپ لوگ یہ پہاڑیاں دیکھ رہے ہیں؟ اسی پہاڑی کے دوسری طرف افغانستان ہے...... آج کی تاریخ میں آپ آزاد ہو سکتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ

کھیل یہیں ختم تھا۔ ملند سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا بہت ضروری ہے کیونکہ جیسے ہی ان کی اصلیت معلوم ہوگی یہ اپنا آپا کھو بیٹھیں گے اور ہم سے بدلہ لینے کی خواہش انھیں پاگل بنا دے گی۔ اب تو پناہ صرف پاکستانی فوج کی حراست میں ہی مل سکتی ہے اور ایرفورس کی حراست نصیب ہو جائے تو کیا کہنا۔ ''آپ مجھے ایک ٹیلیفون کال کی اجازت دیں گے؟'' ملند نے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بالکل نہیں۔ کم سے کم اس وقت تک تو قطعی نہیں جب تک کہ آپ لوگوں کے بارے میں پوری طرح پتہ نہ لگ جائے۔''

''آپ نے ہمیں بلا وجہ روک بھی رکھا ہے۔ جیل میں ڈالنے کی تیاری بھی کر رہے ہیں۔ اور مجھے ایک فون کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے کہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی پوزیشن آپ کے سامنے واضح کر سکوں،'' ملند نے طیش میں کہا۔

تحصیلدار نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کسی پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد ہیری نے ملند کو مخاطب کرتے ہوئے زور سے کہا۔ 'آخر بات کرو گے کس سے؟'

تحصیلدار ملند کا جواب سننے کے لیے تھوڑا سے آگے کو جھکا۔ ''میں پیشاور ہیڈ کواٹر میں پرووسٹ مارشل صاحب سے بات کروں گا۔ وہ ایرفورس پولس کے انچارج ہیں۔ وہ انھیں لمحہ بھر میں مطمئن کر دیں گے۔''

تحصیلدار سوچنے لگا کہ یہ لوگ ایرفورس کے اتنے بڑے آفیسر کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اس نے پوچھا، ''آپ کو اپنے ان آفیسر کا ٹیلی فون نمبر معلوم ہے؟''

''نہیں۔ مگر میں پہلے پیشاور ہیڈ کواٹر سے بات کروں گا اور وہ مارشل صاحب کا نمبر ملا دیں گے۔'' ملند نے بڑی ہی خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ تحصیلدار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے خود ہی پاس رکھا ٹیلی فون اٹھایا اور پاکستان ایر ہیڈ کوارٹر سے بات کرانے کے لیے ایکسچینج سے کہنے لگا۔

''ایر ہیڈ کوارٹر ایکسچینج۔ نمبر پلیز؟'' ٹیلی فون پر آواز آئی۔

''ایک منٹ،'' تحصیلدار نے ملند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فوراً ملند نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور بولا، ''آئی ایم ایل۔ اے۔ سی۔ مسیح ..... برائے مہربانی پرووسٹ مارشل

کے دفتر سے میری بات کرا دیجیے۔ یہ انتہائی اہم معاملہ ہے۔"

"ذرا سا انتظار کیجئے،" آپریٹر نے کہا۔ ایک دو سکنڈ بعد ہی وہ دوبارہ بولا۔ "پرووسٹ مارشل صاحب اپنے دفتر میں نہیں ہیں۔ کوئی اور نمبر ہو تو بتائیں۔"

اس وقت ملند کا دماغ بہت تیز کام کر رہا تھا۔ ایک دم سے اسے خیال آیا۔ ایمرجنسی میں بڑے سے بڑے افسر سے بات کرو۔ یعنی سب سے بڑے افسر سے۔

"پلیز مجھے ایر چیف کے دفتر کی لائن دے دیں مجھے ان کے اے۔ ڈی۔ سے بات کرنی ہے۔ اسکواڈرن لیڈر عثمان سے۔ بہت ضروری ہے پلیز۔"

ملند کے دماغ میں یہ سب کسی ایمرجنسی ڈرل کی طرح آتا چلا جا رہا تھا۔ ایک سدھے ہوئے نپے تلے ردِعمل کی طرح۔ ایک فائٹر پائلٹ سے جس کی امید کی جاتی ہے۔ مرتے وقت بھی اسے دھیان ہونا چاہیے کہ اس حالت میں بھی اسے کیا کرنا ہے۔ عثمان راولپنڈی جیل کے انچارج تھے جب ہندوستانی وہاں لائے گئے تھے اس کے بعد ہی پاکستان ایر فورس کے سینئر ایر مارشل کے اے۔ ڈی۔ سی۔ کی جگہ پر ان کا انتخاب ہو چکا تھا۔

"تھوڑا سا رکے رہیں۔ عثمان صاحب لائن پر آ رہے ہیں،" آپریٹر نے بتایا۔

ملند کی جان میں جان آئی۔ عثمان صاحب شریف انسان تھے۔ ڈسپلن کے دائرے میں سبھی کا خیال رکھنے والے۔ کھیل میں ہارنے والوں کے ساتھ انصاف، رحم اور فراخدلی کی امید کسی دشمن سے ہو سکتی تھی تو اسے مہیا کرانے میں عثمان صاحب سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو لوگ جنگ ہارنے سے دل میں بدلے کا احساس رکھتے ہوں، ان کے ہاتھوں پڑ کر شاید تینوں کابل دریا کے کنارے کہیں دفن ہو جاتے اور اپنے اوپر کی زمین پر گھاس پھوس اگانے پر مجبور ہو جاتے۔

جیسے ہی عثمان صاحب لائن پر آئے ملند نے کہا۔ "گڈ مارننگ سر! میں ملند بول رہا ہوں۔"

"ملند ؟؟؟" عثمان صاحب نے حیرت سے پوچھا، "تم ٹیلی فون پر کیسے پہنچ گئے؟"

"مجھے پتہ نہیں سر، مگر شاید آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہو کہ ہم تین لوگ اس وقت لنڈی کوتل

آپ کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئے۔ پھر بھی آپ کی کوشش قابلِ تعریف ہے۔ آپ منزل کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔"

فوجی روایات میں ایسے برتاؤ کو اگر مثالی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا جس کے تحت ناکام ہوئے دشمن کو ذلیل کرنے کے بجائے آئندہ کامیابی کی دعائیں دی جارہی تھیں۔

"آرمی سَر؟" ہیری نے پوچھا۔ "مطلب آپ بَری فوج سے ہیں۔"

"ہاں۔ تقریباً آٹھ برس۔ اس کے بعد بارہ سال سے اسی طرح کے کاموں میں مصروف ہوں۔ ہاں میرے والد ہندوستانی فوج میں تھے۔"

"جنرل برقی؟" ملند نے کہا۔

برقی تقریباً دس منٹ سب سے بات چیت کرتے رہے۔ حالانکہ عثمان صاحب نے انھیں کافی کچھ بتا دیا تھا' پھر بھی وہ جاننا چاہتے تھے کہ اتنے کم وقت میں اتنا لمبا راستہ کس طرح طے کرلیا گیا۔ ملند وغیرہ نے تمام واقعات تفصیل سے بتا دیے۔ آخر میں انھوں نے دوبارہ افسوس کا اظہار کیا کہ وہ لوگ بنگالی ہونے کے شک میں پکڑے گئے۔ جس کے بارے میں کسی نے سوچا تک نہیں تھا۔

گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے برقی صاحب نے کہا، "مجھے اس وقت کچھ ضروری کام سے جانا ہے۔ میرا اسٹاف آپ حضرات کی دیکھ بھال کرے گا۔ آپ کو لے جانے کے لیے ایرفورس پولس آرہی ہوگی۔ تب تک آپ لوگ آرام کریں۔" برقی نے سب سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے نکل کر چلے گئے۔

ڈھیر سارا کھانا ایک بڑی سی میز پر چن دیا گیا۔ مرغ، گوشت، پلاؤ اور دوسرے لذیذ کھانے جو لنڈی کوتل میں مہیا ہو سکتے تھے۔ کندھوں پر کار بائن لٹکائے کالی شلوار قمیص میں لمبے تگڑے پٹھان کھانا لگا رہے تھے۔ بڑی ہی احتیاط اور خاموشی سے، ادب کے ساتھ۔ تحصیلدار صاحب نے ان بزرگوار کو بھی بلوالیا تھا جن کی مہربانیوں کے طفیل میں ملند وغیرہ دوبارہ یہ دن دیکھنے پر مجبور تھے۔ سب نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا۔ بعد میں ہیری نے بھی بزرگوار کی ہوشیاری اور دور اندیشی پر ان کی کھل کر تعریف کی۔ جواب میں بزرگوار نے ہاتھ اوپر اٹھا کر پھیلاتے ہوئے زبان سے صرف ایک لفظ ادا کیا، "اللہ۔"

شام کے تقریباً چار بجے تک ایرفورس پولس کے اسکواڈرن لیڈر رسیّد اپنے چھ کا پورل ساتھ لے کر آ گئے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لیے ہوئے۔ آتے ہی انھوں نے حکم دیا کہ انھیں لے چلنے کے لیے تیار کیا جائے۔

فوراً سب کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی گئیں۔ ملند نے گذارش کی کہ ان لوگوں کو یہاں کے اسٹاف سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے کا موقع دیا جائے۔ جواب میں پولس آفیسر نے اپنے آدمیوں کو اور جلدی کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

ملند اور گیری کو ایک ساتھ ہتھکڑی لگائی گئی جس میں ایک زنجیر تھی جسے ایک پولس والا تھامے ہوا تھا۔ ہیری بھی زنجیر میں تھا۔ ملند اور گیری کو ایک جیپ میں بیٹھا کر آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ ہیری جس حالت میں تھا اسی طرح افسر کی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ گاڑی آگے بڑھتے ہی ہیری نے کچھ بات چیت شروع کرنی چاہی کہ............

"چپ رہو............

............اور منھ بند رکھو،" نئے جیلر نے ڈپٹ کر کہا۔

—

باب سترہ

ردِّ عمل

(جیل سے فرار۔5)

شیٹی کمرہ نمبر 5 کے دروازے سے لگا ہوا لیٹا اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ گیری کے ہاتھوں سے دیوار کا پلاسٹر ٹوٹنے کی آواز بھی اس نے سنی تھی اور سب کا سرگوشی کے انداز میں الوداع کہنا بھی۔ پورا کمرہ ایک دم سے سائیں سائیں کرنے لگا۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی۔ خود شیٹی بھی جیسے کہیں خلاؤں میں ٹنگا ہوا ہو۔ ایک بھیانک سا اکیلا پن اور عجیب سی دہشت، جیسے کسی بھی لمحہ کوئی بھی زبردست حادثہ ہونے والا ہو۔ باہر ہوا بہت ہی تیز تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش ہونے لگی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ پانی برسنا جب بند ہوا تو گارڈ کے جوتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس رات ڈیوٹی پر شمس الدین تھا۔ اس نے آکر دروازے سے جھانکا۔ ملند، ہیری اور گیری کے سونے کی جگہوں پر ایک ایک ''ڈمی'' لیٹی ہوئی تھی۔ شیٹی نے ہلکے سے کھانس کر کروٹ بدلی۔ شمس الدین بے چارہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہیں شیٹی پھر حرکت میں آ گیا، فوراً اٹھ کر اس نے سرنگ میں پھر سے اینٹیں لگا ئیں۔ ڈبے اور جوتے وغیرہ ٹھیک سے رکھے اور چارپائی دیوار سے سٹا دی۔ کمرہ پھر پہلے جیسا دکھائی دینے لگا۔ شیٹی واپس آکر دوبارہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

صبح تین بجے کے قریب شمس الدین نے پھر دروازے پر کھڑے ہو کر جھانکا۔ شمس الدین

کو سب کچھ نارمل دکھائی دے اس لیے شیٹی نے بھی اپنے جسم کو تھوڑی بہت حرکت دی۔ اس کے دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اسے راز فاش ہونے یا اس کے بعد کی ایذا رسانیوں سے زیادہ پریشانی نہیں تھی، لیکن وہ اس بوجھ تلے خود کو بری طرح دبا ہوا محسوس کر رہا تھا کہ جیل سے بھاگنے کے اس پروگرام کے ہر لمحے کی جانکاری باقی بچے لوگوں میں اگر کسی اور کو تھی تو وہ شیٹی ہی تھا۔ اس وقت اس کی سب سے اہم ضرورت یہی تھی کہ ان جانکاریوں کا بوجھ کسی اور کے ساتھ بات کر جلدی سے جلدی اس بوجھ کو ہلکا کرے۔ مگر ابھی فراغت وغیرہ کے بہانے بھی باہر نکلنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے یہ بوجھ اسے کچھ دیر اور برداشت کرنا ہوگا۔ عموماً شیٹی سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن آج کے حالات میں اس نے ہیری کا چھوڑا ہوا پیکٹ تلاش کیا اور وقت کاٹنے کے لیے ایک سگریٹ سلگا کر لیٹ گیا۔

صبح پانچ بجے پو پھٹی۔ کمرے میں روشنی آنے لگی۔ شیٹی نے جلدی جلدی تینوں ڈمیوں کو تھپتھپا کر ٹھیک کیا اور پنکھا بند کر دیا تا کہ اوپر سے اڑھائی ہوئی چادر اڑ کر ادھر ادھر نہ ہو سکے۔ اس کے بعد اس نے گارڈ کو آواز دی اور پاخانہ جانے کی خواہش جتائی۔ گارڈ نے اسے فوراً باہر نکال کر دروازے پر تالا لگا دیا۔ آخر تین قیدی تو اندر تھے ہی۔

شیٹی جیسے ہی باتھ روم کے باہری برآمدے میں پہنچا وکرم اچھلتے ہوئے سلاخوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ شیٹی نے دھیرے سے سرگوشی کی، رات کے بارہ بجے گئے۔ گارڈ دور کھڑا تھا اور اس کے سننے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا تھا۔

شیٹی جیسے ہی باتھ روم سے باہر آیا وکرم نے خود بھی گارڈ سے باتھ روم جانے کی ضرورت بتائی۔ اپنی سیل سے نکلتے ہی وکرم نے اونچی آواز میں کہا، ''ارے شیٹی تم ٹھیک تو ہو۔ تمہارے چہرے پر یہ پیلا پن کیسا دکھائی دے رہا ہے۔''

شیٹی سمجھ گیا اور ڈرامائی انداز میں بولا، ''میرے پیٹ میں بہت درد ہے سر، لگتا ہے مجھے پھر باتھ روم جانا ہوگا۔''

وکرم نے پھر گارڈ کی طرف مڑتے ہوئے کہا، ''آپ اس کی حالت دیکھ رہے ہیں؟ اسے شاید پھر سے باتھ روم جانے کی ضرورت پیش آئے اس لیے اسے یہاں رہنے دیں تو بہتر رہے گا۔''

شیٹی فوراً وکرم کی سیل میں گھسا اور پیٹ پکڑ کر بنک پر لیٹ گیا۔ وکرم کے لوٹنے پر گارڈ نے دونوں کو اسی سیل میں بند کر دیا جس میں وکرم پہلے سے تھا۔

''شیٹی! تو نے کمال ہی کر دیا۔ مجھے تجھ پر فخر ہے۔'' وکرم نے لیٹے لیٹے کہا۔

''سر! اب میں اپنے کمرے میں واپس نہیں جانا چاہتا'' شیٹی نے کہا۔ وکرم اس کا خوف اور اکیلا پن بخوبی سمجھ رہا تھا اس لیے اس نے کہا، ''تم یہیں لیٹے رہو۔ کچھ نہ کچھ بہانہ ڈھونڈ ہی لیا جائے گا۔''

اس کے بعد بھی ایک ایک کر کے باتھ روم آئے باتھ روم کے برآمدے سے سیل نمبر ایک کا اندرونی حصہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ وکرم کے ساتھ شیٹی کو بھی دیکھ کر بھی کو معلوم ہو گیا کہ راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیابی مل چکی ہے۔ پھر سب گڈ مارننگ کے بہانے ہی سہی، سیل کے جنگلے تک آ کر خود اپنے کانوں سے سننا چاہتے تھے کہ ملند، ہیری اور گیری واقعی فرار ہو چکے ہیں۔ سب عجیب حالت میں تھے، ایک طرف ہونٹوں پر کامیابیوں کا تبسم، دوسری طرف آنکھوں میں آنے والی آفتوں کا خوف۔ کوئی بھی چہرہ ایسا نہیں تھا جسے نارمل کہا جا سکے۔

آج چھٹی کا دن تھا اس لیے صبح کا ناشتہ کچھ زیادہ آرام سے یعنی ساڑھے آٹھ بجے لگایا گیا۔ ایک ایک سیل کھولی گئی اور سارے قیدی ناشتے کے کمرے کی طرف جانے لگے۔ کارپورل محفوظ خاں خود آنگن میں کھڑے ہو کر سب کا جائزہ لے رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ ڈائنگ روم میں داخل ہوئے اور انھوں نے خود قیدیوں کی گنتی کرنی شروع کی۔

''باقی لوگ کہاں ہیں؟ اور ابھی تک کیوں نہیں آئے؟'' انھوں نے دریافت کیا۔

راز کھلنے کا پہلا متوقع لمحہ آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ محفوظ خاں خود بقیہ تینوں قیدیوں کو ڈھونڈنے جاتے وکرم نے قدرے گرج کر کہا، ''پرسی! جاؤ...... ان لوگوں کو ناشتے کے لیے بلا کر لاؤ۔ یہ سب کیوں رات کو اتنی دیر تک جاگتے رہتے ہیں کہ صبح آنکھ نہ کھل سکے۔ ہم سب کو دیر کرواتے ہیں۔''

پرسی جلدی ہی لوٹ کر آیا اور رپورٹ دی کہ اس نے تینوں کو جلدی آنے کے لیے کہہ دیا ہے۔

محفوظ باہر چلے گئے۔ سبھی بے دلی سے ناشتہ کر رہے تھے اور زیادہ تر لوگ بالکل خاموش بھی تھے۔ انھیں آدھے گھنٹے کا وقت دے کر محفوظ واپس لوٹے۔ دوبارہ آنے پر بھی تین قیدیوں کو نہ دیکھ کر وہ بولے، ''وکرم صاحب! آپ کے یہ تین بندے روز دیر کرتے ہیں۔ آج چھٹی کا دن ہے، کام کرنے والے بھی جلدی صاف صفائی کر کے اپنے اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔''

''پرسی دوڑ کر جا اور دیکھو یہ لوگ اٹھے یا نہیں،'' وکرم نے کہا۔

پرسی فوراً لوٹ کر بولا، ''سر! وہ لوگ ابھی بھی آرام سے پڑے سو رہے ہیں۔'' بے چارہ پرسی اس کے علاوہ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟

وکرم غصّے کی کامیاب اداکاری کرتے ہوئے کہا، ''کارپول محفوظ! آج میں بتاتا ہوں کہ آپ کیا کریں..... بھوکا پڑا رہنے دیجیے ان لوگوں کو۔ آپ ٹیبل وغیرہ صاف کروائیں میں کہہ رہا ہوں آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ آج یہ بھوکے ہی رہیں گے..... سوتے رہیں کمبخت۔''

محفوظ کچھ نہیں بولے۔ وہ دل ہی دل میں خاصے مطمئن لگ رہے تھے۔ ویسے بھی ہندوستانی قیدیوں کے آرام و آسائش میں آئے دن کٹوتی کرنا محفوظ کا من پسند کھیل ہوا کرتا تھا۔ ایسے میں ایک وقت کی پوری خوراک ان کے منھ سے چھین لینا تو بہت ہی بڑی کامیابی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے فوراً کھانے کے برتن ہٹوا دیے بقیہ ملازمین بھی محفوظ کی اس جلد بازی سے خوش ہی تھے۔

قیدی باہر نکلنے لگے۔ روز کی طرح آج پانچ نمبر کمرے میں جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وکرم اپنی سیل میں واپس چلا گیا۔ شیٹی کیمی کے ساتھ گیا اور بھی سارے لوگ کسی نہ کسی بہانے اپنی اپنی سیلوں سے چلے گئے۔ عجیب بات تھی۔ گارڈس نے روز کچھ کم قیدیوں کے الگ الگ سیل میں جانے پر غور ہی نہیں کیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آنکھیں کھلی رہنے کے باوجود انسان بہت کچھ دیکھ نہیں پاتا ہے۔ ویسے بھی آج کے دن گرمی اور امس زیادہ تھی۔ آرام کے لیے سبھی کہیں نہ کہیں سایہ تلاش کر رہے تھے اور اسی حالت میں ساڑھے دس بجے یکایک گارڈ روم کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گارڈ روم وکرم کی سیل سے صرف پندرہ بیس فٹ کی دوری پر ہی تھا اور وہاں ہونے والی ساری گفتگو آرام سے وکرم کو سنائی دیتی تھی۔ محفوظ نے بھی آنگن کے دوسری طرف سے گھنٹی سنی اور آرام سے

چلتے ہوئے ٹیلی فون تک آئے۔وکرم سلاخوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔شاید کوئی اہم بات ہو۔

''کیا؟ کون؟ چیف.....؟'' وکرم نے محفوظ کو کہتے ہوئے سنا۔''ہاں سر۔جی سر، یس سر، جی نہیں سَر۔سارے قیدی تو ہیں سَر۔جی سر..... بالکل سر.....ابھی سر۔'' محفوظ کے ہونٹوں پر آیا ہوا ایک ایک لفظ کانپ رہا تھا اور لائن کٹ گئی۔

محفوظ ہاتھ میں رسیور لیے متحیر کھڑے رہے۔ کچھ پلوں کے بعد جب ذہن کسی لائق ہوا تب وہ حرکت میں آئے اور تیزی سے بھاگ کر آنگن کے دوسری طرف پولس والوں کے ریٹائرنگ روم پہنچے جہاں سے ایک دوسرے ساتھی کو ساتھ لیا اور دوڑتے ہوئے پانچ نمبر کمرے میں پہنچے جہاں آرام سے لیٹی ہوئی ''ڈمیز'' ان کا منھ چڑھا رہی تھیں دونوں غصّے سے پاگل ہو کر وہ بستر نوچنے لگے جو ابھی تک ملند، گیری اور ہیری کا رول کر رہے تھے۔دروازے کھڑکیوں اور روشن دانوں کا غور سے جائزہ لیا، کہیں کوئی ٹوٹ پھوٹ بھی نہیں تھی اور تو اور کہیں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ چارپائیاں ادھر ادھر کھسکائیں۔ جوتوں، ڈبوں اور کمبلوں کو پیروں سے ادھر ادھر کیا تو دیوار کے نیچے کی طرف ننگی اینٹیں دیکھ کر دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔محفوظ نے جھک کر اینٹیں ہٹائیں۔سرنگ سے باہر کی دنیا پر نگاہ ڈالی اور خود ان کے اندر کی دنیا نا امیدی اور لاچاری میں گہرائی تک ڈوبتی چلی گئی۔

کچھ ہی پلوں میں ایک اور پولس والا کارپورل چودھری گارڈ روم میں آ پہنچا۔محفوظ نے ٹیلی فون پر چیف سے ہوئی ساری گفتگو اسے بتائی۔

''چیف کو معلوم ہو گیا ہے.....ہم بڑی مصیبت میں ہیں.....کورٹ مارشل رکھا ہے،'' محفوظ کہہ رہے تھے۔

''تم نے صرف اتنا ہی کہا تھا؟ ٹھیک سے یاد کر لو اس سے زیادہ تو کچھ نہیں بول گئے،'' چودھری نے پوچھا۔

''ہاں بھائی!!'' جب انھوں نے کہا'' جاؤ اور جا کر دیکھو،'' تو میں نے صرف یس سَر ہی کہا تھا۔

''تب انھیں کیا معلوم کہ جس وقت ٹیلی فون آیا ہم دونوں کیا کر رہے تھے؟'' چودھری نے

سوچتے ہوئے کہا، "ہم کہہ سکتے ہیں کہ چار قیدیوں نے بھاگنے کی کوشش کی جن میں تین تو کامیاب ہو گئے مگر چوتھے کو ہم نے جانے نہیں دیا۔"

"مگر یہ چوتھا ہے کون؟" کورٹ مارشل کے تصورات میں ڈوبے ہوئے محفوظ سہارے کے لیے تنکا تلاش کر رہے تھے۔

تیسرے پولس والے نے کہا، "اسی وکرم کو اس کمرے میں ڈالو۔ اسی حرام زادے نے سب کروایا ہے۔ اسی سالے کو سرنگ میں آدھا گھسیڑ کر گولی ماردو۔ ہم کہہ دیں گے کہ ہم نے چوتھے کو روک لیا۔"

"جلدی سے اس کی سیل کی چابی لاؤ،" چودھری نے حکم دیا اور اپنا ریوالور مجھے دو۔

محفوظ بھاگ کر ڈیوٹی گارڈ سے چابی لینے گئے۔ یہ لوگ ہڑبڑاہٹ میں یہ سوچ ہی نہیں پا رہے تھے کہ ایسا کرنے سے قیدیوں کے بھاگنے کا وقت دن کے گیارہ بجے مقرر ہو جائے گا۔ جب کہ تینوں مفرور قیدی یہاں سے پتہ نہیں کتنی دوری پر اور کہاں پکڑے گئے ہیں۔

وکرم سلاخوں کے پاس کھڑے ہو کر سب کچھ سن چکا تھا۔ پہلے تو پولس والوں کی باتوں پر اسے یقین نہیں ہوا مگر بہت جلد اسے لگا کہ اپنی غلطی چھپانے کے لیے پاگل پن میں کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کسی بھی لمحہ یہ لوگ اسے گھسیٹ کر پانچ نمبر کمرے میں لے جائیں گے اور سرنگ میں گھسیڑ کر گولی مار دیں گے۔ اس خوفناک امکان سے وکرم خود پاگل سا ہو گیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دشمن کی اس قید میں تین تین پولس والے اس کی جان لینے پر آمادہ تھے۔ عجیب بات تھی اپنے فرائض سلیقے سے نبھا نہیں سکے، دن رات غفلت میں پڑے رہے اور اب اپنے عیب چھپانے کے لیے اس کی قربانی دینے پر تلے ہوئے تھے۔ وکرم خود کو ایسے جانور کی طرح محسوس کر رہا تھا جسے ہر طرف سے گھیر لیا گیا ہو اور صرف پہلے وار کا انتظار ہو۔

پریشانی اور خوف و ہراس کے اسی عالم میں وکرم کی نگاہ بنک پر رکھی ہوئی "مقدس گیتا" پر پڑی۔ اس نے جھٹ سے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا۔ کتاب کے سرورق پر شری کرشن کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وکرم نے تصویر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور بہت دیر تک دیکھتا ہی رہا جیسے کوئی طاقت، کوئی انرجی ادھر سے ادھر منتقل ہو رہی ہو۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس عظیم اور مہربان

طاقت سے اس کی امید اور التجا کا رشتہ جڑ رہا ہو۔

"تو نے مجھے جنگ کے میدان میں بچائے رکھا حالانکہ وہاں مجھے عزت کی موت نصیب ہوتی مگر تو نے مجھے نہیں مرنے دیا....." وکرم شری کرشن کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بے آواز لفظوں میں کہہ رہا تھا۔

"اور اب مجھے تو مرنے دے گا.....وہ بھی اس طرح.....ایک کتے کی موت۔"

"نہیں بھگوان..... مجھے کتے کی موت مت مرنے دے..... مارنے جلانے والا تو ہی ہے.....مجھے اس طرح نہ مار۔"

ٹیلی فون پھر بجنے لگا۔ایک لگاتار گھنٹی۔اس قدر تیز گھنٹی کہ ایسی تیز گھنٹی وکرم نے کبھی نہیں سنی تھی۔ویسے تو گھنٹی معمولی ہی تھی۔لیکن وکرم کو باطنی طور پر محسوس ہو رہا تھا جیسے اس گھنٹی میں کوئی حکم تھا،کوئی دلاسا تھی کوئی پیغام تھا۔

اسی اثنا میں کسی کے جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور وکرم ٹیلی فون پر کارپورل چودھری کی یکطرفہ گفتگو غور سے سننے لگا۔

"جی ہاں سَر وہ سب یہیں ہیں۔الگ الگ سیلوں میں بند ہیں سَر۔"

"جی ہاں سَر ......سات ہیں.....ساتوں بند ہیں،" چودھری دوسری طرف سے کسی افسر کی باتیں سننے کے بعد کہہ رہا تھا۔"بالکل ٹھیک سر،ہم کچھ بھی نہیں چھوئیں گے۔کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگائیں گے۔سب جوں کا توں رہے گا سَر۔"

کیمپ میں ساری کارروائی جہاں کی تہاں رک گئی۔وکرم کی جان میں جان آئی۔اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔یہاں سات قیدیوں کے حاضر رہنے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔اب کسی کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔وکرم کی سانسیں دھیرے دھیرے نارمل ہوئیں حالانکہ اس کے دماغ میں ابھی بھی خاصی ہلچل تھی۔اس نے پھر مقدس گیتا کے کور پر شری کرشن کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں کہا،" دھنیہ ہے پربھو! تو نے ان سرپھروں سے مجھے بچا ہی لیا۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے رک کر بولا،" ابھی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے،اشتعال زیادہ ہے آرام سے آرادھنا کروں گا، تجھے دھنیہ واد کہوں گا.....اور کیا کہوں گا؟.....اور کیا کہہ ہی سکتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ایک جیپ گیٹ پار کر کے باہر گئی اور کچھ ہی لمحوں میں نقوی کو لے کر واپس ہوئی۔ انھوں نے جیپ سے اترتے ہی فوراً سارا قصہ سنا اور باریکی سے ایک ایک پہلو کا جائزہ لیا۔ مسٹر نقوی نے اپنے سارے پولس ماتحتوں کو اکٹھا کیا اور اپنی تمام تر ہکلاہٹوں کے ساتھ گویا ہوئے

''م.....م.....میں نے سوچ لیا ہے د.....د.....دراصل میں راستے ہی س.....س.....سے سوچ رہا تھا گھ.....گھ.....گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ک.....ک.....ک.....کہاں جاسکتے ہیں ج..... ج.....ج..... جانے کی کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔'' ایک معمولی سے وقفے کے بعد نقوی پھر گویا ہوئے'' ج.....ج.....جہاں بھی جائیں گے پ.....پ.....پ.....پکڑے جائیں گے۔''

بعد میں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ سارے پولس والے اپنے افسر نقوی کی باتوں میں آکر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے کچھ ہی دیر میں جب پاس کے چکلالا ہوائی اڈے کے اسٹیشن کمانڈر کی تشریف آوری ہوئی تو سارے کیمپ میں ہڑبڑی مچ گئی۔ شیٹی کو آناً فاناً میں کیمپ کی سیل سے نکال کر ایک اندھیرے اور حبس زدہ کمرے میں بند کر دیا گیا جہاں پہنچتے ہی شیٹی پر بے شمار مچھر ٹوٹ پڑے۔ وہ ایذا رسانیوں کے نئے دور سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ ابھی تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ محفوظ پھر شیٹی کو نکال کر دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں پاکستان ایئر فورس کے ایک ونگ کمانڈر اور دو دوسرے افسر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''تم پچھلی رات سیل نمبر 5 میں ہی تھے؟'' ونگ کمانڈر نے پوچھا۔

''جی ہاں،'' شیٹی نے جواب دیا۔

''اس سیل کے بقیہ تین قیدی کس وقت وہاں سے فرار ہوئے؟''

''سر! مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا بک رہے ہو؟ تم نے انھیں باہر جاتے نہیں دیکھا؟'' قدرے تلخ آواز میں پوچھا گیا۔

''جی نہیں!'' شیٹی نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمھارا مطلب ہے کہ ایک ہی کمرے میں رہتے ہوئے تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے ساتھی کمرے سے کب فرار ہو گئے۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں سر'' ! شیٹی نے التجا کے انداز میں کہا۔ میں سو رہا تھا، سوتے میں کیا ہوا

مجھے نہیں معلوم۔ صبح اٹھتے ہی میں باتھ روم گیا، میرے پیٹ میں اس قدر شدت کا درد تھا کہ میں باتھ روم سے ہی لگے ہوئے وکرم صاحب کے سیل میں جا کر لیٹ گیا۔"

پاکستانی آفیسرس شیٹی کے عدم تعاون سے خاصے ناراض دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کا منھ دیکھتے رہے لیکن کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے کہ آخر شیٹی کو کس طرح راہِ راست پر لایا جائے۔ آخر ونگ کمانڈر نے شیٹی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "فی الحال تمھیں سیل میں بھیجا جا رہا ہے۔ دوبارہ پھر بلایا جائے گا۔ خوب سوچ سمجھ لینا۔ اگر تم نے ہم سے تعاون نہیں کیا اور ہوشیاری کی باتیں کیں تو یاد رہے ہمارے پاس سچ اگلوانے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔"

تیسرے پہر نصیر الدین کیمپ پہنچے۔ ہندوستانی قیدیوں کو بعد میں پتہ چلا کہ دو دن چھٹیاں گذارنے کی غرض سے وہ اپنی بیگم کے ساتھ مری ہل اسٹیشن گئے تھے۔ رات کے طوفان کی وجہ سے ٹیلی فون خراب پڑے تھے۔ میدانی علاقوں سے یہاں کا رابطہ ٹوٹا ہوا تھا۔ تپتی ہوئی دوپہر میں جس وقت وہ ٹھنڈی بیر کا مزہ لے رہے تھے، کسی طرح اطلاع ملی کہ ان کی سپردگی سے تین ہندوستانی قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ نصیر الدین کے ہوش اڑ گئے۔ آندھی طوفان کی طرح بیوی کو کار میں بٹھایا اور راولپنڈی کی طرف چل دیے۔ گھبراہٹ اور جلد بازی دونوں ڈرائیونگ کے لیے مضر ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دور سفر کرنے کے بعد نصیر الدین کی کار سڑک سے پھسل کر ایک کھڈ میں جا گری۔ حواس کچھ نارمل ہوئے تو دیکھا کہ میاں بیوی الٹی پڑی ہوئی گاڑی میں الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ غنیمت تھی کہ گاڑی زیادہ گہرائی میں نہیں گری تھی اور یہ دونوں صحیح سلامت باہر نکل آئے۔ پھر کسی طرح قسطوں میں راولپنڈی پہنچے۔ راولپنڈی پہنچتے ہی نصیر الدین نے سیدھے کیمپ کا رخ کیا۔ پوری کہانی سنی، جائے واردات کا معائنہ کیا اور سیدھے شیٹی کے کمرے میں پہنچے۔

"حرام زادے بتا کیا ہوا پچھلی رات؟" شیٹی پر نگاہ پڑتے ہیں نصیر الدین پھٹ پڑے۔

شیٹی کو شروع ہی سے پاکستانیوں کے غیر مہذب برتاؤ سے چڑھ تھی۔ گالیاں اسے بالکل برداشت نہیں تھیں۔ موجودہ حالات میں اس کے لیے چاہے کچھ نہ کر پائے مگر بآسانی سہن بھی نہیں کر سکتا۔

''میں کچھ نہیں جانتا، یہ میں ونگ کمانڈر کو بتا چکا ہوں، اور آپ کو بھی بتا دیتا ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم ہے،'' شیٹی نے گرم لہجے میں جواب دیا۔

''اگر تو نے سچ سچ نہیں بتایا سالے تو میں تیرے ہاتھ پیر توڑ ڈالوں گا،'' نصیر نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

شیٹی کو بہت زبردست غصہ آیا، لیکن کچھ بولا نہیں بس نصیر کی آنکھوں میں متواتر آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ جواب میں جب نصیر سے کچھ نہیں بن پڑا تو وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ باہر نکل کر اس نے سب سے پہلے ایک ایک کمرے کی تلاشی کروائی اور ضروری کاغذات کے ساتھ ساتھ ساری کتابیں وغیرہ بھی ضبط کر کے لے گیا۔ تلاشی کے بہانے اس نے ہندوستانیوں کو جسمانی تکلیفیں بھی پہنچائیں اور ان کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ بھی کیا۔ بلکہ وکرم کے ساتھ کچھ زیادہ ہی شیطانیت کا مظاہرہ کیا گیا۔ غصے کا یہ عالم تھا کہ بولتے وقت نصیر کے منھ سے باقاعدہ تھوک آرہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کھسیانی بلّی کھمبا نوچے والی کہاوت آج ہی کے دن کے لیے جنمی تھی۔

دوسرے دن شیٹی کو ایک دوسرے ایئر کموڈور کے سامنے پیش کیا گیا۔ لیکن شیٹی نے جو بیان رٹ لیا تھا اس سے ذرّہ برابر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے پوری طرح یہ سوچ رکھا تھا کہ اگر زیادہ زور زبردستی یا کسی طرح کی تھرڈ ڈگری کا استعمال بھی کیا گیا تب بھی وہ خاموش ہی رہے گا۔ ہاں تکلیف برداشت سے باہر ہو جائے گی تو دیکھا جائے گا۔

کئی روز کی اتھل پتھل کے بعد آخر کار پاکستانیوں کی سمجھ میں آ ہی گیا کہ تینوں مفرور قیدی دوبارہ ان کی گرفت میں آ ہی چکے تھے۔ سارا کا سارا ماجرہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا ہی۔ اب مزید پوچھ تاچھ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دراصل کمی تو خود انھیں کی تھی۔ ان کے گارڈ کچھ جان ہی نہیں سکے کہ کب اینٹیں کھسکائی گئیں، کب پلاسٹر توڑا گیا اور کس طرح راہِ فرار اختیار کی گئی۔ لہٰذا تفتیش کا سلسلہ یہیں ختم کر دیا گیا اور سیکیورٹی کو مزید مضبوط کرنے کے لیے سارے قیدیوں کو الگ الگ بند کیا جانے لگا۔ حد ہے کہ انھیں کھانا بھی ان کی سیل میں ہی پہنچانے کا انتظام کر دیا گیا۔ اکیلا پن سب سے خطرناک قسم کی سزا ہے اور قیدِ تنہائی اچھے خاصے انسان کو پاگل کر سکتی ہے۔ اس لیے زیادہ تر قیدیوں نے گانا بجانا شروع کر دیا۔ سب سے بھونڈی اور بے سری آواز شیٹی کی تھی۔ اس کا من پسند ریکارڈ جو

دن رات بغیر رکے ہوئے بجتا رہتا تھا۔ "چھوڑ گئے بالم مجھے ہائے اکیلا چھوڑ گئے" پاکستانیوں کو بے حد ناپسند تھا لیکن بار بار منع کرنے کے بعد بھی شیٹی کے ریکارڈ کو بند نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

اگلے دن شیٹی کو صبح تین ہی بجے جگا کر بتایا گیا کہ وہ کپڑوں کا دوسرا سیٹ بھی ساتھ لے لے کیوں کہ اسے کہیں اور لے جانا ہے۔ پہلے تو شیٹی نے سمجھا کہ یہ حکم اسے بطور سزا دیا جا رہا ہے۔ لیکن باہر اور دوسرے قیدیوں کو دیکھ کر پتہ چلا کہ بھی کے بھی کسی دوسری جگہ لے جائے جا رہے ہیں۔ تقریباً چار بجے سب کو ہتھکڑیاں پہنا کر آنگن میں اکٹھا کیا گیا۔ اپنے خراب مزاج کے لیے جانا جانے والا نصیر سارے قیدیوں سے چلا چلا کر بدزبانی کر رہا تھا۔ جانے کیسا غصہ تھا کہ چلتے چلتے کرسی پر ہی ایک لات جڑ دی۔ پارہ اور چڑھا تو ریوالور نکال کر دو فائر کر دیے۔ خدا جانے وہ سب کو کیا بتانا چاہتا تھا۔ دھواں نکلتا ہوا ریوالور ہاتھ میں لے کر اس طرح قیدیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے فوراً ہی ایک ایک کو موت کی سزا دے ڈالے گا۔

تم لوگوں کو کسی دوسری جگہ لے جایا جا رہا ہے۔ راستے بھر ہتھکڑی بھی لگی رہے گی اور آنکھوں کی پٹی بھی نہیں کھولی جائے گی۔ کسی نے کوئی بھی ناجائز حرکت کی تو سختی کے ساتھ پیش آیا جائے گا۔ نصیر بولتے بولتے رک گیا اور ہوا میں دو فائر کر کے پھر بولا، "مطلب یہ ہے کہ سیدھے گولی مار دی جائے گی۔" سارے قیدی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے بلکہ شیٹی کو تو ہنسی بھی آ گئی۔ نصیر نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو لیکن کچھ بولا نہیں ہاں منہ سے جھاگ نکلنا ضرور شروع ہو گیا۔

سارے ہندوستانی قیدیوں کو ایک کار اور چار جیپوں میں بٹھایا گیا۔ ہر گاڑی میں کاربائن لیے دو فوجی بھی تھے۔ تقریباً دو گھنٹے متواتر سفر کرنے کے بعد ایک باغ میں یہ قافلہ رکا جہاں بھی قیدیوں کو چائے اور پراٹھے کا ناشتہ دیا گیا۔ مزید تین گھنٹے سفر کے بعد وہ لائل پور ہائی سیکیورٹی جیل پہنچے۔ جہاں ان سب کو نئے جیلر کرنل حنیف کے حوالے کر دیا گیا۔

لنڈی کوتل میں پکڑے جانے کے بعد ملند، گیری اور ہیری کو پیشاور کی کسی ایئر فورس یونٹ کے الگ الگ کمروں میں بند کر دیا گیا۔ ہیری اپنے کمرے میں بے پناہ گرمی محسوس کر رہا تھا۔ کوئی پنکھا بھی نہیں تھا اوپر سے بے شمار مچھر ہیری پر ہر طرف سے حملہ کر رہے تھے۔ فرش پر بیٹھا ہیری ان مچھروں کو مار رہا تھا کہ گیری کی آواز میں کہیں سے کے۔ ایل۔ سہگل کا گایا ہوا گانا سنائی دیا۔ گیری

نے سیٹی بجائی پھر دبی زبان میں ہیری کو پکارا بھی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ تب اس نے ایک کر کے ساری دیواروں کو تھپتھپانا شروع کیا۔ پوشیدہ اشاروں کے طور پر استعمال ہوئی اس تھپتھپاہٹ کا جواب داہنی طرف کی دیوار سے ایسی ہی تھپتھپاہٹ کی شکل میں موصول ہوا۔ کچھ دیر رک کر ہیری نے وہیں سے گیری کو آواز دی۔

"گیری..... ملند کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم،" گیری نے جواب دیا۔

"کمرے میں چارپائی ہے؟" ہیری نے پھر پوچھا۔

"نہیں..... پنکھا بھی نہیں ہے اور مچھروں کے تو کیا کہنے،" گیری نے جواب دیا۔

"ادھر بھی یہی حال ہے،" ہیری نے اپنے بارے میں بھی بتا دیا۔

ملند نے اس نئی جیل میں پہنچتے ہی ملازمین کو بتا دیا تھا کہ وہ ایک سینئر افسر ہے لہٰذا اس کو کچھ خاص سہولتیں بھی ملنی چاہیے۔ بہر حال اُسے جس کمرے میں بند کیا گیا اس میں پنکھا بھی تھا اور چارپائی کے علاوہ کرسی میز کا ایک سیٹ بھی۔ تھوڑی دیر کمرے کا معائنہ کرنے کے بعد ملند نے ہلا ڈلا کر آتش دان سے لوہے کی ایک چھڑ نکال لی اور میز پر کرسی رکھ کر چھت کے پتھروں کو کھسکا کر یہ دیکھنے لگا کہ شاید فرار کا پھر کوئی راستہ نکل آئے۔ وہ میز پر چڑھا یہ سب کر ہی رہا تھا کہ یکا یک دروازہ کھلا اور وہاں کی سیکیورٹی کا انچارج سارجنٹ اندر داخل ہوا۔

"ارے، ارے آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" سارجنٹ نے قدرے آرام سے پوچھا۔

"میں اس پنکھے کی رفتار کچھ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا،" ملند سے فوراً جو جواب بن سکا اس نے دے دیا۔

"وہ ریگیلو لیٹر اسی کام کے لیے لگوائے گئے ہیں، دیکھیے اس طرف،" سارجنٹ نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، دراصل میں نے دھیان ہی نہیں دیا،" بھلا ملند اس کے علاوہ کہہ ہی کیا سکتا تھا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" سارجنٹ کے تیور اچھے نہیں تھے۔

ملند کرسی سے پہلے میز پر، پھر میز سے فرش پر اترا اور سارجنٹ کے سامنے جا کر کھڑے

ہوتے ہوئے بولا۔ ڈیئرسٹ سارجنٹ! جب سے ہم آپ کی حراست میں ہیں، آپ مستقل ناراض دکھائی دے رہے ہیں جب کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے بلکہ جنگی قیدی کی حیثیت سے آپ کی جیل سے فرار ہونا ہمارا فرض ہے۔"

سارجنٹ نے ملند کی طرف غصے سے گھورتے ہوئے کہا، "کیا آپ ہمیں چنوتی دے رہے ہیں؟"

ملند نے بھی نہلے پر دہلا مارتے ہوئے کہا، "میں صرف ایسا کہہ نہیں رہا ہوں بلکہ اگر موقع ہاتھ لگا تو میں یہاں ایک پل بھی رکنے کا نہیں۔"

فوراً ملند کو ہتھکڑی پہنائی گئی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک جیپ میں بٹھایا گیا۔ کچھ دور جیپ چلتی رہی۔ اس بار ملند کو جس کمرے کے حوالے کیا گیا اس کا دروازہ لوہے کی سلاخوں سے بنا ہوا تھا اور روشن دانوں پر بھی لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ دراصل ملند کو گمراہ کرنے کی کوشش میں کچھ دیر ادھر ادھر گھما کر گیری کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا اور ٹھیک اسی طریقے سے گیری کو ملند کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جہاں گیری آرام سے میز پر اپنی ٹانگیں پھیلا کر پنکھے کی فرائے دار ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

لیٹنے کے لیے سبھی کو ایک پلاسٹک کی شیٹ اور ایک تکیہ دیا گیا۔ رات کے ابھی دس بجے ہوں گے کہ ایک پولس والے نے آ کر ہیری سے پوچھا کہ "کیا وہ باہر کی کھلی ہوا میں چلنا پسند کریں گے۔" قید خانے کے اس گھٹن بھرے کمرے سے باہر نکلنے کا سنہری موقع چھوڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا تھا۔ سو ہیری فوراً اٹھ کر تیار ہو گئے۔ پولس والے کے مطابق کھلی ہوا میں تو نہیں، ہیری کو ایک ایسے کمرے میں ضرور لے جایا گیا جہاں پنکھا بھی تھا اور کچھ کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ سویلین کپڑوں میں دو صاحبان یہاں پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے انھیں کے سامنے ہیری بھی جا کر بیٹھ گیا۔ دراصل انھیں جیل سے فرار ہونے کے اس واقعے پر ہیری سے تفصیلی گفتگو کرنی تھی۔ وقت گذر چکا تھا۔ بس کمبخت یہ بنگالی اپنی منحوسیت لے کر وہاں نہ آ جاتے تو آج سب آزاد ہوتے۔ خیر اب پوشیدہ رکھنے کے لیے بچا ہی کیا ہے۔ اس لیے ہیری نے مسکراتے ہوئے تمام احوال حرف بہ حرف بیان کرنے کی رضامندی دے دی۔ ابھی باقاعدہ گفتگو کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ سامنے رکھے

''بلیر س'' سگریٹ کے پیکٹ پر ہیری کی نگاہ پڑی اور اس نے بغیر کسی تکلف کے ہاتھ بڑھا کر پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ جلالی۔

''آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟'' ہیری نے پہلے کش کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا اور پھر گفتگو شروع کر دی۔ اس نے بڑے مزے کے ساتھ پورا واقعہ تفصیل سے بیان کیا۔ کیسے راولپنڈی میں ''مرے'' کی کتاب دستیاب ہوئی۔ کس ہوشیاری سے سرنگ بنائی گئی، کس طرح کپڑوں کا انتظام کیا گیا پھر جیل سے نکلنے سے لے کر راستے بھر کے دلچسپ واقعات اور رابطے میں آئے پاکستانیوں پر مزے دار طنز۔ مگر جیسے ہی آخری سگریٹ ختم ہوئی، ہیری نے تکان کا بہانہ کرتے ہوئے اس امید کے ساتھ محفل برخاست کی کہ زندگی رہی تو کل پھر ملاقات ہوگی اور سگریٹ نوشی کے ساتھ ساتھ غپ شپ کا ایک اور دوسرا دور برا نہیں رہے گا۔ مگر افسوس کہ دوسرے دن کسی نے بے چارے ہیری کو دوبارہ بلانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

دوبارہ بھاگنے کے خوف سے ملند کا داہنا ہاتھ ہتھکڑی لگا کر سلاخوں میں زنجیر سے باندھ دیا گیا۔ جس کی وجہ سے اس کی رات بہت مشکل میں گذری۔ آخر وہ صرف بائیں ہاتھ سے مچھر بھی تو نہیں مار سکتا تھا۔ رات بھر اچھی طرح نہ سو پانے کی وجہ سے صبح تک وہ بری طرح تھک چکا تھا اور اس کے ذہن پر اچھی خاصی جھلاہٹ سوار ہو رہی تھی صبح روزمرّہ کی ضروریات کے لیے اسے کھولا گیا اور فارغ ہو جانے پر چائے اور پراٹھے کا ناشتہ پیش کیا گیا۔ ملند نے دل ہی دل میں رہنے سہنے کا انتظام درست کروانے کی ٹھان لی اور پولس کارپورل سے کہا کہ ''وہ فوراً اس کے افسر سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔''

''کیوں؟ کیا کہنا ہے آفیسر سے؟'' کارپورل نے پوچھا۔

''وہ آپ کے افسر کے علاوہ کسی اور سے کوئی بات نہیں کروں گا،'' ملند بولا۔

''وہ اس وقت یہاں نہیں ہیں۔''

''تو سن لیجیے۔ میں اس وقت سے بھوک ہڑتال پر ہوں اور اس وقت تک کچھ نہ کھاؤں پیوں گا جب تک میری ان سے ملاقات نہیں ہو جاتی۔ بتا دیجیے گا ان کو اور لے جائیے اپنا چائے

آفیسر کو ملند کی بھوک ہڑتال کے بارے میں فوراً بتادیا گیا۔انگریزوں کی زیادتیوں کے خلاف ایک زمانے میں بہت سے لوگ اکثر بھوک ہڑتال کیا کرتے تھے۔اسی طرح بھوک ہڑتال کے حوالے سے ایک افسر نے ''گاندھی جی'' کا نام سن رکھا تھا جو ذرا ذرا سی بات پر بھوک ہڑتال پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔اس طرح بھوک ہڑتال کے تجسس نے اسے فوراً ملند سے ملنے پر مجبور کردیا۔

''بتائیے کیا بات ہے؟'' افسر نے ملند کے کمرے میں پہنچتے ہی کہا۔

''آپ کے ماتحت مجھے سزا کے طور پر کیوں پریشان کر رہے ہیں؟'' ملند نے پوچھا۔

''بکواس.....آپ کو کوئی تنگ نہیں کر رہا۔صرف آپ کو قید میں بحفاظت رکھنے کے لیے ہم اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں۔صاف صاف بتائیے! آپ کو کیا شکایت ہے؟''

''مجھے رات کمرے میں ہتھکڑی لگا کر دروازے سے باندھا گیا۔پنکھا نہیں دیا گیا۔ ہزاروں مچھروں نے رات بھر میرا خون چوسا اور بدلے میں مجھے ملیریا دے گئے اور آپ کہتے ہیں کہ مجھے تنگ نہیں کیا گیا؟''

''یہ سب تو اسی لیے ہے کہ آپ کبھی بھی بھاگنے کی کوشش کر سکتے ہیں،'' آفیسر نے لاچاری سے کہا۔

''دیکھیے آپ مجھ پر جیل توڑ کر بھاگنے کا چارج لگا سکتے ہیں، سمری کورٹ مارشل کر سکتے ہیں۔تیس روز کی قید تنہائی دے سکتے ہیں یا آدھے مہینے کی تنخواہ روک سکتے ہیں۔لیکن ''جینوا کنونشن'' کے مطابق جیل میں ایک افسر کی طرح رہنا میرا حق ہے۔باہر ٹینکوں کا پہرہ لگا سکتے ہیں یا اور جو بھی چاہیں سخت سے سخت انتظام کر سکتے ہیں،'' ملند بولتا ہی چلا گیا۔

پہلی بار افسر مسکرایا۔یہ اس کی طرف سے نرم شروعات تھی۔ابھی تک تو وہ صرف افسر ہونے کی حیثیت سے اپنے اندر کی سخت تصویر پیش کر رہا تھا۔

''میں آپ کے حوصلے اور ہمت کی داد دیتا ہوں،'' وہ ہنس کر بولا۔اس ایک جملے میں اس نے بتادیا کہ اس کی نگاہ میں وہ باہمت اور جانباز سپاہی تھے۔سچائی اور ایمانداری سے اپنے فرائض کی ادائیگی کرنے والے ان اچھے کھلاڑیوں کی طرح جو ہار کر بھی ہار نہیں مانتے۔اسی مٹی سے بنے لوگ، جن پر کوئی بھی قوم فخر کر سکے۔

"مگر میں آپ کو فرار ہونے میں دوبارہ کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔" کہتے ہوئے افسر وہاں سے چلا گیا۔ فوراً سارے کمروں میں پنکھے اور پلنگ وغیرہ کا انتظام ہو گیا اور سبھی کو آرام نصیب ہوا۔ ملند بھی اس افسر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا زندہ دل انسان تھا کوئی عام آدمی ہوتا تو ملند کے اس رویے سے اس کے غصے میں اور اضافہ بھی ہوتا، ساتھ ہی سب کو بے جا سختیاں بھی جھیلنی پڑتیں۔ ذرا سا سکون نصیب ہوا تو ملند کو اپنی اینٹھتی ہوئی آنتیں اس طرح یاد آئیں کہ فوراً بھوک ہڑتال بھول کر اس نے گارڈ کو آواز لگائی اور کہا کہ "ذرا کارپورل صاحب سے کہیے کہ میرا اچار پراٹھا تو لا دیں۔"

ملند وغیرہ یہاں پورے ایک ہفتہ رکھے گئے۔ الگ الگ کمروں میں قید، لیکن آرام و سکون کے ساتھ کارپورل لعل خاں تمام انتظامات دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے کبھی بھی کھانے وغیرہ میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ یہاں ضابطے کا رکھ رکھاؤ تو سخت تھا لیکن برتاؤ میں انسانیت اور خلوص راولپنڈی سے کہیں زیادہ تھا۔ وہاں چھوٹے پن اور بدلے کا زبردست احساس تھا جب کہ یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

ہفتے بھر بعد ہی ایک دن پھر سفر کی تیاری ہوئی۔ پھر وہی ہتھکڑیاں اور آنکھوں پر سیاہ پٹی۔ ملند اور ہیری ایک گاڑی میں بٹھائے گئے۔ گیری اور جیل کے سینیئر افسر الگ گاڑی میں۔ سب کو معلوم تھا کہ پہلا پڑاؤ راولپنڈی ہی ہوگا۔ قافلہ جیسے ہی پشاور سے باہر نکلا آفیسر نے سب کی آنکھوں سے پٹیاں الگ کروا دیں۔ مختلف دلچسپیوں سے بھرا ڈھائی گھنٹے کا یہ سفر ختم ہوا تو راولپنڈی کی وہی جیل، دکھ درد سے زخمی دینے والے وہی نصیر الدین، ناراض سا منہ بنائے ہوئے محفوظ اور وہی چودھری وغیرہ نگاہوں کے سامنے تھے۔ نصیر نے فوراً انھیں سیل نمبر ایک، دو اور تین میں الگ الگ بند کرا دیا اور پشاور کی ٹیم کو "خدا حافظ" کہنے تک کی اجازت نہیں دی۔

کافی دیر کے بعد تقریباً تیسرے پہر نصیر آئے اور سیدھے ہیری کی سیل میں داخل ہو گئے۔ وہ اس وقت کے جولیس سیزر کی طرح نظر آ رہے تھے جس وقت بروٹس نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔

"آپ لوگوں کا برتاؤ میرے ساتھ وہ نہیں رہا جو میں نے آپ لوگوں کے ساتھ کیا۔" انھوں نے دکھی من سے کہا۔

ہیری کو سمجھنے میں ایک دو پل لگ گئے۔ وہ بولا۔ ”سر! پلیز یہ قطعی نہ سمجھیے کہ ہم نے یہ کام آپ کو کسی پریشانی میں ڈالنے کے لیے کیا تھا۔ یقین کیجیے کہ ہم لوگ اس گھٹن میں رہتے رہتے پریشان ہو چکے تھے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔“

”مگر آٹھ مہینوں بعد؟؟“ نصیر نے سوال کیا۔ ”آخر تم لوگوں نے یہ سب اس وقت کیوں نہیں کیا جب ہمیں ہر وقت شک رہا کرتا تھا کہ ملند اور گیری کسی بھی وقت فرار ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ایسے وقت میں خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ سارے قیدیوں کی رہائی ہونے والی ہو؟“ حالانکہ یہ بتا کر نصیر نے کیمپ میں ہوئی لاپروائیوں کی وجہ خود ہی بیان کر ڈالی۔

اگلے روز ”ملٹری کورٹ“ کے اجلاس پر تینوں ملزم پیش کیے گئے۔ الزامات اور سوالوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پاکستانی افسر پوری طرح اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اس کیمپ کے اصلی حاکم ہندوستانی قیدی ہیں۔ نصیر، ان کے پرائیویٹ سکریٹری اور گارڈس ان لوگوں کے نوکر چاکر کا رول کر رہے ہیں۔ وجہ صاف تھی کہ اس واردات میں فرار ہونے والے قیدی اپنی مرضی سے سب کچھ کروا لینے میں کامیاب رہے ہیں۔ یہ ڈرامہ ایک گھنٹہ چلا۔ اس کے بعد انھیں ایک ایک کر کے نصیر کے دفتر لے جایا گیا۔ جہاں سر پر ٹوپی پہنے بڑی ہی سنجیدہ حالت میں اسکواڈرن لیڈر نصیر الدین نے کورٹ کا فیصلہ سنایا۔

”تیرہ اگست سن انیس سو بہتر کی رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے جیل کی دیوار توڑ کر بھاگنے کے جرم میں آپ کو مجرم قرار دیتے ہوئے ”جنیوا کنونشن“ کے مطابق تیس دن کی قید تنہائی کی سزا دی جاتی ہے۔ سارے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ سزا آپ کے گرفتار ہونے کے دن یعنی چودہ اگست کو صبح ساڑھے دس بجے سے شروع مانی جائے گی۔ آپ لوگوں کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟“

”جی نہیں سر!!!“ سب نے ایک ہی جواب دیا۔

آپ جا سکتے ہیں۔

اسی رات ملند، ہیری اور گیری تینوں کو جیل سے ریلوے اسٹیشن لایا گیا۔ جہاں ٹرین کے الگ الگ ڈبوں میں لٹا کر ان کے ایک ایک ہاتھ زنجیر سے اوپر کی برتھ میں باندھے گئے۔ ہتھکڑی سے اتنی لمبی زنجیر لگی ہوئی تھی کہ باتھ روم جانے پر بھی باہر کھڑا گارڈ یہ زنجیر پکڑے رہتا تھا۔ لگتا تھا

جیسے بڑے ہی قیمتی قسم کے ولایتی کتوں کی دیکھ بھال کی جا رہی ہو۔ اگلے دن کی دوپہر کو یہ لوگ بھی لائل پور کی جیل میں کرنل حنیف کے حوالے کر دیے گئے۔ یہاں بھی تینوں کو الگ الگ اور پختہ سیلوں میں بند کیا گیا جہاں پاخانے کے لیے فلش، ایک پانی کی ٹونٹی، ایک پلاسٹک کے ڈبے کا انتظام تھا۔ کام کے نام پر دن بھر یہ لوگ زیادہ سے زیادہ اپنا تیل یا صابن ادھر ادھر کر سکتے تھے۔ خود کو چست درست رکھنے کے لیے اکثر و بیشتر اکسرسائز کر لیا کرنا اور دل کا درد ہلکا کرنے کے لیے کچھ درد بھرے گانے گنگنا لینا ہی ان کا کام رہ گیا تھا۔ اس سب کے بعد بھی اگر وقت بچا رہتا تو یہ لوگ مچھر اور کھیاں مارا کرتے تھے۔ بیرک میں ان کے دوسرے ساتھی بھی اسی طرح وقت کاٹنے پر مجبور تھے۔

باب اٹھارہ

پاپ کی کمائی

کرنل حنیف ادھیڑ عمر کے ایک پرانے افسر تھے۔ سنجیدہ، مہذب، شیریں زبان اور معاملہ فہم۔ اس انتہائی محفوظ جیل کے کمانڈنٹ کے طور پر انھوں نے یہاں کا ڈسپلن اپنے ماتحتوں پر چھوڑ رکھا تھا۔ حالت یہ تھی کہ وہ ہندوستانی قیدیوں سے خندہ پیشانی سے ملتے اور صرف ان سے باتیں ہی نہیں بلکہ ان کے خاندان کی خیریت بھی دریافت کرتے۔ کبھی کبھی وہ ہندوستان پاکستان کی فوجوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور ذاتوں و برادریوں کے بارے میں بھی طرح طرح کے سوالات کیا کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ ہندوستانی قیدیوں کے دماغ میں گہرائی تک اتر کر ان کا نفسیاتی مطالعہ کر رہے ہوں۔ سارے قیدی روز صبح گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان احاطے کے صدر دروازے کی آہٹوں پر کان لگائے رہتے تھے۔ کیوں کہ زیادہ تر کرنل حنیف اسی وقت تشریف لاتے تھے۔

شروع شروع میں ایک صوبے دار میجر اور دو اسٹین گن بردار سپاہی کرنل صاحب کے ساتھ آتے تھے۔ دھیرے دھیرے انھوں نے اپنے ساتھ مسلح فوجی لانا بند کر دیے۔ اب صرف ایک نہتا جے۔ سی۔ او۔ ہی ان کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی کبھی سویلین کپڑوں میں کچھ اجنبی بھی ان کے ساتھ چلے آتے تھے۔ یہ جان پانا مشکل تھا کہ یہ لوگ زندگی کے کن شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انٹیلی

جنیس، ماہرینِ افواج یا کوئی اور۔ لیکن اتنا ضرور واضح تھا کہ یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ، ہوشیار اور دونوں ممالک کے سماجی اور سیاسی معاملات وحالات سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو بھی زیادہ تر جمہوریت وعامریت، ہندو مسلم، حیدرآباد، جوناگڈھ، کشمیر اور بنگلہ دیش جیسے مسائل پر مرکوز رہتی تھی۔

ایک دن جب احاطے کا بڑا آہنی دروازہ کھلا تو وکرم کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ حنیف صاحب کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی اندر چلی آرہی تھی۔ ایک تو عورت دوسرے نوجوان تیسرے جنگی قیدیوں کے بیچ۔ یہ اپنے قسم کا عجیب سانحہ تھا۔ ویسے بھی جہاں صرف مرد رہتے ہوں، وہاں عورتوں کا آنا جانا ممنوع ہوتا ہے۔ وکرم سوچنے لگا کہ آخر کرنل صاحب کو کیا ہوگیا ہے؟ کیا ان کے لیے بہت سے قواعد اور قوانین کی پابندی ضروری نہیں ہے؟

وکرم کو یکا یک احساس ہوا کہ اس کا جسم صرف ایک تولیے میں لپٹا ہوا ہے۔ دراصل اس کے پاس صرف ایک ہی پینٹ تھی جو اس نے آج ہی صبح دھل کر دھوپ میں ڈالی تھی۔ کچھ دیر تک جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو اس نے جھٹ سے نیم خشک پینٹ الگنی سے اٹھائی اور سٹ سے اپنی سیل میں چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ گیلی پینٹ کے ساتھ سوکھی شرٹ میں دونوں کے سامنے تھا۔

''ار......ار......ارے......ارے۔ مجھے اس وقت نہیں آنا چاہیے تھا،'' حنیف صاحب بولے۔

''کوئی بات نہیں۔ اب تو تقریباً سبھی ٹھیک ٹھاک کپڑوں میں ہیں،'' وکرم نے صفائی پیش کی۔

''مگر تمھارے جسم پر یہ گیلے کپڑے؟'' انھوں نے کہا۔

''کوئی ضروری نہیں کہ آپ کے آئندہ کبھی آنے پر سب ٹھیک ہی رہے۔ اس لیے آپ تشریف رکھیں،'' وکرم نے حنیف صاحب کو مطمئن کیا۔

اپنے مخصوص انداز میں کرنل صاحب نے مہمان کو وکرم سے متعارف نہیں کرایا، بلکہ سیدھے سیدھے ادھر ادھر گفتگو شروع کردی۔ کچھ موسم کی، کچھ کتابوں کی اور کچھ خانہ داری کی۔ ادھر گفتگو نے ابھی کوئی سمت بھی نہیں اختیار کی تھی، ادھر ہندوستانی افسروں کو جانے کیسے

محسوس ہو گیا کہ جیل میں کوئی نوجوان لڑکی آ پہنچی ہے۔ ہو سکتا ہے جانوروں کی طرح ان لوگوں نے بھی کسی خاص قسم کی بو محسوس کر لی ہو۔ بہر حال سب کے سب فوراً ہی آ پہنچے اور اس دوشیزہ سے کسی نہ کسی بہانے بات چیت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کسی کی نگاہ اس کے چہرے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وہ سب کی باتوں کا جواب زیادہ تر "ہاں" یا "نہ" میں ہی دے رہی تھی، وہ بھی شرماتے ہوئے یا آنکھیں نیچی کیے ہوئے۔ ہاں اس کی انگلیاں ضرور بار بار کھلتی اور بند ہوتی رہتی تھیں، شاید اپنی اندرونی کیفیت کو سب پر ظاہر نہ کرنے کی فکر میں وہ ایسا کر رہی تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے رخساروں پر ایک طرح کا گلابی پن بار بار آ جا رہا تھا۔

وکرم بھی اس کی آواز سننے کے لیے بے تاب تھا، اس لیے حنیف صاحب کو مخاطب کرتا ہوا بولا، "کرنل صاحب! میں نے سنا ہے کہ آپ کے پنجاب میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس نے کم سے کم ایک جوان اپنے ملک کی خدمت کے لیے فوج میں نہ بھیجا ہو۔" اتنا کہتے کہتے وکرم نے اس دوشیزہ کی طرف مڑ کر سیدھے اسی سے دریافت کرتے ہوئے کہا، "بتائیے محترمہ! آپ کے گھر میں کون کون فوج میں ہے؟"

وکرم جو کسی جواب کے انتظار میں تھا وہ تو ملا نہیں مگر اس نے دیکھا کہ لڑکی کی گود میں رکھے ہوئے ہاتھوں کی انگلیاں مٹھیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ گھنی و بوجھل پلکیں اوپر کو اٹھیں اور جیسے ہی نگاہ وکرم کی آنکھوں سے ٹکرائی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ ایک ہلکی سی سسکی گلے سے نکلی اور اس نے اپنے دوپٹے کو پلّو بنا کر چہرے پر کھینچ دیا۔ کچھ دیر مزید سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔ وکرم تو جیسے سکتے میں آ گیا لیکن دھیرے دھیرے غموں کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ آنکھیں دوپٹے کے کونے سے صاف کی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے چہرہ دکھ اور لاچاری کی مورت بن گیا۔ وکرم کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ درد و غم کی مجسم تصویر بنا خود کو کچھ بھی نہ کر پانے کی حالت میں پا کر وہ کرنل حنیف کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس بے چاری کا اکلوتا بھائی ابھی حال کی جنگ میں شہید ہو گیا۔" حنیف صاحب گویا ہوئے۔

وکرم پہلے سے ہی اس کے دکھ سے بری طرح دکھی تھا۔ اب حنیف صاحب کی اس اطلاع

نے اسے اور بھی مضمحل کر دیا۔ ہوسکتا ہے زندگی میں دوبارہ اس لڑکی سے ملاقات بھی نہ ہو لیکن اس وقت اس کا غم بانٹنا اور اس کے ذہن و دل پر لدا ہوا بوجھ کچھ کم کرنا وکرم اپنا فرض سمجھ رہا تھا۔

''اگر میں کہوں کہ مجھے یہ جان کر تکلیف ہوئی تو کافی نہیں ہوگا'' وکرم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' فی الحال میں پرارتھنا کر سکتا ہوں کہ بھگوان آپ اور آپ کے گھر خاندان کو یہ غم برداشت کرنے کی ہمت دے۔ ہم فوجیوں کے گھر والوں کی یہی بدنصیبی ہے۔ بہنیں اپنے بھائی کھو دیتی ہیں، بیوی اپنا سہاگ، ماں باپ اپنے بچے اور بچے اپنے باپ۔ مگر کیا کیا جائے؟ کیا کہا جائے؟ خیر یہ بتایئے کہ آپ کے بھائی بری فوج میں تھے یا کہ ایئر فورس میں؟''

''فوج میں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

اتنی دیر میں اس کے ہونٹوں سے چھوٹا یہ پہلا لفظ تھا۔ وکرم کم سے کم اس کی تکلیفوں کے دروازے کھلوانے میں دھیرے دھیرے کامیاب ہو رہا تھا۔

''میرے بھائی ہندوستان کے فیروز پور علاقے میں تھے۔ ایک روز وہ فرنٹ پر اپنے میجر سے ملاقات کر کے جیپ سے اپنی پوسٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جیپ میں ان کے تین ساتھی اور تھے۔ اسی وقت ایک ہندوستانی جہاز اوپر آ گیا۔'' الفاظ کی جھڑی لگ چکی تھی، جو کچھ اس نے اپنے بھائی کے ساتھیوں سے سن رکھا تھا، ایک داستان کی شکل میں زبان پر آتا چلا گیا۔ ایک باہمت نوجوان کی زندگی کے آخری پل، دشمن کا جہاز اپنے سر پر دیکھ کر چھپنے کا محفوظ طریقہ اختیار کرنا یا پوسٹ پر پہنچ کر فائرنگ کا بندوبست کرنا، آخر میں اپنی حفاظت پر فرض کا حاوی ہونا اور ایک دھماکے میں زندگی قربان کر دینا۔

فیروز پور کے علاقے میں ستلج ندی کے اس پار چار چھ کلومیٹر زمین ہندوستان کی ہے۔ وہاں ہمیشہ فوج تعینات رہتی ہے۔ لیکن دورانِ جنگ زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو اپنی تحویل میں رکھنا خاصہ مشکل ہوتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان بھی اس زمین کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ اس علاقے کو بیس بنا کر ہندوستانی فوج ان کے علاقے میں نہ گھس سکے۔ اس بار پاکستانی حملہ کافی شدید تھا۔ اس حملے میں بہت سے ٹینک بھی شریک تھے۔ تقریباً آٹھ سو ہندوستانی فوجی

اس علاقے میں پھنسے ہوئے تھے۔ سامنے دشمن اور پیچھے دریائے ستلج۔ ایسے میں ایئر فورس کو احکامات جاری کیے گئے کہ کسی طرح دشمن کو روکا جائے جس سے ہندوستانی فوجی دریا پار کر سکیں۔ ہندوستانی ایئر فورس کے جہاز اوپر سے لگاتار فائرنگ کر رہے تھے تاکہ پاکستانی فوج آسانی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ دو جہاز جاتے تھے اور پلک جھپکتے ہی دوسرے دو جہاز آ جاتے تھے۔ اس طرح ان چار جہازوں کی سرپرستی میں ہندوستانی فوجی آرام سے پیچھے کی طرف آ کر ندی پار کرنے میں مصروف تھے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر وکرم بھی دو جہاز لے کر وہاں پہنچا۔ عموماً ہوتا یہ تھا کہ جہاز آتے ہی دشمن بغیر کوئی حرکت کیے ہوئے کہیں چھپ کر بیٹھ جاتے تھے، حد ہے کہ ایسے وقت میں دشمنوں کے ٹینک بھی کہیں جنگلوں یا جھاڑیوں میں چھپے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ریڈیو پر ایئر کنٹرولر ایک بامب لائن بتاتا تھا جس سے یہ علم ہوتا تھا کہ کن پیڑوں کے جھنڈ، کس ندی نالے یا سڑک کے دوسری طرف دشمن ہیں۔ اگر دشمن نہ دکھائی پڑتے تب بھی علاقائی فائرنگ کر دی جاتی تھی تاکہ دشمن زخمی نہ بھی ہوں تو بھی کم سے کم سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔ وکرم کچھ ایسے ہی حملوں کی تیاری میں تھا کہ بامب لائن کے دوسری طرف چار لوگوں سے لدی دشمن فوج کی ایک جیپ کھلے میدان میں دوڑتی ہوئی دکھائی دی۔ شاید کوئی بڑا افسر تھا۔ وکرم نے اپنی جہاز گھما کر نشانہ ٹھیک کیا، صحیح اونچائی اور صحیح زاویے پر بٹن دبایا، دو راکٹ نکل کر سائیں سے نکلے، وکرم نے پل بھر بعد ہی ڈائیو سے نکل کر جائزہ لیا تو جیپ والی جگہ پر جیپ کا تو نام ونشان نہیں تھا ہاں مختصر سی آگ اور کچھ دھواں ضرور دکھائی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں اس نے بقیہ ضروری کام نپٹائے اور واپس اپنی بیس پر چلا آیا جہاں اسے اطلاع ملی کہ تقریباً سات سو ہندوستانی فوجی بخیر وعافیت دریا پار کر چکے باقی یا تو شہید ہو گئے یا دشمن کی گرفت میں آ گئے۔

—

اور اب وکرم کسی مجرم کی طرح اس لڑکی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں عجیب عجیب سے طوفان اٹھ رہے تھے۔ ایسے اُلٹے سیدھے سوالات اس کے ذہن و دل کو اپنی آماجگاہ

بنائے ہوئے تھے، جن کے جواب کم سے کم اس وقت وکرم کے بس میں نہیں تھے۔ دشمن؟ کون دشمن؟ کیا دشمن؟ کیا میں اس جانباز کو جانتا تھا؟ کبھی اس سے ملاقات بھی تو نہیں ہوئی تھی۔ کسی بحث وتکرار یا کہاسنی کا کوئی اندیشہ بھی تو نہیں تھا؟ یا اس نے مجھے کسی طرح کی چوٹ پہنچائی تھی؟

کچھ ایسی ہی عجیب سی دماغی اتھل پتھل کے شکار وکرم کا ضبط نفس یکا یک ٹوٹا اور وہ بول پڑا،

''محترمہ! کیا آپ میری دشمن ہیں؟ یا میں آپ کا؟''

سبھی مڑ مڑ کر وکرم کی طرف دیکھنے لگے۔ کچھ لوگ تو اس کے اس جملے کی روح تک پہنچ گئے کچھ لوگوں کے سر سے گذر گیا۔

اپنی گہری آنکھوں میں آنسو بھرے وہ لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے پلو کے اندر سے چھوٹا سا مٹھائی کا ڈبہ نکال کر وکرم کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ صرف اتنا کہہ سکی، ''میں یہی لائی تھی، قبول کرلیں۔''

اس لڑکی نے دشمن فوج کے ایک جنگی قیدی کے ساتھ بھی کیا رسم نباہی تھی۔ عموماً اسپتال یا جیل وغیرہ میں کسی سے ملاقات کرنے کی غرض سے خالی ہاتھ نہیں جایا جاتا۔ ایک معمولی سی لڑکی جس کے گھر والوں کی ساری امیدیں اور تمنائیں ایک عدد بیٹے پر ہی مرکوز تھیں، آج ایک دم سے بے سہارا ہو چکی تھی۔ حنیف صاحب کے چہرے سے پوری طرح ظاہر تھا کہ وہ وکرم کی حالت بخوبی سمجھ رہے ہیں۔ وکرم نے اپنا سر آسمان کی طرف کیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا، ''بھگوان، یہ لڑکی کچھ بھی نہ سمجھ پائے۔''

حنیف صاحب اس دکھیاری کو ساتھ لے کر احاطے سے باہر چلے گئے۔ پھاٹک بند ہو گیا لیکن وکرم کی آنکھیں اسی طرف ٹک کے رہ گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ملند نے کھانس کر اس کا دھیان توڑا لیکن وکرم بمشکل تمام مٹھائی کا ڈبہ اس کی طرف بڑھا دینے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا اور نہ ہی کچھ بول سکا۔

''پاپ کی کمائی سر؟'' ڈبہ پکڑتے ہوئے ملند نے سنجیدگی سے کہا۔

ایک ایئر پائلٹ بلندیوں پہ اڑتے جہاز میں صرف ''الکٹرانک ڈسپلے'' دیکھ کر ہی نشانہ لگاتا ہے اور ایک بٹن دبا دیتا ہے۔ وہ نہ تو اپنے جہاز سے نکلتے راکٹ اور گولیوں کی رفتار محسوس کرتا ہے

اور نہ ہی دھماکوں کی آواز..... اور نہ ہی فضا میں بارود کی بو۔ وہ موت سے پہلے دشمن کے چہرے کا خوف، اس کی جسمانی تکلیف اور لاچاری کے آخری لمحات بھی نہیں دیکھتا۔ اس کے نزدیک جنگ صرف مادّی چیزوں تک ہی محدود رہتی ہے۔ ٹینک، توپ، جہاز وغیرہ۔ اس کو دشمن کے وجود، اس کے جسم یا اس کے چہرے سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ اگر وہ خود بھی مر جائے تو اسے یہ نہیں معلوم ہوگا کہ اسے کس نے یہ سزا دی ہے۔ وکرم دو جنگوں و بے شمار حملوں میں ہزارہا گولیوں، راکٹوں اور بموں کا استعمال کرنے کے بعد آج پہلی بار دشمن کے ساتھ ساتھ موجود انسانیت سے روبرو ہوا تھا۔ وہ اس لڑکی اور اس کا وہ معصوم چہرہ کبھی بھی بھلا نہیں سکے گا۔ جب بھی کہیں جنگ کا تذکرہ ہوگا، وہ کہیں سے یکایک نازل ہوگی اور وکرم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے گی، "کیا میں آپ کی دشمن ہوں؟"

کچھ دیر بعد جب حواس درست ہوئے تو وکرم نے ملند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "پتہ نہیں ان مسائل کا کوئی حل بھی ہے یا نہیں ہے کہ دشمن کون ہے؟ اور دوست کون ہے؟ یہ لڑکی بھی شاید ہم سے مل کر یہی جاننے آئی تھی کہ اس کے بھائی کو شہید کرنے والے صرف بے رحم اور سنگِ دل ہی ہیں یا ان میں انسانی جذبات کا کوئی "عنصر" بھی دکھائی دیتا ہے؟ ہماری ملاقات کے بعد شاید وہ بھی ہماری ہی طرح پریشان اور تکلیف زدہ ہونے کے ساتھ ہی وقت وقت پر پھوٹتے نفرت اور تشدد کے آتش فشاں کو سمجھنے کی ناکام سی کوشش کر رہی ہو۔"

"مگر آپ تو اکثر و بیشتر کہتے رہتے ہیں کہ کیا، کیوں اور کیسے جیسے الفاظ ہم فوجیوں کی لغت میں ہیں ہی نہیں۔ ہماری آنکھوں پر صرف اور صرف فرائض کا چشمہ ہونا چاہیے جس کے ذریعے صرف ہمارا مقصد اور نصب العین دکھائی دے۔"

—

باب انیس

عائشہ

اپریل کا مہینہ تھا۔ ایک روز سورج جیسے ہی سر پر پہنچا اور دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا، کمرہ نمبر 5 میں بیٹھے قیدی احاطے کے مین گیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔ دراصل انھیں بے صبری سے انتظار تھا ایک کار کا جو کسی بھی لمحہ آکر سامنے دفتر کے باہر رکے گی۔ انھیں امید ہی نہیں بلکہ پورا یقین تھا کہ نصیرالدین اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے۔

اب اس کیمپ کے انچارج نصیرالدین ہی تھے۔ نصیرالدین ظاہری طور پر بڑے ہی سخت اور جلد باز قسم کے انسان تھے، لیکن قیدیوں کی سہولت کے لیے ان سے جو بھی بن پڑتا ضرور کرتے۔ ہاں کھانے کے سلسلے میں وہ کچھ بھی کر پانے سے قاصر تھے۔ شروعات کے دنوں میں اس بات کا تذکرہ بڑے ہی زوروں پر ہوتا رہتا تھا کہ ہندوستان میں قید پاکستانی جنگی قیدیوں کو آدھے راشن پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے پاکستان کے بڑے دفاتر میں بیٹھے کچھ کوتاہ نظر افسران نے یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ پاکستان میں قید ہندوستانی قیدیوں کے راشن کی مقدار بھی کم کر دی جائے۔ کم راشن میں مہینوں گذر جانے کے بعد جب یکا یک کھانے کی مقدار اور کوالٹی دونوں ہی اطمینان بخش ہوگئی تو گیری نے پاکستانیوں پر طنز کرتے ہوئے کہا، ''واہ صاحب! آپ کے قیدی ہندوستان میں بھر پیٹ کھانا پا رہے ہیں یا نہیں یہ پتہ لگانے میں آپ کو چھ مہینے لگ گئے۔ آپ نے تو حد ہی کر دی۔''

"دیکھیے یہ سیاسی معاملات ہیں۔ اس میں ذاتی طور پر آپ ہمیں قصوروار نہ سمجھیے،" ایک افسر نے کہا۔

اس دوران کیمپ کے خدمت گذار اورنگ زیب کی مہربانی بنقوی کے تعاون اور نصیر کی چشم پوشیوں کی وجہ سے کھانے کے شوقین قیدیوں کو روز کے کھانے کے علاوہ کباب اور بھرنی وغیرہ بھی میسر ہونے لگی۔ یہ الگ بات کہ ان قیدیوں کے الاؤنس کی زیادہ تر رقم ایسے ہی اخراجات کی نذر ہوجایا کرتی تھی۔ اور اچھا کھانے کی لالچ دن بہ دن نئے ذائقے تلاش کرنے میں محور ہنے لگی۔ پاکستانیوں سے گفتگو کا سب سے خاص موضوع کھانا ہی ہوا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک روز نصیر نے سعودی عرب کی ایک مزےدار دعوت کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ جس میں دستر خوان پر کھانے کے لیے اونٹ کا جو بچہ پیش کیا گیا تھا اس میں پہلے ایک چھوٹی بھیڑ پر بٹیر سے جنگلی چڑیا، چڑیا سے مرغ، مرغ سے بٹیر اور آخر میں بٹیر سے انڈے برآمد ہوئے۔ دراصل یہ سب ایک دوسرے کے اندر رکھ کر سلیقے سے بھنے گئے تھے۔ ساتھ میں طرح طرح کی چپاتیاں اور پلاؤ کی کئی قسمیں بھی تھیں جن سے سارے کے سارے عرب کی خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔

"ارے ارے جناب خاموش بھی رہیے،" گیری نے احتجاج کیا۔ "ہم سے ایسی گفتگو سہی نہ جائے گی۔ کہاں تو ہم آدھے پیٹ کھانے پر گذارا کرنے والے لوگ اور آپ ہیں کہ اس قدر خوبصورت دعوتوں کے تذکرے سنا کر ہمارے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ یا تو کچھ اچھا کھانا دانا کھلوایئے اور نہیں کھلوا سکتے تو کم سے کم اچھے کھانے کی گفتگو سے پرہیز ہی کیجیے۔"

"ہاں ہاں یہ تو ہے،" ہیری نے کہا۔ "آپ یہاں ہمارے پاس ہیں اور آپ کو اپنے چارج میں رہ رہے افسروں کا خیال تو رکھنا ہی چاہیے۔ اب آپ گھر جا کر اپنی بیگم صاحبہ سے کہیے کہ ایک مخلص کمانڈر کی بیگم کی حیثیت سے انھیں کبھی کبھار ہمیں کھانے وانے کے لیے تو پوچھ ہی لینا چاہیے۔"

پنجاب کی روایتی دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نصیر نے کہا، "بہت اچھا۔ چلیے ایک دعوت میرے نام رہی۔ پنڈی میں ایک ہوٹل کے کباب اور روٹیاں بہت مشہور ہیں، قورمہ اور چاول کی بھی کچھ اسپیشل دوکانیں ہیں۔ تندوری مرغ تو آپ لوگوں کو پسند ہی ہوگا وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟" گیری کے منہ میں پانی آنے لگا۔

"آپ کی اس فراخدلی کا بہت بہت شکریہ نصیر صاحب لیکن ہمیں ایسی دعوت منظور نہیں۔"

ملند کے اتنا کہتے ہی سارے لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے کہ بلاوجہ یہ سارا بنا بنایا کھیل خراب کر رہا ہے۔ مگر ملند کے دل میں تو کچھ اور ہی تھا۔

"محترم، ہمیں تو گھر کا کھانا چاہیے چاہے کوئی ایک ہی ڈش کیوں نہ ہو لیکن گھر کی ہونی چاہیے۔" سب نے بیک آواز ملند کے اس خیال کی تائید کی۔

"اچھا اچھا بھائی ٹھیک ہے،" نصیر بھی ہنستے ہوئے بولے۔ "اس اتوار کو کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔"

اتنے خوبصورت ماحول میں سارے لوگ ایسا شیر و شکر ہو کر رہ رہے تھے کہ کوئی باہری آدمی دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ساتھ ساتھ رہنے سہنے اور ہنسنے بولنے والے یہ لوگ آپس میں دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔ حقیقت ہے کہ جب تک کوئی پنڈت، مولوی یا سیاسی بازیگر بیچ میں نہ آجائے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے درمیان یا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ماحول خوشگوار ہی رہتا ہے۔

آنے والا اتوار نصیر صاحب کو بخوبی یاد رہا۔ دوپہر ٹھیک ایک بجے ایک کار کیمپ میں داخل ہوئی اور سامنے والی بیرک کے سامنے رک گئی۔ مگر یہ کیا......؟ اس میں تو خاصے لوگ سوار تھے۔ خواتین اور بچے بھی، شاید نصیر صاحب کھانا پہنچا کر گھر والوں کے ساتھ کہیں باہر جانے والے ہوں۔

"ار......رے......یہ تو دیگچیاں نکل رہی ہیں،" گیری ذائقے دار کھانوں کا انتظام ختم ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

"دیکھو تو کچھ خواتین اور بچے بھی گاڑی سے باہر آرہے ہیں،" منوہر نے دوسرا نعرہ بلند کیا۔ "واہ واہ یہ تو سب ہماری ہی طرف آرہے ہیں۔ پری نے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا۔

"خواتین کا استقبال کس طرح کیا جائے گا؟" ہیری نے آپس میں مشورہ کیا، "گڈ آفٹر نون کہہ کر یا آداب پیش کر کے۔"

"کیا خوبصورت بچے ہیں۔" بچوں کو قیدیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر برٹی فریفتہ ہوتے ہوئے بولے۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ برٹی نکل کر باہر کھڑا ہو گیا، دوسرے افسر بھی ساتھ آ گئے۔ بچے ہندوستانی قیدیوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظریں ایک ایک چہرے پر جا کر ٹک جاتیں، جیسے انھیں معلوم تھا کہ وہ کچھ الگ قسم کے لوگوں کو دیکھنے آئے ہیں یعنی ہندوستانی قیدیوں کو۔ اسی لیے بچوں کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کا تجسس تھا۔ انھوں نے اپنے ذہن میں جنگی قیدیوں کی جانے کیسی تصویر بنا رکھی تھی کہ یہاں خوشی سے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر انھیں تعجب ہو رہا تھا۔

برٹی نے ذرا جھک کر ایک بچے کے بال سہلائے اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ منوہر نے دوسرے کے گال پر تھپکی دی۔ ملند نے آگے بڑھ کر ایک کو گود میں اٹھا لیا۔ گیری نے کسی کو گود میں اٹھا کر دلارنا شروع کر دیا۔ اس طرح بچوں کو چھونا، چمٹانا، سہلانا پیار کرنا اور ہاتھوں ہاتھ لینا یہاں تک کہ ایک دوسرے سے چھیننا جھپٹنا کیا خوشگوار منظر تھا۔ لگ رہا تھا جیسے جیل کسی خوبصورت پکنک اسپاٹ میں تبدیل ہو گیا ہو۔ بچے انسانی شفقتوں سے اس قدر شرابور ہو گئے کہ نہ تو وہ کسی سے ڈرے نہ سہمے اور نہ ہی کسی قیدی کو دیکھ کر اپنے والدین کی طرف ہی بھاگے۔ محبتوں بھرا یہ ماحول سبھی کو خوب راس آ رہا تھا اور کیوں نہ راس آئے، چاہتوں اور شفقتوں کی زبان اتنی فطری اور عالمگیر ہوتی ہے کہ جیسے بھی لوگ ہوں، سبھی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ ذرا سی دیر میں ہی اس ماحول نے سب کو ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ کسی کو یاد ہی نہیں رہا کہ سب سے پہلے نم ہونے والی آنکھیں کس کی تھیں۔ کون سب سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی موجودگی نے سب سے پہلے کس کے دبے کچلے احساسات کو جھنجھورا۔ کس نے سب سے پہلے گھر اور ذاتی رشتوں سے دور رہنے کا درد ظاہر کیا؟

دو خواتین قیدیوں کی طرف آ رہی تھیں، نصیران کے پیچھے تھے۔ بجی سنوری، دیدہ زیب لباسوں میں اپنی خوب روئی سے پوری طرح مطمئن، دور سے ہی اپنے بچوں کو ہندوستانیوں کی گود میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ جلدی جلدی چلنے لگیں اس لیے نہیں کہ انھیں کسی طرح کا شک تھا بلکہ اس لیے کہ یہ انوکھا منظر یہ پیار کا اُمڈتا ہوا ساگر انھیں مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ قریب آ کر جب انھوں نے ہندوستانیوں کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو دیکھے تو ٹھٹھک کر رہ گئیں۔

نم آنکھوں کے ساتھ بچوں کو سینے سے لگائے سامنے کھڑے ہندوستانی قیدیوں کے تئیں ان کے دلوں میں ایک عجیب سارحم کا جذبہ امڈ پڑا۔ گھر سے دور قید کے اس اکیلے پن اور لاچاری کے درد کا احساس ہونے لگا۔ جو صرف ایک ماں یا بیوی ہی محسوس کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خواتین بھی خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور ان کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے چشمے جاری ہوگئے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے کچھ قریبی عزیز اس وقت ہندوستان میں قید ہوں اور جیل میں ہندوستانی جنگی قیدیوں کو دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہوگئی ہو۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو ان کے آنسو ایسے بھی لوگوں کے تئیں رنج والم کی علامت تھے۔ ویسے بھی زمانے سے ناامید، ستائے الگ تھلک پڑے زور زبردستی کے شکار دکھی لوگ بغیر کچھ بتائے ایک دوسرے کا درد سمجھ لیتے ہیں اور آپسی ہمدردیوں میں بندھ جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس محفل میں لفظوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس وقت تو بے زبانی ہی زبان ہو رہی تھی، خاموشیاں ہی گفتگو کر رہی تھیں۔ وقت کی بے پناہ اذیتوں نے ایسے دشمنوں کو ایک ساتھ لاکر اکٹھا کر دیا جو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے دور رہ کر زندگی گذارنے کا عہد کر چکے ہیں۔

ہیری نہ ہی ''گڈ آفٹرنون'' کہہ پایا اور نہ ہی منوہر آداب۔ ایک میٹھے احساس کی بندش میں سبھی بندھ چکے تھے۔ رفتہ رفتہ آنسو تھمے۔ خواتین نے اپنی پلکیں صاف کیں۔ پھڑکتے نتھنے، کانپتے ہونٹ نارمل ہوئے۔ خوبصورت چہرے منور ہونے لگے اور ان پر فریفتہ کرنے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی، جو آگے بڑھ کر ہنسی اور قہقہوں میں تبدیل ہوگئی، لگ رہا تھا جیسے ماحول میں گھنگھرو بج رہے ہوں۔ ہندوستانی بھی مسرتوں میں ڈوبے مسکرا رہے تھے۔ یہاں تک کہ کیمی بھی اس جذباتیت سے خود کو اچھوتا نہیں رکھ سکے۔

''آپ لوگوں کے آنے سے ہمیں بے حد خوشی ہوئی کس طرح شکریہ ادا کریں؟'' ملند نے دھیرے سے کہا۔

''آپ نے ہمارا کرب محسوس کیا یہاں تک آنے کی زحمت اٹھائی۔ ہمارے پاس تو لفظ بھی نہیں ہیں کہ کچھ کہہ سکیں،'' منوہر بولے۔ ''اور تو اور ہمارے ساتھ رونے کے لیے.....'' منوہر کے اس ادھورے جملے نے سبھی کو قہقہہ لگانے پر مجبور ہی کر دیا۔

پری بھی خوش ہوئے۔ ان کے آبنوسی چہرے پر سفید دانت خوب کھل رہے تھے۔ انھوں

نے کہا، '' میڈم اتنے دنوں میں ہم تو بھول ہی گئے تھے گھر پریوار اور بچے کیا ہوتے ہیں اور دنیا میں ابھی کچھ نازک رشتے بھی باقی ہیں۔''

نصیر صاحب اپنی بیگم کے پیچھے حیرت زدہ سے کھڑے تھے۔ ان کے اندر کا فوجی اس جذباتیت سے نمٹ ہی نہیں پا رہا تھا۔ تھوڑا سا احساس درست ہوئے تو ایک خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا، '' ان سے ملیے یہ میری بیوی ہیں اور — یہ — ان کی بہن یعنی میری سالی صاحبہ اور ہمارے بچے۔''

برٹی نے بیگم نصیر اور نصیر صاحب کی سالی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ، '' آپ لوگ ہمارے نام نہ پوچھیں ویسے بھی یہ یاد نہ رہ جائیں گے۔ نصیر صاحب ہم لوگوں کا پہلے بھی بہت خیال رکھتے تھے لیکن آج آپ لوگوں کو یہاں لا کر انھوں نے ہم پر جو احسان کیا ہے، ہمیں جن مسرتوں سے لا دیا ہے واقعی ہم ان کے بے حد شکر گذار ہیں۔''

'' ہم آپ سب کے لیے کچھ کھانا لے کر آئے ہیں،'' بیگم نصیر نے پہلی بار اپنی آواز کی شیرینی فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔

'' ہم اور آپا صبح سے ہی اس پریشانی میں تھے کہ آپ لوگوں کے لیے کیا پکایا جائے اور اب ڈر لگ رہا ہے کہ کسی کو پسند بھی آئے گا یا نہیں،'' چھوٹی بہن جو شاید اب تک اپنی آپا کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی خوش مزاجی کے ساتھ بولی۔ اس کے رخسار صبح کے تازہ گلابوں کی یاد دلا رہے تھے۔ پلکیں خود اپنے بوجھ سے نیچے اوپر ہو رہی تھیں، آنکھیں جو بظاہر تو نیلی تھیں لیکن غور سے دیکھنے پر ہری بھی تھیں بھوری بھی..... اس کے علاوہ اور جانے کتنے رنگ محسوس ہوتے تھے۔

ہندوستانی افسر کچھ بول نہیں رہے تھے۔ آنکھیں تھیں کہ ان خوبصورت چہروں میں الجھ کر رہ گئیں۔ چہرہ چہرہ مسکراہٹیں سفر کر رہی تھیں سب کے دلوں میں اپنے مہمانوں کے تئیں شفقت اور اپنائیت بھری ہوئی تھی۔

'' اچھا تو اب ہمیں اجازت دیجیے،'' نصیر صاحب نے جاتے جاتے کہا۔ '' کھانا گرم کر کے جلد ہی آپ لوگوں کے لیے لگایا جا رہا ہے۔''

'' خدا کرے آپ جلد ہی اپنے عزیزوں اور رشتے داروں میں پہنچ جائیں،'' بیگم نصیر نے کہا۔

''ہم آپ کے لیے بالکل اسی طرح دعا کریں گے جس طرح ہندوستان میں قید پاکستانیوں کے لیے کرتے ہیں۔ خدا حافظ۔'' چھوٹی بہن نے بھی الوداعی جملہ کہا۔

ہندوستانی قیدی کھڑے کھڑے سب کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کی نظریں حدِ نگاہ سے لوٹنے کا نام لے رہی ہوں۔ ماحول میں پھر سے خاموشی پھیل گئی۔ پہلے تھی انتظار میں بے صبری کی خاموشی اور اب ہے ایک عجیب سی خالی پن کی خاموشی۔

کھانا لگتے ہی سارے لوگ بیٹھ گئے۔ ہر پکوان بڑی ہی محنت اور فنکاری سے بنایا گیا تھا۔ کھانا تو انگلیاں چاٹ چاٹ کر کھا لیا گیا، لیکن اس کی لذّت غائب ہو چکی تھی۔ کیوں کہ نصیر صاحب کے بال بچے یہاں سے جاتے جاتے جو خالی پن چھوڑ گئے تھے اس میں سبھی کے ذہن بری طرح الجھ کر رہ گئے تھے۔ گھریلو عورتوں کی قربت کھلونوں کی تصویر پیش کرتے ہوئے معصوم بچے، آپسی رشتوں کا مخلص احساس۔ ان سب سے ہندوستانی قیدیوں کے من میں ایک قسم کا بھوچال سا آ گیا تھا۔ اپنے گھربار کے بیچ ہونے کی شدید آرزو سب کو ہلا کر رکھ دے رہی تھی۔ اس وقت جسمانی طور پر بھلے ہی سب پاکستان کی جیل میں تھے لیکن روحانی طور پر سبھی یہاں سے بہت دور اپنی اپنی چاہتوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے، جہاں بچے تھے، بچوں کا شور تھا، ان کی شرارتیں تھیں، جہاں بزرگ تھے بزرگوں کی جھڑکیاں تھیں، ان کی شفقتیں تھیں، ان کی دعائیں تھیں۔ ان سب کے درمیان ایک ایسا رشتہ بھی تھا جس میں دنیا کے تمام رشتے آ کر سمٹ جاتے ہیں۔

نصیر صاحب کے اہل خاندان کی رونقیں ابھی بھی جیل کے ہر حصے پر طاری تھیں۔ ان کے بچوں کا بلا خوف اجنبیوں کی گود میں آنا اور ہنسنا کھیلنا، عورتوں کا قید میں پڑے ان لوگوں کے اکیلے پن اور اپنوں سے جدائی کو محسوس کرنا۔ ان کے ساتھ رونا پھر سنبھل کر مسکرا کر اپنی خوش اخلاقی اور شیریں زبانی سے سبھی کو فریفتہ کر لینا۔ یہ سب کچھ ہندوستانیوں کے دلوں پر ایسا عکس چھوڑ گئے جو کبھی دھندلا ہی نہیں سکتے۔ مگر جس طرح بچپن اور جوانی کے بہت سے لمحات صرف یادگار بن کر رہ جاتے ہیں انھیں کبھی بھی مستقبل میں دوبارہ جیا نہیں جا سکتا، جس طرح گذرے وقت کے خوشگوار ٹھکانوں پر بچھڑے ہوئے لوگ دوبارہ نہیں ملتے، اسی طرح آج کی ملاقات کے لمحے بھی گذر چکے ہیں ایک اچھی خوشبو کی طرح، دریا کے بہتے ہوئے پانی کی طرح، یا کسی پرنور احساس کی طرح۔ ان

لمحات کو دوبارہ حاصل کر پانا ناممکن ہی تھا کیوں کہ اس طرح کی کوششیں ہمیشہ ناکام ہی رہتی ہیں۔ کسی سے بچھڑنے کا رنج اور ان سے دوبارہ نہ مل پانے کا غم صرف سینے میں چھپا کر ہی رکھا جا سکتا ہے کیوں کہ ایسے غم ایسے درد وقت وقت پر دل و دماغ کو ترو تازہ کرتے رہتے ہیں۔

گرمی کا موسم آچکا تھا۔ ایک روز دوپہر کے وقت سارے قیدی بے جان سے بیٹھے وقت گذاری کر رہے تھے کہ چوکیدار کوئی خبر لے کر حاضر ہوا۔

''میک صاحب ہمارے ایک افسر ہیں جو اس وقت وکرم سے ملنے آرہے ہیں،'' وہ پنجابی میں بولا۔ وکرم نے سلاخوں سے دیکھا۔ ایک پولس کارپورل کے ساتھ کوئی اجنبی اس کی طرف آرہا تھا۔ قریب آنے پر وکرم نے اسے پہچانا۔

''ما...نک،'' وکرم زور سے چیخا۔ ''مائی گاڈ، تم نے تو چونکا دیا۔ بس یوں سمجھ لو کہ دل خوش ہو گیا۔''

دروازہ کھولا گیا۔ مانک اندر آئے، وکرم سے ہاتھ ملایا۔ گلے ملے۔ بقیہ لوگوں سے تعارف ہوا۔ وکرم کی امنگ دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی مانک کا پر جوش خیر مقدم کیا۔

''انا بھی آئی ہے۔ بس پہنچنے ہی والی ہے۔'' مانک نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یار تم اور انا.....'' وکرم فرطِ مسرت سے جھومتا ہوا بولا۔ ''اتنے زمانے کے بعد.....میں تو تمھارے ملنے کی امید ہی کھو چکا تھا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ تم ہندوستان میں کہیں قید تو نہیں ہو۔''

''نہیں یار میری ایسی قسمت کہاں؟'' مانک ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے ملک میں زندہ بخیریت رہ کر اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ آج کل یہیں قیام پذیر ہیں لیکن میں یہاں سے کافی دور تعینات ہوں۔ بس انتظار کر رہا تھا کہ کسی طرح پنڈی آنے کا موقع ہاتھ لگے اور آپ تک پہنچوں۔''

تھوڑی دیر میں انا بھی آ گئیں۔ اونچے قد اور بھرے جسم کی پٹھان عیسائی لڑکی۔ ہاتھ میں ایک بڑی پٹاری لیے ہوئے جس سے طرح طرح کے پکوان جھانک رہے تھے۔ اچار اور جیل کی شیشیاں، بسکٹ کے پیکٹ، میوے چاکلیٹ اور دنیا بھر کی ایسی ہلکی پھلکی چیزیں جن سے پیٹ تو نہیں بھرتا لیکن روح کو بڑی تسکین مل جاتی ہے۔

''السلام علیکم۔'' اِنا نے سبھی کو دیکھتے ہوئے کہا—اور جوابی خیر مقدم کے لیے سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہمارے ''محل'' میں آپ کا استقبال ہے انا۔ ہمارا مطلب ہے ہماری سیل میں،'' وکرم کہتے ہوئے آگے بڑھا اور انا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے کرسی پر بٹھایا۔

''تم نے تو کمال کر دیا انا،'' وکرم پھر بولا۔ ''اگر تم سے ملے بغیر میں ہندوستان لوٹ گیا ہوتا تو میرا تو اتنی دور آنا ہی بے کار ہو جاتا۔ اب بتاؤ کیا لینا پسند کرو گی؟ ٹھنڈا یا گرم؟''

''واہ کیا بات ہے..... '' انا بھی وکرم کے ہی انداز میں بولی۔ وکی اور تہذیب شاید ایک ہی شے کے دو نام ہیں..... یہاں جیل میں بھی کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہے معاشرے کی اخلاقیات کو برقرار رکھتے ہوئے انا پھر بولی، ''نہیں شکریہ، اس وقت میں کچھ نہیں لوں گی۔ بس آپ لوگوں کا ساتھ نصیب ہو گیا یہی کافی ہے۔''

حالانکہ یہ قیدی اسے پیش ہی کیا کر سکتے تھے لیکن اخلاقی بلندی جن لوگوں کی زندگی کا حصہ بن چکی ہوتی ہے وہ کہیں بھی رہیں اپنے عادات و اطوار سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔

مجھے پورا یقین ہے وکی صاحب کہ آپ صرف مجھ سے ملنے کی غرض سے ہی پاکستان تشریف لائے ہیں۔ انا ہنستے ہوئے بولتی رہی..... اب جلدی سے ''ہاں'' کہہ دیجیے تاکہ میں اپنے دوستوں کے سامنے فخریہ بیان کر سکوں۔

بغیر کسی لگی لپٹی کے سیدھی سیدھی بات کرنا انا کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، وہ سلام بھی بہت واضح اور اونچی آواز میں کرتی تھی۔ کبھی کبھی لگتا تھا جیسے اتنی طاقت سے سلام کر کے وہ اپنی کوئی شناخت پیش کرنا چاہتی ہو جب کہ یہ کہیں سے بھی اس کی اپنی فطرت کا حصہ کہیں سے نہیں لگتا تھا۔ ولایت میں بھی جہاں وکرم سب سے پہلے اس سے ملا تھا اور جہاں ''گڈ مارننگ'' اور ''گڈ ایوننگ'' ہی کسی کے خیر مقدم کے لیے رائج الفاظ ہیں، وہاں بھی انا کا دھماکہ دار ''السلام علیکم'' اس کے پاکستانی ہونے کا بہ بانگ دہل اعلان کرتا تھا۔ ولایت پہنچ کر موسموں کے مزاج اور سہولتوں کے لحاظ سے زیادہ تر خواتین مغربی لباس یعنی جینس شرٹ اور ٹاپ وغیرہ پہننا شروع کر دیتی ہیں لیکن انا تھی کہ اس نے شلوار قمیص کے علاوہ کبھی کچھ زیب تن نہیں کیا، اور تو اور انا کا سر بھی ہمیشہ دوپٹے سے ڈھکا رہا۔ وکرم کو ہمیشہ تعجب ہوتا تھا کہ پاکستان میں تہذیبی و اخلاقی قدروں کے علاوہ لباس کے سلسلے میں

کس طرح یکسانیت قائم کی گئی ہے اور یہ یقیناً قابلِ تعریف بھی ہے۔ دوسری طرف ہندوستان جہاں ہر کوئی اپنی ڈفلی اپنا راگ جیسے محاورے پر چل رہا ہے۔ ہندی یا اردو زبان بولے جانے والے صوبوں میں ہندوستانی عیسائی بھی سیدھی سادی زبان نہ بول کر" ہم کو مانگتا ہے"، "تم کدھر کو جا رہا تھا" یا" جولی ہم تم کو لو کرتا ہے" جیسے جملے بول کر ہندوستانی زبانوں کا ستیاناس کر رہا ہے۔

وکرم نے ہم وطنوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،" آپ لوگوں کو شاید نہ معلوم ہو مگر مائک کے بڑے بھائی ہندوستانی ایئر فورس میں ایئر پائلٹ رہ چکے ہیں۔ وہ ٹمپسٹ جہاز چلاتے تھے اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ سن انیس سو اڑتالیس کی کشمیر جنگ میں ہماری ایئر فورس کے اس جانباز پائلٹ نے اپنی جان کی قربانی پیش کر کے جامِ شہادت پی لیا۔"

ہندوستانی پائلٹس نے بڑی ہی اپنائیت کی نگاہ سے مائک کو دیکھا۔" پھر آپ کیسے ادھر چلے آئے؟" گیری نے مائک سے دریافت کیا۔

" نہیں میں ادھر آیا تھوڑی۔ دراصل ہم لوگ رہنے والے اسی علاقے کے ہیں۔ میرے بھائی رائل انڈین ایئر فورس میں تھے۔ ان کے بہت سے احباب بھی اسی اسکواڈرن میں تھے اور وہ انھیں چھوڑ کر کہیں اور جانا نہیں چاہتے تھے۔ اسی درمیان" رائل" ختم ہو گیا اور ہم لوگ جہاں کے تہاں رہ گئے۔"

" فائٹر پائلٹ ہونے کا جنون جب آپ کے والدین سے ایک بیٹا چھین چکا تھا تو آپ کو پاکستانی ایئر فورس میں آنے کی اجازت کیسے ملی؟" منوہر نے سوال کیا۔

" دراصل اس وقت کے بزرگ نوجوانوں کی ضد کے سامنے سر جھکا لیا کرتے تھے،" مائک نے بڑی ہی سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

" اس طرح گھر خاندان کا دو حصوں میں بٹ جانا کچھ عجیب سا نہیں تھا؟" برٹی نے کہا۔

" یا لوگوں کے ذہن میں یہ تو نہیں تھا کہ ملک کا بٹوارہ اصلیت میں صرف انتظامی امور کا پھیر بدل ہی رہے گا اور ہم لوگوں کا ایک دوسرے کے حصے میں آنا جانا اور آپس میں ملنا جلنا پہلے کی طرح برقرار رہے گا۔"

" میں آپ لوگوں سے اس موضوع پر زیادہ کچھ نہ کہہ پاؤں گا کیوں کہ میں تو اس وقت

بہت ہی چھوٹا تھا۔''

وکرم دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ واہ رے مائک، اپنی سوچ اپنی گفتگو اور اپنے موضوعات کے سلسلے میں کس قدر محتاط۔ ہندوپاک کے سیاسی معاملات کے موضوع پر کتنی خوبصورتی سے خاموشی اختیار کر لی۔ مائک کی جگہ پر کوئی مسلم پاکستانی افسر ہوتا تو فوراً اپنا ذاتی نظریہ ہی نہ پیش کرتا بلکہ نہایت خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ملک کی ہر جائز و ناجائز کارروائی کو صحیح اور وقت کی اہم ضرورت بھی بتاتا۔ مگر ایک عیسائی افسر کو احتیاط کے ساتھ ایسے موضوعات سے دور رہنے میں ہی بھلائی دکھائی دیتی ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ پاکستان میں کسی دوسرے ملک کے تئیں کوئی نرم رویہ یا کسی طرح کی ہمدردی مذہبی اقلیت پر قہر ڈھا سکتی ہے۔

''مائک ایک بات تو کہنی ہی پڑے گی،'' وکرم نے گفتگو کی سمت بدلتے ہوئے کہا، ''پوری دنیا میں صرف ہم ہندوستانی اور پاکستانی ہی ہیں جو ایک سنگین جنگ ختم ہوتے ہی ایک ساتھ بیٹھ کر آپس میں غپ شپ بھی کر سکتے ہیں۔ ایک طرف جنگ کی گفتگو تو دوسری طرف ہنسی مذاق کی باتیں۔ پاکستانی ایئر فورس کے جتنے بھی افسر آتے ہیں، آپسی گفتگو سے ایک ہنسی خوشی کا ماحول چھوڑ کر جاتے ہیں۔ جس کا لطف ہمیں بعد میں بھی دیر تک آتا رہتا ہے۔''

''یاد ہے؟ انگلینڈ کے اس ملٹری کالج میں انگریزوں نے ہمیں رہنے کے لیے کس طرح دو کناروں پر مکانات دیے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم لوگ دیکھتے ہی ایک دوسرے سے بھڑ جائیں گے؟''

''ہاں — آپ کے انگریز گائڈ ٹونی برٹن آپ کے لیے کافی فکرمند تھے، آپ کے پاکستان گرا لیے جانے کی خبر تو انھیں لگ گئی تھی لیکن آپ کی مزید خیریت کے بارے میں وہ لوگ کافی پریشان تھے، اس لیے آپ کے خطرے سے باہر ہونے کی جانکاری ان تک پہنچا دی گئی ہے۔''

وکرم اپنے انگریز دوستوں کی فکرمندی سے بہت متاثر ہوا۔ ولایت میں گذارے گئے شب و روز اسے یاد آنے لگے، اس نے پوچھا، ''مائک — اور لوگوں کے بارے میں کچھ خبر ملی کہ نہیں؟ وہ کویت والے میجر، ایران کے فاریوار اور لبنان کا وہ فلمی ہیرو جیسا افسر؟''

''ہاں، گور بند ازے سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے کہا بھی تھا کہ اس کا سلام میں آپ تک ضرور پہنچا دوں، آپ انگریزی لکھنے میں اس کی مدد کرتے تھے یہ وہ آج تک نہیں بھولا

ہے،'' مائک نے بتایا۔

''کیا گور بنداز ے یہیں ہے؟'' وکرم نے پوچھا۔

''نہیں وہ واپس جا چکا ہے۔'' مائک نے غیر ارادی طور پر کہہ تو دیا پھر اس موضوع پر چپی سادھ لی۔ شاید اسے اس بات کا احساس ہوگیا کہ اس سے انجانے میں ہی سہی ایک راز فاش ہوگیا۔ دراصل ہندوستان میں ادھر کچھ دنوں سے یہ خبر عام تھی کہ ایران نے کراچی کی حفاظت کے لیے اپنے ایف 104 جہاز کا ایک اسکواڈرن تعینات کر رکھا ہے۔ گور بنداز ے اسی اسکواڈرن کا ایک ممبر تھا، مائک نے جس کی تائید انجانے میں ہندوستانیوں کے سامنے کر دی۔

گفتگو میں تھوڑی خاموشی آتے ہی پری نے کہا،'' معلوم ہے؟ ہم لوگوں نے آ کے سیبر پائلٹ پرویز کی کھوئی ہوئی موٹر سائیکل تلاش کروانے میں مدد کی تھی۔''

''وہ کیسے؟ کیا موٹر سائیکل ہندوستان پہنچ گئی تھی۔'' انا کے اس معصومیت بھرے مذاق پر تقریباً سبھی ہنس دیے۔

''کچھ روز پہلے پرویز اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ دورانِ ملاقات انھوں نے بتایا کہ پنڈی کے کسی بازار سے ان کی بائک چوری ہوگئی۔ جس پر ہمارے ماہرِ نجوم سنتا نے انھیں بتایا کہ موٹر سائیکل ضرور ملے گی اور وہ مل بھی گئی۔''

سنتا ایک طرف بیٹھے اپنی گھنی اور لمبی داڑھی کے پردے میں خوشی سے مسکرا رہے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کی پیشین گوئیاں شاید ہی کبھی سچ ثابت ہوئی ہوں۔ بس ایک آدھ بار تکا ضرور لگ گیا ہوگا۔ سنتا زیادہ تر وقت اپنا ''گٹکا'' الگ لیے بیٹھے رہتے اور لگاتار ہلکی آواز میں ''گربانی'' کا ورد کیا کرتے۔ جب کوئی اچھی بات گربانی سے نکل کر ان کے دماغ کے روحانی حصوں تک پہنچ جاتی تو اس موضوع پر کوئی پیشین گوئی ضرور کر دیتے۔ پرویز کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ گربانی کا مطالعہ روک کر سنتا مادّی دنیا میں لوٹتے ہوئے بولے۔'' موٹر سائیکل مل جائے گی۔'' اور نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے اتوار کو پرویز میاں ہاتھوں میں دو کلو کا بڑا سا کیک لے کر سب سے ملنے حاضر ہو گئے۔

''موٹر سائیکل مل گئی،'' پرویز خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ موٹر سائیکل پیشاور ہائی وے پر ایک طرف لاوارث کھڑی مل گئی۔ چور دراصل انتہائی کاہل اور کام چور

قسم کا آدمی تھا جس کی وجہ سے گاڑی کو دھکا لگا کر قریب کے پٹرول پمپ تک نہیں لے جا سکا۔

سنتا نے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور کچھ انگلیوں کی مدد سے اپنی مونچھیں سہلائیں۔ خدا جانے مونچھوں کو تاؤ دینے سے کیسے رک گئے پھر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا (کیوں کہ ابھی تک پاکستانیوں کی جانب سے انھیں "فکسو" مہیا نہیں ہوا تھا) پھر گنگا سر سے لگایا اور بولے، "واہے گرو دا خالصا۔ موٹر سائیکل کا مل جانا دراصل ان کے واہے گرو میں اٹوٹ اعتماد کا نتیجہ ہی تھا۔"

ملن نے اب انا کو مخاطب کیا، آیئے میڈم ملیے ہمارے عظیم ماہرِ نجوم شری سنتا جی سے۔ پیشین گوئی میں ماہر، سارے دکھوں کو سکھ میں بدلنے والے۔ پاکستان کے عوام جو کسی بھی دکھ درد میں مبتلا ہوں قلم یا پنسل کھو گیا ہو، موٹر سائیکل چوری ہو گئی ہو، امتحان میں فیل ہو گئے ہوں، عشق میں دھوکا ملا ہو یا کف اور قبض سے پریشان ہوں، تو آیئے یہ سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہ دیجیے، سنتا جی تمام تکلیفوں کا علاج بتائیں گے۔ کوئی پیسہ نہیں کوئی فیس نہیں۔ صرف کچھ کیک، اچار، کباب، جیل اور جام وغیرہ........" ملند نے فٹ پاتھ کے دوکاندار یا ریل پر سامان بیچنے والوں کو بھی مات دے دی تھی۔ سبھی جی بھر کر ہنسے۔

انا تو ہنستے ہنستے بے دم ہوئی جا رہی تھی۔ بمشکل تمام وہ اتنا کہہ سکی کہ، "آپ میری پٹاری میں موجود ساری چیزوں کو گن کر بتائیں— میں کتنے سوال پوچھ سکتی ہوں؟ انشاء اللہ کسی دن جواب سننے ضروری آؤں گی۔"

ہنسی خوشی کے اس تر و تازہ ماحول کو جوں کا توں چھوڑ کر مائک اور انا ایک ساتھ اٹھے اور کمرے سے باہر جا کر ہندوستانیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ سبھی سے ہاتھ ملایا گیا اور ایک دوسرے کو الوداعی کلمات سے نوازا گیا۔ الگ الگ قسم کے جذبات سب کے چہروں پر عیاں ہو رہے تھے۔ شاید یہ سوچ کر تکلیف ہو رہی تھی کہ اتنے بھلے، سنجیدہ اور ترقی یافتہ لوگ بھی آپس میں ایک دوسرے کے دشمن رہنے پر مجبور ہیں۔

"وکرم تم ہمیشہ یاد رہو گے،" مائک نے جذباتی ہو کر کہا۔ اس کے لہجے میں شاید دوبارہ ملاقات نہ ہونے کا خوف کچھ زیادہ ہی تھا اور آپ سب لوگ..... خدا حافظ۔ دوسرے ہندوستانیوں سے مائک کچھ زیادہ بول نہیں سکا۔

''خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ کی سبھی آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہوں،'' انا نے کہا۔

سارے ہندوستانی ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے انھیں جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ جیسے سبھی کی آنکھیں انا اور مائیک کو مستقبل میں زیادہ سے زیادہ خوش رہنے کی دعائیں دے رہے ہوں۔

—

ممتاز ہمیشہ اپنے اردگرد ایک پراسرار ماحول بنائے رکھنے کی کوشش میں مصروف رہا کرتے تھے۔ وکرم کو شروع میں ان کا برتاؤ ڈھونگ اور دکھاوے سے زیادہ کچھ نہیں لگتا تھا۔ بعد میں کچھ بورنگ، غیر سنجیدہ اور آخر میں غیر ضروری و مضحکہ خیز۔ پہلی بار جب وہ وکرم کے سامنے نازل ہوئے تھے اس دن ٹھنڈ بہت زیادہ تھی اور کہرے کا یہ عالم تھا کہ دو فٹ کے فاصلے پر بھی کچھ دکھائی دینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ صبح کے وقت وکرم اپنے کمبل میں لپٹا چارپائی پر پڑا ہوا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور دھند سے ایک پرچھائی نکل کر اس کے بغل میں کھڑی ہو گئی۔ اوورکوٹ، گرم ٹوپی، مفلر اور دستانوں سے لیس وکرم کے بغل میں کھڑی تاڑسی پرچھائی اپنی بھنویں چڑھائے ہوئے چشمے کے اوپر سے بولی،'' میں تمھارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں.....'' کچھ اس انداز میں کہا گیا جیسے وکرم پر کسی طرح کی تہمت لگائی جا رہی ہو۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس پرچھائی نے خود ہی اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا— '' میں ایک جاسوس ہوں اور میرا تعلق خفیہ محکمے سے ہے۔'' حالانکہ یہ کہنا مشکل تھا کہ اس پرچھائی نے وکرم کو ڈرانے کے لیے ایسا کہا تھا یا یہ اس کی گیدڑ بھبکی تھی۔ لیکن بعد میں یہ ثابت ہوتا گیا کہ یہ ممتاز تھے اور اس سے پہلے جو کچھ سرزد ہو رہا تھا سب ان کی نمائشیں تھیں۔ ممتاز کی عادت تھی کہ وہ کسی کیس میں تلاش کم کرتے تھے اور لوگوں کو بتاتے زیادہ تھے۔

''میں تمھارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں،'' ممتاز نے دوبارہ پراسرار انداز میں اپنا جملہ دہرایا۔

''اوہ.....'' وکرم صرف اتنا ہی بول سکا۔ وہ بھی سوچنے لگا کہ آخر اس کے کردار، طریقہ کار یا کسی اور حرکت و عمل کے بارے میں ایسا کون سا راز ہے جو ان '' جاسوسِ محترم'' کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

تھوڑی دیر تک ممتاز بھنویں اوپر اٹھائے چشمے کے اوپر سے وکرم کا چہرہ دیکھتے رہے، اوپر نیچے

دائیں بائیں غرض کہ سر سے پیر تک اس کے پورے جسم کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر قدرے آگے جھک کر اس کے چہرے کی لکیریں تک گنتے ہوئے نہایت سنجیدہ لہجے میں بولے،" واقعی غلطی ہوگئی۔"

" کیا؟.........کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

" تم سے نہیں، غلطی تو ہم سے ہوئی ہے۔" اپنے انداز سے ممتاز یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے تھے کہ ان کے سینے میں پتہ نہیں کتنے راز پوشیدہ ہیں۔ وہ کسی سانپ کی طرح پھپھکارتے ہوئے بولے،" تم یہاں کیوں آئے؟ تمھیں تو بھیجا گیا تھا؟ ہے نہ؟"

" کیا مطلب ہے آپ کا؟" وکرم نے متعجب ہو کر پوچھا۔ وہ کشمکش میں تھا کہ آخر یہ شخص کیا کہہ رہا ہے اور اس سے کیا اگلوانا چاہتا ہے؟

" جنگ کے چند روز پہلے ہی تم ہیڈ کوارٹر کا کام کاج چھوڑ کر اپنے اسکواڈرن میں واپس کیوں پہنچ گئے؟ کیوں؟" ممتاز بولتا چلا گیا۔" جب کہ لوگ جنگ کے ماحول میں مورچے سے پیچھے کی طرف بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ تمھیں بتانا ہوگا کہ تم نے ایسے کیوں کیا؟"

وکرم سوچنے لگا کہ آخر اتنے بے تکے سوالات کے پیچھے ممتاز کی منشا کیا ہوسکتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سادگی سے کہا،" جناب! فوج میں احکامات ہی سب کچھ ہوتے ہیں، ہمیں جس طرح کا حکم دیا جاتا ہے ہمارا عمل بھی ویسا ہی رہتا ہے۔ دوران جنگ اکثر لوگوں کو مورچے پر سامنے ہی بھیجا جاتا ہے۔"

" نہیں جناب!" ممتاز نے پھر زبان کھولی۔" ہمیں اس وقت معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ اصلیت میں ہیڈ کوارٹر پر کس عہدیدار کی حیثیت سے تعینات ہیں اور ادھر جلد بازی میں پوری دنیا کو بتا دیا گیا کہ ہم نے آپ کا جہاز مار گرایا اور آپ کو زندہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جب تک میں کچھ کرسکتا تب تک آپ کی تصویر تمام اخبارات کی زینت بن چکی تھی۔"

" میں کچھ سمجھا نہیں.....آخر آپ جن لوگوں کو قید کریں گے، ان کے نام تو آپ کو اعلان بھی کرنے پڑیں گے۔ خاص طور سے پائلٹس کے۔ کیوں کہ ان سے متعلق خبریں کچھ زیادہ ہی دلچسپ ہوا کرتی ہیں۔"

''تمھارا نام اور تصویر اگر پریس تک نہ پہنچے ہوتے تو کوئی سوال کرنے سے پہلے ہی ہمیں تم سے اس کا جواب مل گیا ہوتا۔ تم ہمارے سامنے ایسی چالاکی اور ہوشیاری کا مظاہرہ نہ کرتے۔ میں سب جانتا ہوں، تم راز کی باتیں ہضم کر جانے میں کتنے ماہر ہو۔ خاص کر ایسے حالات میں جب تمھیں اعتماد ہو گیا ہو کہ تم قید میں بھی محفوظ ہو اور تمھیں بحفاظت رکھنا پاکستان گورنمنٹ کی مجبوری بن چکا ہو۔'' ممتاز یہ بیانات اپنے اندر کتنے خطرناک معانی و مطالب سمیٹے ہوئے تھے، محسوس کر کے وکرم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''آپ کا مطلب ہے کہ اگر آپ لوگوں نے میری زندگی کا اعلان نہ کیا ہوتا اور میری حیات و موت کے بارے میں آپ کے علاوہ اور کسی کو کوئی خبر نہ ہوتی تو میں پوری طرح آپ کے بس میں رہتا اور آپ موت کی دھمکیاں دے کر دوسرے لفظوں میں تھرڈ ڈگری کا استعمال کر کے جس طرح چاہتے، مجھے استعمال کرتے، مجھ سے جو چاہتے اگلواتے۔''

ممتاز پھر بھنویں سکوڑیں اور چشمے کے اوپر سے وکرم کو گھورا، دو بار سر کو جھٹکا دیا اور ایک دم سے باہر چلا گیا۔ وکرم اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ دروازہ بند نہیں کر دیا گیا۔

وکرم بے سکونی کی کیفیت میں لیٹا رہا۔ اسے ممتاز کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اتنا تو مانا جا سکتا ہے کہ دشمن کے ہاتھوں پڑتے ہی کوئی فوجی مار دیا جائے لیکن ایسے حادثے مورچوں پر جوش اور غصے کی حالت میں سرزد ہوتے ہیں۔ جان بوجھ کر جنگی قیدیوں کو کہیں پوشیدہ مقامات پر رکھنا اور بعد میں کسی گھٹیا مقصد کے لیے ان کا استعمال کرنا جاسوسوں اور خفیہ ایجنٹوں کی دنیا میں بھلے ہی مناسب اور جائز ہو مگر اپنی مٹی کے لیے قربان ہو جانے والے فوجیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ یکسر غیر مناسب اور لائق مذمت سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستانی اور مغربی ممالک میں دورانِ جنگ زخمیوں یا اپنے گھیرے میں آ گئے دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کو پاکیزہ اور مستحسن عمل مانا گیا ہے۔ لیکن ممتاز کے بیان سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے تمام روایتیں اور عملی پابندیاں بے معنی ہو چکی ہیں، کچھ لوگوں کی سوچ اور طریقۂ کار پر صرف بغض و حسد ہی غالب ہو چکا ہے۔

کچھ دنوں کے وقفے کے بعد ممتاز پو پھٹتے ہی دوبارہ آ پہنچے۔ پہلے کی ہی طرح کہرے کی دھند سے پرچھائی بن کر نکلتے ہوئے۔ بغیر کچھ کہے وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے اور اپنی پرانی ادا سے

وکرم کو گھورنے لگے، وکرم کے دماغ میں اتنے سوالات تھے کہ وہ ممتاز کے بولنے کا انتظار نہ کر سکا اور شروع ہو گیا۔

''کیا آپ کی قید میں اور ہندوستانی ہیں؟ میرا مطلب ان سب کے علاوہ بھی جو یہاں میرے ساتھ ہیں، یا اور بھی کچھ پائلٹس؟''

ممتاز کچھ بولے نہیں، بس بغیر عینک کے شیشوں کا سہارا لیے وکرم کو گھورتے رہے۔

''ہمارے اور بھی پائلٹس تھے جو حملے پر آنے کے بعد اپنے ٹھکانوں پر واپس نہیں پہنچے۔ ہمیں امید تھی کہ وہ بھی یہیں قید ہوں گے مگر.....'' ممتاز بت بنے بیٹھے رہے تو وکرم نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''کچھ پائلٹس کو پیراشوٹ کے ذریعے نیچے آتے دیکھا گیا تھا۔ کچھ کو زمین پر اترتے دیکھا گیا تھا، آخر وہ سب کے سب کہاں ہیں؟ یا ان کا کیا کیا گیا؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے؟'' ممتاز نے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''آخر جنگ تو چل ہی رہی تھی، کیا پتہ کیا ہوئے۔''

''آپ کے ریڈیو نے کئی جہازوں کو مار گرانے کا اعلان کیا۔ صحیح تاریخ اور وقت بھی بتایا گیا مگر پائلٹس کے بارے میں قطعی خاموشی کیا معنی رکھتی ہے۔ آخر وہ سب آپ کی قید ہی میں تو ہوں گے؟''

''ایسے پائلٹس کے نام؟'' ممتاز نے پوچھا۔

وکرم کو امید جگی کہ شاید اس سلسلے میں کوئی اطلاع ملے۔ وہ جلدی جلدی کچھ نام بتانے لگا۔

''ڈنڈاس، مستری، تامبے.....''

''کبھی نہیں سنے.....'' ممتاز نے لعنت ملامت کے انداز میں جواب دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

ایسی کئی ہندوستان پائلٹس تھے جنھیں سرزمینِ پاکستان پر پیراشوٹ سے اترتے دیکھا گیا تھا اور امید تھی کہ وہ پاکستان کی قید میں زندہ اور سلامت ہوں گے۔ مگر یہاں ان کا کہیں اتا پتا ہی نہیں تھا اور یہ فکر کا موضوع تھا۔ وکرم نے اپنے ساتھیوں کو ممتاز سے ہوئی گفتگو لفظ بہ لفظ سنائی تو برٹی نے کہا، ''نگران کو الگ نظر بند کر کے کریں گے کیا؟ جنگ کے بارے میں پوچھ تاچھ کے بعد

جنگی قیدی کسی کے لیے کس کام کا رہ جاتا ہے؟"

"ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا ہے۔ شاید الگ الگ جیلوں سے ایسے تمام قیدیوں کو اکٹھا کرنے کے لیے اور وقت درکار ہو۔ اس کے بعد ان کو کسی دوسرے کیمپ میں حاضر دکھا دیا جائے گا۔" منوہر نے اپنی رائے پیش کی۔

"قیدیوں کے سارے نام تو یہ اعلان ہی کر چکے ہیں، تو اب یہ کیا کریں گے؟ کیا کچھ اور قیدی پیش کرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ ہمیں افسوس ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں ہم بتانا بھول گئے تھے۔ اس طرح تو شک کی گنجائشیں اور بڑھیں گی کہ پتہ نہیں دال میں کس حد تک کالا ہے۔ اس لیے مجھے نہیں لگتا ہے کہ پاکستان اس سلسلے میں کچھ اور بتائے گا،" گیری نے اپنا زاویہ نظر رکھا۔

"ڈنڈا اس کے پکڑے جانے کی خبر تو وائرلیس پر پاکستان کے پولس والوں نے ہی ایک دوسرے کو ی تھی اور صاف صاف اعلان کیا تھا کہ اسے زندہ گرفتار کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اسے کسی طرح چو بھی نہیں آئی تھی۔ یہ گفتگو ہم لوگوں نے خود بھی اپنے وائرلیس سٹ پر سنی تھی پھر اس بات کو کر رح چھپایا جا سکتا ہے؟" سنتا نے کہا۔

' رے یار جیلوں میں جانے کتنے لوگ سڑتے رہتے ہیں۔ وہ کون ہیں اور ان کا قصور کیا ہے، یہ ب بھول جاتے ہیں، کسی کو فکر رہتی ہے؟" ہیری نے کہا۔

"چورا چکوں کے لیے تو ایسا ممکن ہے۔ مگر کسی دوسرے ملک کے فوجیوں خاص طور سے پائلٹس کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے؟" برٹی نے سوال کیا۔

"ان لوگوں کی بے رحمی اور بے رخی کو کم نہ سمجھیے،" کیمی نے کہا۔ "ممتاز نے خود قبول کیا کہ وکرم کے سلسلے میں وہ لوگ غلطی کر بیٹھے۔ اس لیے کچھ دوسرے پائلٹس کے ساتھ ممکن ہے ایسی غلطی نہ کی گئی ہو۔ دیکھتے رہیے، اپنی قید میں اور ہندوستانی فوجیوں کے ہونے سے یہ انکار ہی کرتے رہیں گے۔ چاہے ایک جھوٹ چھپانے کے لیے انھیں ہزار جھوٹ کیوں نہ بولنا پڑے۔"

ممتاز جس خاموشی سے نمودار ہوئے تھے اسی خاموشی سے غائب بھی ہو گئے۔ وکرم نے ان کا حلیہ اور انداز گفتگو اپنے ساتھیوں کو تفصیل سے بتا رکھا تھا۔ مگر ممتاز وکرم کے علاوہ اور کسی سے تو ملا نہیں تھا۔ اس بات سے وکرم اور بھی کشمکش میں تھا کہ یہ شخص بار بار اسی سے کیوں ملنے آتا ہے۔

پاکستان میں اور قیدیوں کے پھنسے ہونے کے امکانات سے صرف اسی کو کیوں آگاہ کرتا ہے؟ ذہنی طور پر ہر وقت اسے ہی کیوں ستاتا ہے؟

تقریباً دو مہینے بعد جب گرمیوں کی شروعات ہو چکی تھی، ایک روز صبح تڑکے ہی اس وقت دروازہ کھلا جب عموماً قیدیوں کی رفعِ حاجت کے لیے کھولا جاتا تھا۔ لیکن وکرم نے جب دروازے کی طرف دیکھا تو وہی پرچھائی نما......... ممتاز۔ وکرم سوچنے لگا، آخر پھر وہی بلا..... لیکن زبان پر ''گڈ مارننگ'' آ ہی گیا۔ وکرم کے سلام کا تو ممتاز نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن ہونٹوں سے وہی پرانا جملہ پھر ادا ہوا۔ ''میں تمھارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔''

''اور آپ کا یہ جملہ..... مجھے پوری طرح یاد ہو چکا ہے،'' وکرم نے بھی زہریلے انداز میں جواب دیا۔

''ہاں، ہمارے اعلیٰ حکمران شاید نہ جانتے ہوں، مگر مجھے اور میرے گھر والوں کو سب کچھ معلوم ہے،'' ممتاز کے الزام لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے گھر والے ہمارے مخالف ہی نہیں تھے بلکہ پاکستان بننے کے خلاف میٹنگیں اور تقریریں بھی کیا کرتے تھے۔ قائداعظم نے ''ڈائرکٹ ایکشن'' کا اعلان کیا تو تم لوگوں نے ہمیں مارنے کے لیے مورچہ بنا لیا۔ تمھارے گھر والوں نے ہماری زمینیں تک نہیں بکنے دیں، ہمیں اپنے گھر جائداد اونے پونے داموں میں بیچ کر یہاں آنا پڑا۔ مگر دیکھ لو! آج ہم اپنی ملت اپنے ملک اور اپنی قوم میں خوش ہیں اور کامیاب بھی۔ تم ہمارا کچھ نہ بگاڑ پائے۔ لیکن تمھیں اپنے کیے کی سزا تو بھگتنی ہی پڑے گی۔ ہم تمھیں آج نہیں تو کل سبق سکھا کر ہی رہیں گے۔ انشاء اللہ۔''

اس شخص کو پہچاننے کے لیے وکرم نے اپنی یادداشت پر زور ڈالنا شروع کیا۔ اس کے علاقے کے قریب قریب بھی با حیثیت مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ ممکن ہے انھیں لوگوں میں ممتاز بھی رہا ہو، کیونکہ وہی لوگ اس کے سلسلے میں اس قدر گھریلو جانکاری رکھ سکتے ہیں۔ یہ سارے کے سارے زمین جائدادوالے رئیس لوگ بڑے ہی چالاک اور ہوشیار تھے۔ پردے کے پیچھے رہ کر غریب ان پڑھ اور پچھڑی مسلم برادریوں کو بھڑکا کر، انھیں ہندوؤں کے خلاف اکسا کر، دنگے، لوٹ پاٹ اور خون خرابہ کرواتے تھے۔ صرف انگریزوں کے سامنے یہ ثابت کرنے کے

لیے کہ ہندو اور مسلمان بالکل دو الگ الگ قومیں ہیں، جو کبھی مل جل کر ایک ساتھ بیٹھ ہی نہیں سکتی ہیں۔ امن قائم کرنے کے لیے ملک کا بٹوارہ ہی واحد راستہ ہے۔ ان چالاک لوگوں نے چپکے چپکے اپنی زمین بیچی، اپنے مکانوں کے سودے کیے اور سارا روپیہ پیسہ بٹور کر چپکے سے علی گڑھ جانے کے بہانے کھسک لیے اور پاکستان پہنچ گئے۔ دولت ان کے پاس تھی ہی اس لیے یہاں بھی عیش و آرام ان کا مقدر رہا اور جن غریب، مظلوم مسلمانوں نے قربانیاں دے کر پاکستان کی بنیاد ڈالی وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی بستیوں میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر ڈرے سہمے پڑے رہنے پر مجبور رہے۔ وکرم بہت شدت سے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ممتاز آخر کس خاندان کا ہے۔ اگر یہ یاد آ جاتا تو وکرم بھی کم سے کم کہہ سکتا کہ "میں بھی تمھارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔"

جس طرح پانی اپنی سطح خود تلاش کر لیتا ہے۔ اسی طرح آدمی بھی اپنے معیار کے انسان کے پاس خود ہی پہنچ جاتا ہے۔ یہی حالت غیر منقسم ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھی تھی۔ زمیندار زمینداروں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ دانشور طبقے کے لوگ ایک دوسرے کے شاعروں اور کویوں کے ساتھ نشستیں اور محفلیں سجاتے تھے۔ زندگی کا لطف اٹھانے والے ہندو نوجوان پستی کی طرف، پتنگ باز یا کوٹھوں پر جانے والے مسلم نواب زادوں سے راہ و رسم بنا لیتے تھے۔ اور دونوں طرف کے غریب مزدور آپس میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی بیڑی شراب اور پریشانیاں بانٹتے تھے۔ کسان موسم کا قہر اور قرض وصول کرنے والوں کی بے رحمیوں کا تذکرہ ایک دوسرے سے کر لیتے تھے۔ مولوی اور پنڈت مذہب کے تئیں اپنے اپنے معتقدین کی پژمردگیوں پر تبصرہ ایک دوسرے سے ہی کرتے تھے۔ ایسا میل میلاپ ایک معاشرتی ضرورت تو تھا ہی، لیکن مذہبی جنون سے پیدا غلط فہمیوں کو دور کرنے میں مددگار بھی ثابت ہوتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے پاکستان کا نعرہ بلند ہوتا گیا، ویسے ویسے ہی یہ آپسی لین دین اور صلح و مصالحت کے راستے بھی بند ہوتے گئے، لوگ اپنی اپنی ذات میں سمٹنے لگے اور دلوں میں شکوک و شبہات گھر کرنے لگے۔

بچپن اور نوعمری کے دنوں میں وکرم اپنے ہم عمر مسلم دوستوں کے ساتھ کافی وقت گذارتا تھا۔ سب ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے ہی نہیں بلکہ گھروں میں ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے بھی تھے۔ لیکن جیسے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی تعلقات بگڑنے لگے، بچوں تک نے ایک

دوسرے کے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ وکرم کو اس کا بہت افسوس تھا۔ خاص طور سے مسعود کے گھر والوں سے نہ مل پانے کا۔ وہ وہاں جانے کے سو بہانے ڈھونڈتا اور مقصد صرف اتنا ہوتا تھا کہ کسی طرح غرارہ پہنے اس لڑکی کو ایک نگاہ دیکھ لے، جواب بڑی ہو جانے کی وجہ سے اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کھیلنے کودنے سے کترانے لگی تھی اور اس دن تو وکرم کے دکھ کی کوئی انتہا نہ رہی جس دن یہ پتہ چلا کہ صبح تڑکے ہی مسعود کا پورا پریوار کار میں بیٹھ کر شہر ہی چھوڑ گیا۔ کسی نے کہا کہ علی گڑھ چلے گئے تو کسی نے بتایا کہ سیدھے پاکستان۔ کچھ مہینوں بعد ان کے ایک عزیز کے پاس آئے ہوئے ان کے ایک خط سے پتہ چلا کہ وہ لوگ کراچی میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ کچھ اور برس گذرے تو معلوم ہوا کہ مسعود صاحب کی بڑی صاحبزادی کا نکاح پاکستانی ایئر فورس کے ایک بڑے افسر سے ہو گیا ہے۔ وکرم نے اس کے بعد پوچھ تاچھ کا یہ سلسلہ ہی بند کر دیا۔

اب کچھ بولنے یا کہنے کی باری ممتاز کے بجائے وکرم کی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں تھوڑا بھینچ کر ممتاز کی طرف دھیان سے دیکھا اور اس کے منہ سے صرف ایک ہی لفظ نکل سکا جس کی آواز یقیناً کئی قسطوں میں تھی۔ عا......ئے......شہ۔ یہ نام سن کر ممتاز ذرا بھی نہیں ٹھٹھکے۔ صرف ان کا سر تھوڑا سا ہلا۔ سارے کے سارے مہرے سامنے تھے، تعارف ہو چکا تھا۔ ممتاز بے چارے اپنی کرسی سے اٹھے—اور سائیں سے باہر چلے گئے۔

وہ غرارہ پہنے لڑکی عائشہ، دو ڈھیلی چوٹیوں میں گھنے کالے لمبے بال گلابی رخسار والے خوبصورت گورے چہرے، اور دونوں طرف سے گھیرا ہوا نوعمری کی امنگوں سے تنا ہوا مہین باریک دوپٹہ، ادھر سے ادھر گھوم گھوم کر سب کو دیکھتی ہوئی ہرنی جیسی آنکھیں کسی طرح وکرم کے چہرے پر ایک پل کے لیے ٹھہریں، پھر نیچے جھکیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چہرہ دوسری طرف مڑ گیا۔ اسے بھی معلوم تھا کہ اس وقت ہزاروں آنکھوں کی مرکز نگاہ وہی تھی۔ زیادہ تر کالی اور سانولی لڑکیوں کی جھنڈ میں اس کی خوبصورتی تمام دیکھنے والوں کو چکا چوندھ کر رہی تھی۔

گورنمنٹ کالج کے لڑکوں اور مشن اسکول کی لڑکیوں کے بیچ سالانہ تقریری مقابلے کا دن تھا۔ دونوں طرف کے بچوں سے مشن اسکول کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دونوں اسکول کے ٹیچرس نے بڑی محنت اور قابلیت سے تقریریں لکھ کر اپنے اپنے بچوں کو یاد کرائی تھیں۔ لیکن پورے ہال

میں کسی بھی بچے کو تقریر وغیرہ سے کوئی لینا دینا نہیں تھا اور نہ وہ سلیقے سے کچھ سن ہی رہے تھے۔ دراصل جس زمانے میں لڑکیاں باقاعدہ پردے سے ڈھکی گھوڑا گاڑیوں میں اسکول جایا کرتی تھیں اس وقت یہ سالانہ جلسہ ہی نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کے روبرو ہونے کا موقع فراہم کرتا تھا۔ یہاں ایک دوسرے کے درمیان کا فاصلہ صرف پانچ فٹ کا گلیارا ہی ہوتا تھا۔ باہر دو الگ الگ دنیا تھی۔ لڑکیاں ادھ کھلی آنکھوں سے لڑکوں کی طرف دیکھ بھر لیں، لڑکے دیر تک بے شرمی سے مڑ مڑ کر انھیں دیکھا کرتے۔ اسٹیج پر کیا ہو رہا ہے، کس کی تقریر چل رہی ہے، اس کی فکر کرنے والے کم ہی لوگ رہا کرتے تھے۔

گیت، غزل اور پھر سارے جہاں سے اچھا............کی طرح ایک دو پروگرام کے بعد ہی نویں اور دسویں درجے کے طلبہ کے بیچ بحث ومباحثہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مقابلہ چونکہ نوعمروں کے درمیان ہوتا تھا اس لیے اس کے عنوانات بھی زیادہ تر عورت اور مرد کے رشتوں سے متعلق ہی ہوا کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر طنز کے تیر چھوڑنے سے سامعین کافی خوش بھی ہوا کرتے تھے۔ آج کے جلسے کے ایک عنوان ''عورت کی جگہ صرف گھر کے اندر ہے'' پر بہت ہی دلچسپ بحث ہونے کی امید تھی۔

پروگرام آگے بڑھا۔ مائک پر ایک نام پکارا گیا۔ عائشہ۔ دھیرے دھیرے ایک لڑکی روشنیوں سے جگمگاتے ڈائس پر آکر سب کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ پورے ہال میں سناٹے کا یہ عالم تھا کہ اگر ایک سوئی گرا دی جاتی تو اس کی آواز بھی سنی جاسکتی تھی۔ لوگ سانس لینا بھول گئے تھے، صرف ایک ٹک اس لڑکی کو دیکھے جا رہے تھے۔ ایسی خوبصورت لڑکی شاید ہی کبھی اس اسٹیج پر دکھائی دی ہو۔ ایک لمحہ کھڑی رہ کر وہ ذرا سا آگے جھکی، داہنا ہاتھ پیشانی تک لاکر حاضرین کو آداب کہا۔ کاندھوں سے سامنے کی طرف آگئی ایک چوٹی کو جھٹک کر پیچھے کیا اور بولنے لگی۔ اس نے بولنا شروع کیا تو سناٹے کا یہ عالم تھا کہ اس کے ہونٹوں سے نکلے ہر ہر لفظ کو ہال کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر واضح طریقے سے سنا جاسکتا تھا۔ سارے کے سارے مجمع سے آنکھیں ملا کر بولنے کا انداز ایسا آزادانہ اور خود اعتمادی سے بھرا ہوا تھا جیسے کہ کسی بند کمرے میں مشق کی جارہی ہو۔ بار بار تالیاں بج رہی تھیں۔ سب سے بڑی فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ صرف انعام قبول کر لینے

بھر کی رسم باقی تھی۔

اپنی تقریر ختم کر کے عائشہ اسٹیج سے ایک طرف جا کر کھڑی ہوگئی۔ وکرم کی آنکھیں مستقل اسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ حالت یہ تھی کہ اسے دین دنیا کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ کب اس کا نام پکارا گیا کب وہ اسٹیج پر پہنچا، کیسے اس نے بولنا شروع کیا.......... ''عزت مآب پرنسپل صاحب، معزز مہمانِ خصوصی، لائقِ احترام اساتذہ، حاضرین، بھائیو اور بہنو......'' وکرم ابھی اتنا ہی بول سکا تھا کہ اس کے داہنی طرف کھڑی عائشہ پر اس کی نگاہ پڑی اور وہ اچانک رک گیا۔ آگے کے الفاظ اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئے، پورے ہال میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ اس نے دوبارہ کوشش کی ......محترم......اور پھر خاموشی۔ ہال میں شور اٹھنے لگا، رٹی ہوئی تقریر ذہن سے پھسل گئی تو پھسل گئی۔ پاس ہی کھڑے ایک ٹیچر سے اس نے دھیرے سے کہا ''سر کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔'' استاد نے حقارت بھری ایک نگاہ اس پر ڈالی، وہ گھبرا اٹھا اور اسی گھبراہٹ میں اسٹیج سے اتر کر بغل کے ایک دروازے سے باہر بھاگ گیا۔ وکرم شرمندگی اور دکھ کے ملے جلے احساس سے بوجھل ایک کھمبے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا کہ تھوڑی دیر بعد اسی طرف سے عائشہ کھمبے کی دودھیا روشنی میں اپنے ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ ہاتھ میں نشانِ فتح کے طور پر ایک کپ لیے جا رہی تھی۔ جیت واقعی اسی پر پھبتی تھی۔ اس کپ پر واقعی اسی کا حق ہو سکتا تھا۔

اس دن سے وکرم اپنا آپا کھو چکا تھا۔ اتفاق سے عائشہ کا ایک بھائی اس کا دوست بھی تھا اور اب وہ رات دن کسی بھی طرح عائشہ کے گھر تک پہنچنے کا بہانہ تلاش کرنے میں لگا رہتا تھا۔ عید اور ہولی ملن جیسی تقریبات کا انتظار بڑی ہی بے صبری سے ہونے لگا۔ سب سے زیادہ انتظار تو ''تیج'' کا تھا جس میں سارے رشتے داروں اور دوستوں کے گھروں کی لڑکیاں اور عورتیں روز ایک دوسرے کے گھروں میں مل کر جھولا جھولتی تھیں۔ برسات کے موسم کی ہلکی پھوار میں آم کی شاخوں سے لٹک رہے جھولوں میں یہ دوشیزائیں گھنٹوں ہلوریں لیا کرتی تھیں۔ پیڑوں سے لٹکتی رسیوں میں کبھی کبھی کھٹولے بھی باندھ دیے جاتے تھے جن پر کئی سہیلیاں ایک ساتھ بیٹھتی تھیں۔ ان کھٹولوں کو جھلانے کے لیے اکثر لڑکوں کی مدد لی جاتی تھی، جو اس کام کو انجام دینے کے لیے بڑے چاؤ سے تیار رہتے تھے۔

......اور پھر اسی دوران شروع ہوئی پاکستان کی مانگ، ملک کے بٹوارے کی مانگ، دلوں کی تقسیم کی مانگ، گنگا جمنی تہذیب سے انکار کی مانگ، پشت در پشت سے چلے آرہے رشتوں کو ختم کرنے کی مانگ، انسانی شفقتوں اور محبتوں کو غیر انسانی تنگ مزاجیوں میں بدلنے کی مانگ اور ان تمام حالات کا سب سے تکلیف دہ مرحلہ تھا مسعود کے خاندان کا ہجرت کر جانا جیسے ایک وقت کا ختم ہو جانا، مذہب اور دھرم سے اوپر اٹھ کر پالے پوسے گئے آپسی رشتوں کا مذہب کی تلوار سے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا۔

اگلی بار جب ممتاز آئے تو کچھ مشتعل دکھائی دے رہے تھے جیسے کوئی فکر انھیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہو۔ وکرم کو تھوڑی دیر گھورنے کے بعد انھوں نے یکطرفہ گفتگو شروع کی۔ جیسے اپنے نظریات خود ہی واضح کر رہے ہوں۔ ''معلوم ہے—؟ بٹوارے سے پہلے ہم ہی ہندوستان کو چلاتے تھے۔ انگریز ہمارے ہی مشوروں سے حکومت کرتے تھے کیوں اتنے بڑے ہندوستان پر حکومت کرنے کا تجربہ صرف ہم مسلمانوں کو ہی تھا۔ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد ہم اپنی حکومت قائم نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے پاکستان بننا ضروری ہو گیا تھا۔ ہم لوگوں کے لیے تو زندگی اور موت کا سوال بن گیا تھا۔ پاکستان کسی اور نے نہیں ہمیں لوگوں نے بنایا۔ ہم پٹنہ اور لکھنؤ کے مسلمان، بریلی، بھوپال، الٰہ آباد اور علی گڑھ کے مسلمانوں کا دانش مند طبقہ.....ذہین اور ترقی یافتہ فکر رکھنے والے مسلمان.....ہمیں نے انگریزوں سے پہلے ہندوستان پر حکومت کی تھی...... انگریزوں کے زمانے میں ان کا راج چلایا تھا.....اور یہاں کی حکومت بھی ہمیں ہی چلانی ہوگی، تبھی پاکستان کے حالات بدلیں گے اور پاکستان کی طاقت میں اضافہ بھی ہوگا۔ تب ہم ہی ہندوستان سے نپٹیں گے، کیوں کہ آپ کے دل و دماغ اور آپ کی فطرت سے سب سے زیادہ ہم ہی واقف ہیں۔''

''آپ لوگ یہ مستقل کس طرح کی بات کرتے رہتے ہیں اور اس طرح کیوں سوچتے ہیں؟ آخر آپ نے اچھے خاصے ملک کی تقسیم کی مانگ کی، اپنا حصہ لے لیا، تو اب کیا مسئلہ ہے؟ اب آپ لوگ امن و سکون کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ آخر اب کون سا حساب برابر کرنا رہ گیا ہے؟'' وکرم اپنی رو میں کہتا چلا گیا۔

''وہ آپ نہیں سمجھ سکتے......''ممتاز صرف اتنا ہی کہہ سکے اور کرسی سے اٹھ کر جانے لگے۔

''عائشہ کیسی ہے؟'' وکرم نے آخر پوچھ ہی لیا۔ ممتاز جاتے جاتے رکے پلٹ کر وکرم کی طرف دیکھتے ہوئے اس انداز سے ہاتھ اٹھایا جیسے آگے ایک لفظ بھی بولنے سے منع کر رہے ہوں، اور پھر کمرے سے باہر چلے گئے۔

دو چار روز بعد جب ممتاز پھر آئے تو آتے ہی دریافت کیا۔''مسٹر امیر چند، جج صاحب اور برج نرائن جی ابھی ہیں یا نہیں؟''

وکرم سوچنے لگا کہ ممتاز کا مخالف برتاؤ ایک طریقے سے بناوٹی اور کسی چیز کی اوپری پرت جیسا تھا۔ ایک طرح کا ذہنی انتشار، جس کا دل یا روح کی گہرائیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کے بچپن کا وہ خوشگوار وقت، جس میں کوئی تناؤ نہیں تھا۔ شب و روز کی جدوجہد نہیں تھی۔ ایک دوسرے کی طرف گھورتی ہوئی فوجیں نہیں تھیں، ایک دوسرے کو زیر کرنے کی ہوڑ نہیں تھی۔ شاید یہی خوشگوار یادیں تھیں جو بار بار ممتاز کو وکرم کی طرف کھینچ لاتی تھیں۔ لیکن برسوں سے دماغ میں گھر کیے ہوئے خیالات کا اشتعال تھا کہ ممتاز یک طرفہ تقریریں شروع کر دیا کرتے تھے۔

''غلطیاں تو ہوئی ہیں، بڑی ہی سنگین غلطیاں، وہ بھی بار بار۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ صدیوں پہلے کی طرح فوج کو آگے بڑھاؤ اور سب کچھ فتح کر لو۔ انھیں پتہ ہی نہیں ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے کتنا کچھ بدل ڈالا ہے۔ اب جنگ صرف دماغ سے لڑی جا سکتی ہے اور دماغ سے ہی جیتی جا سکتی ہے، طاقت سے نہیں۔ لیکن ہمارا وقت اب آ رہا ہے۔ ہم یہاں غالب ہو کر رہیں گے اور اپنے حساب سے حکومت بھی کریں گے۔''

وکرم کا من تو کہیں اور ہی تھا۔ وہ اس بلا وجہ کی کبھی نہ ختم ہونے والی بحث میں خود کو الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا۔'' کیا عائشہ سے ملنا ممکن ہے؟ صرف ایک بار......اور...... صرف ایک منٹ کے لیے۔''

ممتاز خاموشی سے کچھ دیر وکرم کو دیکھتے رہے پھر چلے گئے۔ وہ کشمکش میں تھا کہ اس کا یہ کہنا مناسب بھی تھا یا نہیں۔ ایک شوہر سے اس کی بیوی کے سلسلے میں ایسا التماس اخلاقیات کی حدوں میں تھا یا نہیں۔ پھر خود ہی اپنی سوچ کا جواب دیتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر بچپن کی کچھ

یادیں ممتاز کو وکرم تک پہنچنے کے لیے اکثر و بیشتر مجبور کر سکتی ہیں تو اس کا عائشہ کی طرف کھنچاؤ ناجائز کیسے ہو سکتا ہے۔

اگلی بار ممتاز اپنی عادت کے بالکل خلاف تیسرے پہر ہی تشریف لے آئے۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ کہ وکرم کو اس کی سیل سے باہر دفتر کے ایک کمرے میں لے جایا گیا، جہاں میز کے پیچھے کرسی پر ممتاز پہلے سے ہی براجمان تھے۔ انھوں نے ابھی وکرم کو بیٹھنے کا اشارہ ہی کیا تھا کہ ایک پولس کارپورل تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور ممتاز کے کان میں کچھ کہہ کر رخصت ہو گیا۔ ممتاز فوراً جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جاتے جاتے وہ صرف اتنا بتا سکے کہ کوئی سینئر افسر اس کیمپ کے معائنے کی غرض سے آنے والے ہیں لہٰذا اس وقت میرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔

ممتاز چلے گئے۔ پولس والے نے وکرم کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وکرم دفتر کے باہر آیا ہی تھا کہ اس نے بلڈنگ سے باہر ایک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ کار مڑ کر جب اس کے سامنے سے گذری تو کھڑکی سے .... وہی دو کالی چوٹیوں کے بیچ گورا سا چہرہ گلابی...... اور اس کی طرف دیکھتی ہوئی ہرنی کی سی دو آنکھیں، کچھ تعجب سے، کچھ الجھن سے، کچھ گذرے وقت کے تصورات سے......

دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وکرم کا ایک ہاتھ فوراً سینے پر پہنچ گیا اور دوسرے ہاتھ نے اٹھ کر عائشہ کو روکنا چاہا ''............ رکو عائشہ .... ایک لمحے کے لیے ...... ایک پل کے لیے۔''

لیکن کار آگے بڑھ گئی...... اور پھر وہ کھو گئی...... وقت کے غبار میں...... ہمیشہ کے لیے...... شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

—

باب بیس

وطن واپسی

ہندوستان کے تمام جنگی قیدی اس وقت لائل پور جیل میں تھے۔ یہ جیل پاکستان کی انتہائی محفوظ جیل سمجھی جاتی ہے۔ ایئر فورس اور بری افواج کے آفیسرس الگ الگ احاطوں میں رکھے گئے تھے۔ اسی طرح جوان اور سارے جے۔ سی۔ او۔ بھی، ہر اتوار کو صبح سب کو اکٹھا ہونے کی اجازت تھی۔ اس دن سارے جوان اپنے احاطے کی سلیقے سے صفائی کر کے ایک اسٹیج پر تقریباً ہر طرح کی مذہبی کتابیں سجاتے تھے اور وہیں بیٹھ کر ایک منڈلی کی شکل میں بھجن کیرتن کرتے تھے۔ جس کے آخر میں آرتی بھی ہوتی تھی۔ ہندوستانی مسلمان بھی ساتھ ساتھ رہتے تھے جو پاکستانیوں کو حیرت انگیز لگتا تھا۔ انھیں یہ دیکھ کر بھی کافی حیرت ہوتی تھی کہ رمضان کے مہینے میں سارے ہندو سپاہی رات کے تیسرے پہر اٹھ کر اپنے مسلم ساتھیوں کے لیے ''سحری'' تیار کرتے، اور شام کو افطار کے لیے وقت سے کھانا وغیرہ تیار کرنے میں سب کی مدد بھی کرتے تھے۔

آفیسرس کو روز شام ایک گھنٹہ ساتھ مل کر کھیلنے یا ورزش وغیرہ کرنے کی اجازت بھی تھی۔ اس کے لیے ایئر فورس کے افسر بری فوج کے افسروں کے احاطے میں لے جائے جاتے تھے، کیوں کہ والی بال کورٹ وغیرہ کا انتظام اسی احاطے میں تھا۔ یہ وقت کھیلنے کودنے کے علاوہ نئی پرانی باتوں پر تبصرے اور ہنسی مذاق کے لیے بھی موزوں ہوا کرتا تھا۔ 27 نومبر 1972 کی شام ہمیشہ

کی طرح جب سارے لوگ اکٹھا ہوئے تو فوج کے ایک کیپٹن نے کہا، ''یہاں آتے وقت آپ لوگوں نے کمپاؤنڈ کے باہر کی طرف چل رہی صفائی مہم کا کچھ جائزہ لیا یا نہیں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، بیسیوں لوگ صفائی ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ گھاس وغیرہ بھی کاٹی جا رہی ہے،'' برٹی نے کہا۔

''اس جیل میں رہتے ہوئے تقریباً ایک برس گذرنے والے ہیں لیکن اس معیار کی صفائی پہلی بار دکھائی دے رہی ہے،'' کیپٹن نے پھر کہا۔

اگلے دو دنوں تک سینکڑوں لوگ جیل کی صفائی میں لگے رہے۔ تیس نومبر کی شام سڑک کی دونوں جانب چونے کا پاؤڈر ڈالا جا رہا تھا۔ جس سے واضح ہو گیا کہ اس جیل میں کوئی انتہائی مخصوص مہمان آنے والا ہے۔ منوہر کو کچھ زیادہ ہی تجسس تھا کہ آخر آنے والا کون ہو سکتا ہے؟ جیل انتظامیہ کے ''محور'' سمجھے جانے والے صوبیدار میجر راستے میں کھڑے دکھائی دیے تو منوہر نے پوچھ ہی لیا، ''جنرل صاحب آ رہے ہیں کیا؟''

صوبیدار میجر کچھ ٹھہر کر بولے، ''دیکھیے کون آتا ہے۔''

''جنرل ورنل نہیں بلکہ اور کوئی عظیم شخصیت آنے والی ہے،'' منوہر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

ملند نے تھوڑا آگے بڑھ کر سڑک کے کنارے جھاڑو لگاتے ایک ملازم سے سیدھے سیدھے ہی کہا۔ ''کیوں بھئی تو بھٹو صاحب کے لیے تیاریاں چل رہی ہیں۔''

''ہاں جی! کل صبح تک کا وقت اور ہے۔'' اس طرح ایک ملازم نے سیدھے سیدھے ساری گتھی سلجھا کر رکھ دی۔

اس روز کسی طرح کا کھیل کود نہیں ہوا۔ سب آپس میں بیٹھ کر بھٹو کی آمد کے سلسلے میں گفتگو کرتے رہے۔ بھٹو کی شخصیت اور ان کی سیاسی پینترے بازیوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اس لیے سب کی مشترکہ رائے یہی تھی کہ بھٹو صرف ہندوستانی قیدیوں کی وجہ سے ہی وہاں آ رہے ہیں۔ یا تو ان کا حال احوال جانیں گے یا تمام قیدیوں کے ساتھ تصویریں کھینچوا کر ساری دنیا کے سامنے پاکستان کی انسانیت نوازی کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ نہیں تو کسی قسم کا اعلان کر کے ہندوستان کو نیچا

دکھانے کی کوشش کریں گے۔

''ہم لوگ گھر واپس جا رہے ہیں،'' منوہر نے سوچتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ہاں،'' گیری بھی فوراً بولے،'' بھٹو صاحب کے یہاں آنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ وہ ہمیں جیل سے رہائی بخش کر ہندوستان روانہ کریں گے اور اپنے قیدیوں کی رہائی نہ ہونے پر ہندوستان کی سنگدلی اور بے رحمی ساری دنیا کے سامنے اجاگر کریں گے۔''

پاکستان میں رہتے ہوئے وہاں کے سارے موسم ہندوستانی قیدی دیکھ چکے تھے۔ وہ دسمبر کے کڑاکے جاڑے میں وہاں پہنچے تھے۔ موسمِ بہار میں انار کے پودوں پر آتی ہوئی نئی پتیاں اور کونپلیں دیکھ چکے تھے۔ گرمی کے موسم کی آندھیاں اور طوفان بھی جھیل چکے تھے۔ برسات کی پھواریں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا لطف بھی اٹھا چکے تھے اور اس وقت پھر بڑھتی ہوئی ٹھنڈ کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ پچھلے جاڑے کے بعد سارے قیدیوں نے اپنی جرسیاں، جن کی پیٹھ پر، پی۔ او۔ ڈبلیو۔ یعنی پرزنر آف وار لکھا ہوا تھا، اس طرح اتار پھینکی تھیں کہ جیسے اب دوبارہ انھیں چھونے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ آج انھیں پھینکی ہوئی جرسیوں کو دوبارہ پہننے کی مجبوری نے قید کی تمام لاچاریوں اور نا امیدیوں کو پھر سے اجاگر کر دیا تھا۔ ساتھ ہی دشمن کی جیل میں بلاوجہ اتنے دنوں سے قید میں رہنے کے جواز پر لگاتار جاری بحث نے ناگواری اور جھنجھلاہٹ پیدا کر دی تھی۔

''لگتا ہے کہ ہم جنگی قیدیوں کو ہندوستان پاکستان نے شطرنج کا مہرہ بنا رکھا ہے،'' ہیری نے مایوسی سے کہا۔ پاکستان کے اخبارات میں روزانہ ہندوستان میں قیدی ان کے تقریباً ایک لاکھ فوجیوں کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر ضرور شائع ہوتی ہے۔ ٹی۔ وی۔ پر بھی اکثر ہی کچھ نہ کچھ تذکرے یا بحث مباحثے دیکھنے کو مل جایا کرتے ہیں۔ ان قیدیوں کو لے کر ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان پتہ نہیں کیسی کیسی شاطرانہ پالیسیاں اختیار کی جا رہی ہیں۔ قیدیوں کا غصہ اس وجہ سے بڑھ رہا تھا کہ وہ تو اپنا کام کر چکے، زخم کھا چکے جانیں گنوا چکے اور یہ سیاسی لوگ ہیں کہ اپنے دوسرے حساب برابر کرنے کی فکر میں ہم قیدیوں کے احساسات و جذبات کو نظر انداز کر کے ان کو ان کے اپنوں سے دور رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔

''بنگلہ دیش میں قید پاکستانی فوجیوں کی بات تو سارے لوگ کرتے ہیں لیکن مغربی

مورچے کے قیدیوں کا کہیں کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا۔'' ایک دن آدتیہ نے اخبار پڑھتے پڑھتے کہا۔

''کیا مشرقی اور مغربی مورچے کی قیدیوں میں کوئی فرق ہے؟'' منوہر نے پوچھا۔'' آخر جنگ تو ایک ہی تھی۔''

''نہیں،'' پری نے رائے ظاہر کی۔'' پورب میں بنگلہ دیش اور بھارت نے مل کر پاکستانی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ جبکہ پچھم میں ہندوستان پاکستان کے درمیان سیدھے جنگ ہوئی تھی۔ اس لیے اس طرف کے قیدیوں پر بنگلہ دیش کا حق بھی بنتا ہے۔''

''اگر یہ سچ ہے تو پچھمی مورچے کے قیدیوں کا تبادلہ یا ادلا بدلی فوراً ہو جانی چاہیے تھی۔ ہندوستان نے ہمارے مسائل کو بنگلہ دیش کے قیدیوں کے ساتھ کیسے جڑ جانے دیا؟'' گیری نے کہا۔

''نہیں گیری یہ اتنا آسان معاملہ نہیں ہے،'' ملند بولا۔'' ان کے ایک لاکھ قیدی ہماری مٹھی میں ہیں۔ اندرا جی اس کی اہمیت سمجھتی ہیں۔ وہ ضرور ان کا استعمال کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کریں گی۔ 1948 اور 1965 کی جنگوں میں یہی غلطی ہوئی تھی کشمیر کا معاملہ ہم لوگوں کی لچر پالیسی کی وجہ سے نہیں سلجھ پایا تھا۔ اب وہ ایسی غلطی نہیں کریں گی۔ میری سمجھ سے وہ ہم لوگوں کا ذکر اس لیے نہیں کر رہی ہیں، کیوں کہ وہ اپنی طرف سے اپنی کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتیں اور اگر اس طرح کشمیر کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو ہمارا یہاں پڑے رہنا بے سود نہیں جائے گا۔''

ملند کے خیالات سے متفق ہو کر ہندوستانی قیدی اپنے ملک کے نصب العین کی خاطر جیل کی تکلیفیں خوشی خوشی جھیلتے رہے۔ دونوں ممالک کے درمیان ان بن کا ظاہری مدعا کشمیر ہی تھا۔ حالانکہ اس کے پیچھے کی ان دیکھی وجوہات کی جڑیں بہت ہی گہری اور وسیع تھیں۔ پچھلے پچیس برسوں میں کشمیر کو سامنے رکھ کر تین دھماکہ خیز جنگی ہو چکی ہیں۔ اس مسئلے کو ٹھکانے لگانے کا موقع اب آ گیا تھا۔ اس وقت ہندوستانی فوجی اندرا گاندھی کی رہنمائی کے تئیں عقیدت اور احترام سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے طریقۂ کار کی بھرپور تعریف اور تحسین ہو رہی تھی۔ ان کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سارے فوجی جانیں تک قربان کر دینے کے لیے تیار رہتے تھے اور اس وقت بھی ذہنی طور پر ہر ممکن مدد دینے کو ہر فوجی کمر بستہ تھے۔

مارچ کے مہینے میں اسلام آباد کے قریب ہی پہاڑوں پر بسے شہر ''مری'' میں ہندوستان

پاکستان کے درمیان جنگ کے بعد پہلی گفتگو ہوئی۔جیل میں سنائی دینے والی خبروں سے لگتا تھا کہ شاید قیدیوں کی رہائی اول مدعا ہوگی، کیوں کہ اس پر اتفاق کرنے سے خیالات میں ہم آہنگی بڑھے گی جو دوسرے سنجیدہ مسائل حل کرنے میں مددگار ومعاون ثابت ہوگی۔ پھر خبر آئی کہ بات چیت میں ایک تکنیکی مدعا پھنس گیا ہے۔قیدیوں کا تبادلہ اور ایک دوسرے کے علاقوں سے فوجوں کی واپسی جنگ بندی کے بعد بھی کی جاسکتی ہے؟ یا صرف جنگ کے بعد معاہدے یا مصالحت پر دستخط کے بعد ہی؟ مطلب امن کا قیام کب عمل میں لایا جاتا ہے مورچے پر فائرنگ رکنے کے فوراً بعد یا امن کے معاہدے پر دستخط کے بعد؟ اور اگر صرف معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد، تو دستخط کون کرے گا؟ صرف بھارت اور پاکستان یا بنگلہ دیش بھی؟ مدعا اصل میں یہی تھا بنگلہ دیش کی منظوری کا۔ ہندوستان کی ڈپلومیسی اور ساری خارجہ پالیسی اس وقت تمام ممالک اور خاص طور سے پاکستان سے بنگلہ دیش کومنظوری دلانے پر ہی مرکوز دکھائی دے رہی تھی۔

''جنگ کی اصل وجہ پر تو بات ہو ہی نہیں رہی ہے،'' گیری نے کہا۔

''کیسے؟'' منوہر بولے۔'' یہ تو بنگلہ دیش کی لڑائی تھی۔اسی کی تو بات ہو رہی ہے۔''

''مگر یار بنگلہ دیش تو اب پاکستان کا دردِ سر ہے۔پاکستان اس پر خوب باتیں کر رہا ہے۔ ہمارا مسئلہ تو کشمیر ہے لیکن اس کا ذکر سننے میں نہیں آتا۔'' گیری نے واضح کیا۔

''ہاں ہے تو عجیب بات،'' کیمی بولے۔'' ہمارے ملک کے سفیر محترم، اندراجی کے خاص الخاص مشیر، اعلیٰ حکام اور ماہرین کے قافلے کے ساتھ تشریف لائے ہیں اور بات کر رہے ہیں صرف بنگلہ دیش کی قبولیت کی۔ ہمیں تو بنگالیوں کو آزاد کرانا تھا ہم کرا چکے۔اب یہ پاکستان جانے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ہم اپنا وقت اور طاقت اس مسئلے پر بیکار میں کیوں خرچ کر رہے ہیں؟ ہمارا تو صرف ایک مقصد ہونا چاہیے'' کشمیر مسئلے کا آخری اور قابلِ قبول حل۔'' ہم کو تو صرف اسی ایک مسئلے پر ہی بات چیت کرنی چاہیے۔''

''ایسی بحث وتکرار سے ہمارا کیا مطلب؟'' برٹی نے کہا۔'' ہم نے میدانِ جنگ میں اپنے فرائض نبھائے، ملک کے لیے اتنی بڑی جیت حاصل کی۔اب سیاست اور ڈپلومیسی کے میدان میں ہم فوجیوں کو جھونکنا کہاں تک صحیح ہے؟''

کچھ اسی طرح کی بات چیت اور بحث و تکرار ان پاکستانیوں کا بھی مقدر بن چکی تھی جن کے لاڈلے اس وقت ہندوستان کی کسی جیل میں قید تھے۔ وہ بھی اپنے ہاتھوں میں کچھ اسی طرح کے سوالات کا کشکول اٹھائے گلی گلی بھٹک رہے تھے اور جواب نہ ملنے پر ہماری ہی طرح لاچار اور دکھی تھے۔

ایسے خیالات ہندوستانی قیدیوں کے حوصلے اور ان کے صبر و استقلال کے لیے ٹھیک نہیں تھے۔ بلکہ بہت ہی نقصان دہ تھے۔ اگر ایک فوجی سے ملک کے لیے پوری طرح خودسپردگی کی امید کی جاتی ہے تو ایک فوجی بھی اپنے ہم وطنوں سے امید کرنے کا حقدار ہے کہ اس کے ملک کے لوگ آفت کی اس گھڑی میں اس کے بارے میں سوچیں گے۔ اسے یاد رکھیں گے اور ہر غیر ضروری پریشانی، مصیبت اور ایذا رسانی سے اسے بچانے کی فوراً کوشش کریں گے۔ ان کو معلوم تھا انھوں نے پڑھ رکھا تھا کہ امریکہ نے کتنی سنجیدگی سے اپنے فوجیوں کی لاشیں کوریا کے قبرستانوں سے کس طرح کھود کر ان کے وارثین کے حوالے کی تھیں۔ لاپتہ فوجیوں کو ڈھونڈنے کے لیے ایک مخصوص تنظیم عمل پیرا رہا کرتی تھی۔ انیس سو سرسٹھ کی لڑائی کے بعد اسرائیل نے سب سے پہلے عرب ممالک سے اپنے قیدیوں کی فہرست طلب کی تھی۔ قیدیوں کا تبادلہ سب سے پہلی اوّلیت تھی دوسرے معاملات بعد میں۔ شاید امریکہ اور اسرائیل جیسے ممالک میں تربیت یافتہ، حوصلہ مند اور تجربہ کار فوجی قوم اور ملک کی خاص امانت سمجھے جاتے ہیں۔

جنھیں مفاد عامہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے سنبھال کر اور جسم و روح سے صحت مند رکھنا بہت ہی ضروری ہوتا ہے، اور شاید ملک میں تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ ماہرین اور گنوار، سب کی اتنی زیادتی ہوتی ہے کہ دو چار ہزار یا دس پانچ لاکھ ادھر ادھر پڑے رہیں یا مر کھپ جائیں تو دیش کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غصے اور لاچاری سے عاجز، لیکن دشمنوں کے درمیان چہرے پر شکن نہ لانے کی ضرورت سے بندھے ہندوستانی قیدی اندرا گاندھی اور بھٹو کے بیچ ''شملہ بات چیت'' کے انتظار میں دن کاٹتے رہے۔ گفتگو بڑی دھوم دھام سے شروع ہوئی لیکن دوسرے دن لگنے لگا کہ کسی طرح کا سمجھوتہ شاید ہی ہو پائے۔ یہ میٹنگ تیسرے دن بھی جاری رہی لیکن کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ہی ختم ہوگئی۔ شام کو اچانک دونوں لیڈر ایک ساتھ ٹہلنے نکلے۔ واپسی پر ان کے مسکراتے ہوئے چہرے دیکھ

کر ظاہر ہو گیا یہ چوٹی کے معیار کی گفتگو ناکام ہونے سے بچ گئی تھی۔ اخبار والوں سے کچھ نہیں کہا گیا۔ صرف آس پاس منڈراتے ہوئے کیمرے والوں کو اپنے فلش چمکانے کی چھوٹ تھی۔

دوسرے روز سمجھوتے کی تفصیل خبروں میں آنے لگی۔ جسے سنتے ہی کیمی غصے اور تناؤ سے کانپنے لگے۔ ''یہ کمبخت کیسا سمجھوتہ ہے؟ وہ چلائے ''ہم پاکستان کی پانچ ہزار مربع کلومیٹر جیتی ہوئی زمین واپس کر رہے ہیں۔'' بدلے میں؟ ہمیں کیا مل رہا ہے؟ اور ہم قیدیوں کا تو اس ''بلیٹن میں ذکر تک بھی نہیں ہے؟''

سبھی بری طرح ناامیدی کا شکار تھے۔ بھٹو کو جو کچھ چاہیے تھا وہ حاصل کر چکے تھے۔ سودا کرنے کے لیے بھارت کے پاس جو کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ سب اندرا گاندھی بھٹو کو سونپ چکی تھیں۔ بھٹو اپنی لفاظی سے کشمیر کے سلسلے میں صرف زبانی و غیر واضح وعدوں کے ساتھ مستقبل میں گفتگو سے آپسی اختلافات دور کرنے کا ارادہ ظاہر کر کے پاکستان کی زمین واپسی لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بھارت نے جو کچھ سال بھر میں جان و مال کی قیمت چکا کر حاصل کیا تھا وہ سب بھٹو نے صرف تین دن میں بے اثر کر دیا تھا۔

''ہے بھگوان!!'' ملند نے اپنا سر پکڑ کر کہا۔ ''کشمیر پر کوئی فیصلہ، کوئی سمجھوتہ ہی نہیں۔ صرف یقین دہانی کہ وہاں تشدد نہیں ہونے دیا جائے گا۔ سارے مسائل گفتگو سے حل کیے جائیں گے۔ ہر بار اتنا کچھ کھو کر ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے؟ گفتگو..... دلی میں گفتگو، اسلام آباد میں گفتگو، نیویارک میں گفتگو پھر جینیوا میں گفتگو..... گفتگو، گفتگو، گفتگو۔ روز ایک دوسرے پر گولی چلایئے، ہر دو چار برس میں جنگ کیجیے اگر کچھ دشمن سے جیت لیجیے تو اسے واپس کر دیجیے اور شروع کر لیجیے پھر ایک نئی گفتگو۔ 1948 میں آدھے کشمیر سے دشمن کو کھدیڑ کر اپنی فوجیں روک لیجیے۔ سب کچھ خلا میں چھوڑ دیجیے اور پھر دوڑتے رہیے نیویارک تک۔ اقوام متحدہ تک۔ کس لیے؟ گفتگو کے لیے اور وہ لمبے بالوں والا دبلا پتلا لمبا آدمی، ''ماہر گفتگو'' اقوام متحدہ میں تیرہ گھنٹے بولا تھا۔ پھر انیس سو پینسٹھ میں کشمیر کے سارے درّے پاکستان کے قبضے سے خالی کرا لیجیے، کشمیر میں دراندازی کا انتظام پختہ کر لیجیے، اور پھر پہنچیے تاشقند..... گفتگو کے لیے۔ سارے درّے اور راستے پاکستان کے قبضے سے واپس لینے کے لیے اور اس بار گفتگو ''مری'' میں، گفتگو شملہ میں۔ وہ سب کچھ واپس پانے کے لیے

جسے اپنے ہاتھ میں رکھ کر اس کمبخت گفتگو سے چھٹکارا مل گیا ہوتا۔ مگر ایک بار پھر، سارے عالم کی تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان، مضبوط ارادہ ظاہر کیجیے کہ سارے مسائل کا ایک ہی حل ہوا۔ گفتگو، گفتگو، گفتگو۔"

یہی ملند نے کہا، یہی سارے ہندوستانی افسروں نے کہا، یہی سارے فوجی جوانوں نے کہا۔ اتوار کو اس وقت جب وہ سب صبح کے وقت اجتماعی عبادت کے لیے اکٹھا ہوئے۔

"صاحب! کیا واقعی ہم لوگ شکر گڈھ پاکستان کو واپس دے رہے ہیں؟" ایک جوان نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ وہ جوان جو اس تاریخی جنگ میں شریک تھا اور جس نے اپنے مورچے پر اپنے کئی ہندوستانی ساتھیوں کو شہید ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اور بغیر کشمیر خالی کرائے؟" دوسرے جوان نے تعجب سے پوچھا۔ جو کشمیر کے مورچے پر لڑتا ہوا دشمن کی گرفت میں آ گیا تھا۔

"شملہ سمجھوتے میں ہماری واپسی کے بارے میں کچھ بھی نہیں ہے؟" ایک تیسرے جوان نے نہایت تعجب سے دریافت کیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کن مخصوص اور اہم پالیسیوں کے تحت اس کی شرکت و شمولیت کو بھلا دیا گیا اور اب دوسرے معاملات زیادہ اہم ہو چکے تھے۔ مگر دل ہی دل میں اسے لگ رہا تھا کہ یہ نئی پالیسی پچھلی تواریخ کی طرح اسے جلد ہی ایک دوسری جنگ یا دوسری بربادی کی طرف لے جائے گی۔

اسی طرح کے موضوعات پر بحث و تکرار جاری رہی۔ ہر فوجی کی ابتدائی تربیت سے ہی اسے واضح پالیسیوں اور مخصوص طریقۂ کار کے تحت کام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے سامنے جنگ کا مقصد بالکل واضح ہوتا ہے، یہاں تک کہ جنگ کے بعد کے انتظام کی تمہید بھی پہلے سے ہی طے ہوتی ہے۔ جس میں عوامی حاکموں کی سچائیوں اور ایماندارانہ مشوروں کی جھلک واضح ہوتی ہے۔ ساتھ ہی کبھی مقصد سے ادھر ادھر نہ ہونے والی مضبوط اور ٹس سے مس نہ ہونے والی قومی پالیسی شیشے کی طرح صاف ہوتی ہے۔ مگر قید میں پڑے لوگوں کو اب سوچنے اور غور کرنے کا موقع تھا۔ وقت تھا، اور جتنی گہرائی سے وہ دیکھتے تھے اتنی ہی زیادہ سیاسی ڈھیل ڈھال و غیر یقینی اور ملٹری کی بدانتظامی چاروں طرف دکھائی دیتی تھی۔

''پاکستان سے تین اور چین سے ایک جنگ کر کے آخر ہم نے کیا حاصل کیا؟'' ایک افسر نے پوچھا۔

''پورے ایک سال سے ہم اپنی پالیسی، اپنے مقاصد واضح کرنے اور لڑائی کے ذریعے ان کی حصولیابی کے لیے کام کر رہے تھے۔ پھر بھی اگر ہم کشمیر کے مسئلے کا کوئی قابلِ حل نہ نکال سکے تو شاید یہ لڑائی بھی بیکار گئی،'' دوسرے نے کہا۔

''ہمالہ کے اس طرف ہم سب طاقت ور ملک ہیں۔ آس پاس کے چھوٹے موٹے ممالک کو یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہیے۔ ہم کو اسی طرح عزت ملنی چاہیے۔ ہاں ہمارا رویہ ضرور نرم ہونا چاہیے۔ مگر اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ چھوٹ بھیے بھی ہمیں نظر انداز کرنے لگیں، اور ہمیشہ ہمارے لیے کانٹا بنے رہیں،'' تیسرے نے کہا۔

''اور پاکستان ہمارے پانچویں حصے کے برابر وصلاحیت میں ایک بے بچاس۔ پھر بھی ہماری خارجہ پالیسی کا خاص اور اہم مرکز۔ ہماری گردن میں لٹکا ایک پتھر۔ افسوس یہ ہے کہ ہم اسے پچیس برسوں میں بھی اتار کر الگ نہیں کر سکے ہیں۔ عجیب طرح کی حساسیت اور بلاوجہ کی ہمدردیوں کی ہتھکڑی ہم نے خود اپنے ہاتھوں میں ڈالی ہوئی ہے جو ہمیں کچھ بھی تہس نہس کرنے سے روک لیتی ہے،'' یہ کسی اور افسر نے کہا۔

وکرم سوچنے لگا کہ ہندوستانی دماغ میں، بلکہ ہندو میجارٹی میں ایک عجیب دوہرا بٹوارہ سا تھا، پچاس سال تک ہم ایک قوم ایک ملک کا نعرہ دیتے رہے۔ بعد میں صرف دس فیصدی لوگوں کو دو قوم اور دو ملک قائم کرنے سے نہیں روک پائے۔ گاندھی نے جناح کو اپنے ساتھ کانگریس میں رہنے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ بعد میں بٹوارے سے بچنے کے لیے جناح کو پورے ہندوستان کا وزیر اعظم بننے کی دعوت دینے لگے۔ وہ بٹوارے کے ذریعے دو ملکوں، دو فوجوں، دو روایتوں، دو گروہوں، دو اصولوں اور دو دشمنوں کے قیام کے لیے خاموش رضامندی تو دے ہی چکے تھے۔ مگر پھر بغیر کسی حساب کتاب، بغیر ایک دوسرے کی ملکیت کی تفصیلات حاصل کیے پاکستان کو ہندوستان سے کروڑوں روپے دلانے کے لیے بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔ 1948 میں جس وقت بھارت کی فوجیں پاکستانیوں کو پورے کشمیر سے بھگانے میں کامیاب ہو رہی تھیں۔

جواہرلال نہرو یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کر بیٹھے اور رواداریوں کے پہاڑ پر چڑھ کر اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی شرارتیں عیاں کرنے کے لیے کود پڑے۔ اس کے جو بھی نتیجے سامنے آئے آج بھی ہمارے گلے کی ہڈی بنے ہوئے ہیں۔ انیس سو پینسٹھ کی جنگی کامیابیاں تاشقند میں گنوادیں، انیس سو اکہتر کی شملہ میں۔ جو جیت کے بعد بھی اپنے فائدے کی اہمیت نہ سمجھ سکا ہو اور نہ ہی دشمن کے لیے کوئی واضح پالیسی مقرر کر سکا ہو، ایسے ہندوستان کی جھولی میں جب اس کی فوجوں نے اتنی بڑی جیت لا کر ڈال دی ہو تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس جیت کا کیا کریں۔ جیسے لاٹری سے جیتی ہوئی رقم آدمی دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہے۔ ہندوستانی رہنماؤں نے سب کے بارے میں سوچا، سب کو بہت کچھ دیا، صرف اپنے ہی فائدے کی ہمیشہ اَن دیکھی کر دی۔

''بڑی ہی عجیب ذہنیت ہے ہماری،'' کیمی نے دکھی من سے کہا۔ ''انھوں نے مادرِ وطن کے ٹکڑے کروائے۔ خود ہی کئی بار ہم پر چڑھائی کی اور ہر بار ہم نے ایک آدھ چانٹے لگا کر انھیں بخش دیا۔ دراصل ہمیں ہر طرح سے ان پر شکنجہ کسنا چاہیے۔ ملٹری کی طاقت سے، دھماکہ خیزی سے، پوشیدہ طریقۂ کار سے، سیاست سے، ڈپلومیسی سے، اقتصادیات سے، اسلام سے، عیسائیت سے، افغانوں کو اسرائیلیوں کے ذریعہ، روس اور امریکہ کی طرف سے، اس کے علاوہ ہر ممکن طریقہ سے، مگر کیا کیا جائے ...... ہر لڑائی، ہر مقابلے کے بعد ہمارے ''ونوبا بھاوے'' ہمارے ''جے پرکاش'' اور ان کے سیکڑوں عقیدت مند، بھائی چارہ، عدم تشدد، رواداری، بڑکپن اور ''سارا عالم ایک خاندان'' جیسے گیت الاپنا شروع کر دیتے ہیں، سرحدوں پر اخوت اور دوستی کا چراغاں کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف کی مضحکہ خیز خاموشی اور اندھیرے کو نہیں دیکھتے۔''

''یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن آخر میں ملک کی اپنی طاقت کا کوئی بدل نہیں ہے۔ کوئی بھی پالیسی کوئی بھی سیاسی پینترے بازی، ملک کی اقتصادی اور فوجی طاقت کی جگہ نہیں لے سکتی۔ ہم میں اتنی صلاحیت ہونی چاہیے کہ اگر کوئی آنکھ دکھائے تو ہم اس کی آنکھیں نکال سکیں، دنیا اور کچھ نہیں سمجھتی،'' ملند نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''اور گڑبڑ معلوم ہے کہاں ہوتی ہے؟'' ملند نے سوال اٹھاتے ہوئے اپنی گفتگو آگے بڑھائی، ''گڑبڑ اس سے ہے کہ ہم پاکستان کو صرف کسی اور ملک کی طرح نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک

مسلم ملک مان کر چلتے ہیں، ہم خود ہی مذہب اور سیاست کو الگ الگ نہیں کر پاتے۔ پاکستان سے چین یا سری لنکا جیسا برتاؤ کرنے کے بجائے ہم اپنے ملک کے مسلمانوں کی طرف مڑ کر دیکھنے لگتے ہیں کہ ہماری پاکستانی پالیسی ان پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ گڑبڑ اسی سے ہوتی ہے۔ ہمیں یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ ہندوستان کے مسلمان بھی ہندوستانی ہیں اور ہمارے اپنے ہیں، اس کے علاوہ جب جب پاکستان سے ہمارا مقابلہ ہوا ہے وہ ہمیشہ ہمارے شانہ بشانہ رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔''

''ایک گڑبڑ شاید اور......'' منوہر نے کہا۔'' ہم اپنے دشمن کو سمجھنے میں بھی ہمیشہ غلطیاں کرتے ہیں۔ جو ذاتی طور سے اتنے مہذب اور خوش اخلاق لیکن اجتماعی طور سے کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ اسی لیے اگر کوئی ان بن ہے تو ہماری طرف سے کسی طرح کی حیلہ حوالی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں دشمن کے ساتھ ہر طریقے سے سختی برتنی چاہیے۔''

ایسا نہیں تھا کہ یہ پائلٹس اپنی عام زندگی میں ملک کی پالیسیوں اور سیاسی غلطیوں پر زیادہ دھیان دے رہے تھے بلکہ ایسا کرنے میں نہ تو ان کی کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی ان کے لیے ان کے پاس وقت ہوتا تھا۔ لیکن آج یہ نوجوان اور ذہین آفیسرس ایسے الگ الگ حالات میں جی رہے تھے کہ ان کے پاس وقت بھی تھا اور سوچنے کے لیے اس قدر اہم مسائل بھی۔ اس لیے اس طرح کی گفتگو اور بحث و تکرار چلتی ہی رہتی تھی۔

ایسے موضوعات پر مستقل غور و فکر سے اکثر جوان ناامیدی اور پژمردگی میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ بار بار ایک ہی نکتے پر پاکستان سے جنگ کرنا اور بار بار اپنی کامیابیوں کو گنوا دینا۔ اتنی قیمت پر یا اتنی قربانیوں کے بدلے میں پائی گئی کامیابیوں کو ادھورے میں چھوڑ دینا۔ کبھی منزل تک نہ لے جانا اور آخر میں حاصل کچھ نہیں، نہ ملک کے لیے، نہ فوجوں کی عزت نفس کے لیے اور لڑائیوں کے بیچ کا نام نہاد وقفۂ امن......؟ لیکن حقیقت میں اور بھی افراتفری کا وقت، تناؤ اور پریشانیوں کا وقت، غیر یقینی اور فقدان کا وقت۔ نہ کوئی تسلی بخش گھریلو زندگی، نہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر دھیان، آج آسام تو کل کشمیر، باڑھ، سوکھا، زلزلے، دہشت گردی، ریل حادثات، یہ آفت وہ آفت آج یہاں تو کل کہیں۔

لیکن سب منظور، سب کچھ سر آنکھوں پر قوم و ملک کی بھلائی کے لیے۔

دوسری طرف اقتدار کی چوٹی پر بیٹھے لوگوں کی طرف سے لعنت اور بے اعتنائی، کم سے کم تنخواہ اور زیادہ سے زیادہ بے عزتی، کبھی کبھی چھوٹی موٹی رعایتیں اور دوسرے طبقوں کی گھٹن یہ وردی پوش دماغ سے بونے مہذب ہونے کا دکھاوا کرنے والے ایسا اکڑ کر چلتے ہیں جیسے انگریزوں کے زمانے کے ہوں...... سرحدوں کی حفاظت پر مامور رہنے والے یہ فوجی ملک کے نظم وضبط میں دخل اندازی کا حق چاہیں، مینی فیسٹو کی ترتیب و تالیف میں حصہ داری چاہیں؟ برٹش حکومت کے اصلی وارث، اسٹیل فریم کہلانے والے حاکموں کی برابری چاہیں؟ ان سے جو اتنی محنت اور مہارت سے اپنی طاقت اور صلاحیت کا استعمال کرتے ہوئے اپنی ذمے داریوں سے اپنے آپ کو پوری طرح الگ کرتے ہوئے ملک کو بدانتظامی اور بغاوت کی طرف دھکیلنے میں اس قدر مصروف ہوں......؟

یہ منظور نہیں...... نہیں؟ تو بھاڑ میں جاؤ۔

اور اب ذوالفقار علی بھٹو کی آمد۔ یکم دسمبر 1972 صبح نو بجے۔

سارے ہندوستانی قیدی ایک احاطے میں لائے گئے۔ شامیانوں سے سجا ہوا احاطہ جس کے ایک طرف وسیع اسٹیج بنایا گیا تھا۔ میز پر پاکستان کے قومی جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ مائک اور لاؤڈ اسپیکر ایک بڑے لیڈر کی تقریر کے انتظام کی گواہی دے رہے تھے۔ ہندوستانی جوان دریوں پر بیٹھے تھے جب کہ آفیسرس ان کے پیچھے کرسیوں پر۔

ہیلی کاپٹروں کی گڑگڑاہٹ—ایک دو تین چار— آس پاس ہی کہیں بند ہوتے ہوئے انجن اور پھر موٹروں کی قریب آتی ہوئی آوازیں— کچھ لمحوں میں قافلہ آن پہنچا۔

معزز مہمان کے آتے ہی سبھی کھڑے ہو کر استقبال کریں گے۔ خالص فوجی انداز میں پہلے سے بتایا گیا۔

اس مشورے کی کیا ضرورت تھی۔ ہندوستانی قیدی سوچنے لگے۔ آخر بھٹو ایک ملک کے سب سے بڑے لیڈر ہیں، وہ کس قدر لائق احترام ہیں یہ کوئی بتانے کی چیز تو ہے نہیں۔

کیمرہ لیے بہت سارے لوگ مختلف ٹی وی چینلوں، دیسی بدیسی اخبارات کے نمائندے،

الٹا چلتے ہوئے کیمرہ مین مڑ مڑ کر ہندوستانی قیدیوں کو اپنی فلموں میں قید کر کے بار بار بھٹو کے قافلے کی طرف پلٹتے ہوئے۔

بھٹو شامیانے میں داخل ہوتے ہوئے سیدھے اسٹیج پر پہنچے اور بالکل درمیان میں کھڑے ہو گئے۔ کوئی تعارف نہیں، کوئی تمہیدی تقریر نہیں، بھٹو بھٹو تھے، بھٹو اور محتاج تعارف؟

''میں اپنے سامنے بیٹھے ہندوستان کی جنگی قیدیوں کو دیکھ رہا ہوں،'' بھٹو نے بولنا شروع کیا۔'' بھارت کے ان بہادر اور جانباز فوجیوں کو دیکھ رہا ہوں جو اتنے دنوں سے اپنے عزیز و اقارب سے دور بلاوجہ پاکستان میں پڑے ہوئے ہیں، لگتا ہے ان کے ملک کے حکمرانوں کو ان کی فکر ہی نہیں ہے۔ انھیں ان کے والدین اہل و عیال اور عزیز و اقارب تک پہنچانے کی کوئی منشا ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں آپسی مسائل سلجھانے میں ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔''

کیمرے بھٹو سے ہوتے ہوئے ہندوستانی قیدیوں پر اور پھر قیدیوں سے ہوتے ہوئے واپس بھٹو پر مرکوز ہوتے رہے۔ پاکستانی افسران ہندوستانی جوانوں اور افسروں کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب آپ کو رہا کرنے والے ہیں آج ہی...... ابھی۔ لہٰذا زور سے تالیاں بجائیے گا اور شور مچا کر ان کا شکریہ ادا کیجیے گا۔

وکرم کے بھی کانوں تک اس طرح کے کچھ جملے پہنچے۔ اس نے فوراً اپنے افسروں کو صرف تالیاں بجانے سے ہی نہیں باز رکھا بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ ''سب کو بتا دیں کہ ہماری طرف سے کسی طرح کی ہنسی خوشی کا اظہار قطعی نہ کیا جائے۔'' دراصل وکرم چاہتا تھا کہ ہندوستانیوں کی طرف سے ایسی کوئی نمائش یا ڈرامے بازی نہ ہو جس سے کل ساری دنیا کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ'' ہندوستانی بھٹو کے پھینکے ہوئے ایک معمولی سے ٹکڑے پر کس طرح لپک رہے ہیں۔''

''ہمیں افسوس ہے کہ ہمارا پڑوسی ملک انسانی جذبات سے کس طرح چشم پوشی کر رہا ہے۔ اسے ان ماؤں کی کوئی فکر نہیں جو اپنے فوجی جانبازوں اور لاڈلوں کو اپنے سینے سے لگانا چاہتی ہیں۔ ان معصوم بچوں کا خیال نہیں جو اپنے باپ کی پیٹھ پر بیٹھ کر سواری کرنا چاہتے ہیں۔ انسانی اخلاقیات کو درکنار کر کے بھارت آج بھی ہمارے ملک کی جنگی قیدیوں کی رہائی پر تیار ہونا تو دور ــــ اس پر کوئی بات تک نہیں کرتا۔ آخر یہ کتنا غلط اور غیر انصافی رویہ ہے......؟''

''مگر ہم پاکستانی بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ اللہ نے ہمیں شفقتوں اور انسانی دردمندیوں سے بھرپور نوازا ہے۔ ہمارے اسلاف نے ہمیشہ اخلاقیات کی تاریخ مرتب کی ہے۔ ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم ایسی ناانصافی ایسے ظلم و جبر اور حیوانیت کے کام ہرگز نہیں کر سکتے ـــــ اس لیے میں ـــــ ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان اپنے ملک کی طرف سے، ایک رحم دل ملت کی طرف سے، تمام ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بچوں کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان آپ تمام ہندوستانیوں قیدیوں کو رہا کرتا ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔'' اتنا کہہ کر بھٹو لمحہ بھر کے لیے رکے، لیکن سامنے سے نہ ہی تالیاں بجائی گئیں اور نہ ہی کسی اور طریقے سے خوشی کا اظہار کیا گیا۔ پورے ماحول پر صرف سائیں سائیں کرتے ہوئے سناٹے کی ہی حکومت تھی۔ اپنی گفتگو پوری کرنے کے لیے بھٹو نے پھر بولنا شروع کیا ـــــ '' آپ کی واپسی کے سارے انتظامات کر دیے گئے ہیں۔ کل صبح تک آپ لوگ اپنوں میں ہوں گے۔ ہندوستان ہمارے جنگی قیدیوں کو رہا کرے نہ کرے، ہم آپ کے ساتھ ایسا ظلم نہیں کر سکتے۔ جائیے! اور اپنے ملک جا کر برسرِ اقتدار حکمرانوں سے کہیے کہ وہ ہمارے جنگی قیدیوں کو فوراً واپس بھیج کر اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیں۔''

یہ اور اسی طرح کی اور بھی بہت سی باتیں۔ پاکستان کی رواداری ایک طرف ہندوستان کی بدعہدی دوسری طرف۔ کیوں کہ اس رواداری کے ظاہر ہونے میں پورا ایک برس لگ گیا تھا۔ اس لیے ہندوستانیوں کو بھٹو کے لفظوں کے پیچھے چھپے معنی و مفہوم سمجھنا بھی ضروری تھا۔

''ہمیں رہا کرنا بھٹو کی اخلاقی بلندی نہیں بلکہ ان کی ضرورت ہے، ان کی مجبوری ہے۔'' پرسی نے کہا۔ '' تالیاں بجانے اور شکریہ ادا کرنے سے ہم اور جلد گھر نہیں پہنچ جائیں گے۔''

''ہاں گھر تو پہنچنا ہی ہے مگر تھوڑی شرمندگی کے ساتھ،'' ملند نے کہا، '' ہماری واپسی کا اعلان اندرا جی کو کرنا چاہیے تھا نہ کہ بھٹو کو۔'' کیمی نے کہا، '' یہ واپسی واپسی نہیں جیسے بھٹو کو خیرات...........'' سنتا نے کہا۔ '' مجھے تو کسی قسم کی خوشی ہی نہیں ہے،'' برٹی نے کہا۔ '' جنگ جیتنے کے بعد بھی کس قدر رذالت کے ساتھ جا رہے ہیں،'' گیری نے کہا۔ '' ہم پاکستان گورنمنٹ کے رحم و کرم پر جا رہے ہیں۔ اپنی حکومت کے بلاوے پر نہیں،'' ہیری نے کہا۔ '' جو کچھ بھی ہو۔ سر اونچا کر کے نہیں جا رہے ہیں،'' منوہر نے لاچاری سے کہا۔ '' اگر اس فیصلے کی پہل '' مری '' یا '' شملہ ''

بات چیت میں ہماری حکومت کی طرف سے کی گئی ہوتی تو آج ہمیں فخر ہوتا۔ خوشی ہوتی، حوصلہ ہوتا...... ملال تو اس بات کا ہے کہ جن لوگوں اتنی بڑی فتح ملک کے سپرد کی انھیں لوگوں کو آفت اور مصیبت سے نکالنے کی پہل ان کے ملک کی طرف سے نہیں ہوئی، گھٹن تو اسی بات کی تھی کہ رہائی کی شروعات دشمن کی طرف سے ہوئی اور تو اور آج وہ ساری دنیا کے سامنے اپنے ہی ہاتھوں اپنی پیٹھ تھپتھپا کر ہندوستان کو نیچا بھی دکھا رہا ہے۔"

اپنے احاطے میں واپس آکر کچھ ایسے ہی خیالات میں لوگ ڈوبے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ملند نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا، "چلیے اب گھر چلنے کا وقت آگیا ہے۔ تھوڑے دن چھٹی پر رہیں گے۔ گھر والوں کے ساتھ ساتھ رشتے داروں ناطے داروں سے ملیں گے۔ کچھ دن دوستوں یاروں میں ہیرو بنے رہیں گے پھر...... پھر کیا؟"

"پھر کیا؟" کسی نے پوچھا اور خود ہی جواب دیا— "پھر اگلی جنگ کی تیاری شروع۔"

"ہاں ایک اور مقابلہ تو ہونا ہی ہے،" منوہر نے کہا۔ "بھٹو دو بار دھول چاٹ چکے ہیں۔ پچھلی دونوں جنگوں کے پیچھے انھیں کا ہاتھ تھا۔ یہ ضرور پھر سے حساب برابر کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"مگر کیا اب بھی یہ ہم سے لڑ سکتے ہیں؟" برٹی بولے۔ "پوربی پاکستان کا اب کوئی خطرہ رہا نہیں۔ چین سے رشتے سدھر ہی رہے ہیں۔ اب ہماری صلاحیتوں کے سامنے یہ بھلا کس طرح ٹک پائیں گے؟"

"یہ سب کچھ نہیں،" کسی نے کہا۔ "آپ ان کے افسروں کے چہروں پر ہار کی گھٹن پڑھ نہیں پا رہے ہیں۔ ان کے سینوں میں ہار کا صدمہ، غصہ اور بدلے کا احساس محسوس نہیں کر پا رہے ہیں۔ ان کی ہندوستان کو ریزہ ریزہ کر ڈالنے کی زبردست خواہش کا احساس آپ کو نہیں ہے۔ صرف وقت کی بات ہے۔ طریقے کچھ بھی اپنائے جائیں مگر پاکستان زیادہ دن سکون سے نہ بیٹھ سکے گا۔"

"ٹھیک ہے ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں،" گیری بولے۔ "مگر یہ ہے پاکستان کی سیاسی تصویر جس کے دوسری طرف ہیں یہاں کے عام آدمی۔ بہت زیادہ لوگوں سے تو ہم لوگ ملے نہیں۔ پھر بھی عام ملازم، ایئر مین، جوان سبھی کے دلوں میں ہندوستان سے اچھے تعلقات بنا کر رکھنے کی خواہش ضرور ہے۔ یہ تمام لوگ کسی طرح کا تناؤ یا لڑائی قطعی نہیں چاہتے۔"

"ارے چھوڑیے بھی! عام آدمی کی حیثیت ہی کیا ہے۔ عام آدمی کی حیثیت ہندوستانی جمہوریت میں نہیں ہے تو پاکستانی تاناشاہی میں کہاں سے ہوسکتی ہو؟ عام آدمی کی سنتا ہی کون ہے؟"

"کام تو سارے عام آدمی کی بھلائی، اس کی حفاظت اور اس کی بہتری کے لیے ہی کیے جاتے ہیں،" ملند نے کہا۔ "مگر بے چارے کو راستہ تو اور لوگ ہی دکھاتے ہیں۔ اس ملک کے مالکان سمجھتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد پر ہی پاکستان کی تعمیر ہوئی تھی، لہٰذا اسلام ہی اسے جوڑتوڑ کر سنبھال سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اس ملک کے سامنے کوئی آفت یا مصیبت آن کھڑی ہوتی ہے تو عوام کو اسی اسلام کی گھٹی پلائی جاتی ہے۔ جب جب یہاں کے اقتدار کی کرسی ہلنے لگتی ہے تب تب شریعت کے قانون اور سختی سے نافذ کیے جاتے ہیں۔ اور اب تو پاکستان خود کو ایشیا میں اسلام کا غازی سمجھنے لگا ہے۔ جب تک مذہب کو سیاست میں استعمال کر کے اقتدار میں بنے رہنے کی ذہنیت رہے گی۔ جب تک پاکستان میں زمیندار اور فوجی افسر مذہبی لوگوں کی مدد سے اقتدار پر قابض رہیں گے۔ ہندوستان کے ساتھ کسی بھی طرح کا سمجھوتہ ناممکن ہے۔ امن برقرار نہیں رہ سکتا۔"

تھوڑی دیر میں احاطے کا پھاٹک کھلا اور صوبے دار میجر اندر داخل ہوئے، "آج شام کا کھانا جلدی ہوگا۔ اس کے فوراً بعد آپ لوگ چلنے کے لیے تیار رہیں،" انھوں نے حکم سنایا۔

شام ہوتے ہی کھانا نپٹ گیا۔ سارے افسروں کو ٹرک میں سوار کر کے لائل پور ریلوے اسٹیشن لایا گیا۔ پلیٹ فارم پر سخت پہرے کے بیچ سبھی کو ایک ایک سیٹ دے کر ڈبے لاک کر دیے گئے۔ اپنی اپنی برتھ پر لیٹے ہوئے سبھی اپنے اپنے چاہنے والوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی چلی اور کچھ ہی گھنٹوں میں لاہور ہوتی ہوئی واگھا سرحد پہنچ گئی۔ صبح ہوتے ہی قیدیوں کو ٹرین سے اتار کر تھوڑے فاصلے پر ایک فوجی بیرک میں لے جایا گیا۔ جہاں فریش ہونے کے بعد سب نے ناشتہ کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سبھی دھوپ میں پڑی ہوئی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے اور اگلے پروگرام کا انتظار کرنے لگے۔

سبھی اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یاد آ رہا تھا یہ گذرا ہوا سال۔ بلکہ آزادی سے لے کر آج تک کے سارے ماہ و سال۔ تقسیم کے بعد کا سارا وقت تین زبردست جنگیں، مستقبل کی غیر یقینیاں، جمہوریت اور تاناشاہی، ذاتی آرزوئیں اور تمنائیں ساتھ ہی عوامی

پینترے بازیاں، کم ہوتی ہوئی نیک نیتی، ختم ہوتا ہوا اخلاق، بڑھتی ہوئی لالچ، ابھرتی ہوئی بے ایمانی اور پستی، کچھ نہیں بدلا، کچھ نہیں سنبھلا، نئی شیشیوں میں وہی پرانی دوائیں بس پلانے والوں کے ہاتھ بدلے ہیں۔ واپس اپنے ملک جا کر کیا پائیں گے؟ دو چار استقبالیہ تقریریں کچھ تالیاں، تعریف کے کچھ بے دم جملے ایک آدھ کپ ٹھنڈی چائے؟

ایک پاکستانی افسر نے کہا، "میرے ساتھ چلیے آپ لوگ۔" سب لوگ اٹھے اور ایک قطار میں چلنے لگے۔ کچھ ہی لمحوں میں سبھی دونوں ممالک کے درمیان "سرحد" پر پہنچ گئے۔ دو بڑے پھاٹک نظر آ رہے تھے۔ یہ فاصلہ بھی جلدی طے ہو گیا اور سبھی قید کے پھاٹک سے نکل کر آزادی کے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ سامنے زبردست بھیڑ اکٹھا تھی۔

بھارت ماں...... بھارت...... بھارتیہ

ساری بھیڑ خوشی اور امنگ سے بھری ہوئی تھی۔ سبھی ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے آنا چاہتے تھے تاکہ جنگی قید سے لوٹے جانباز فوجیوں کا استقبال کر سکیں۔ پولس والے اور دیگر وردی پوش سبھی کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ زوروں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ الفاظ صاف صاف تو نہیں سنائی دے رہے تھے لیکن ان کی روحانیت واضح تھی۔ برٹی سب سے آگے تھے۔ بھیڑ کے قریب پہنچتے ہی انھیں کھینچ کر ہاتھوں پر اٹھا لیا گیا۔ سب کو سب نے سینے سے لگایا، سبھی سب سے بغل گیر ہوئے۔ گویا کہ محبتوں کا ایک دریا تھا جس میں ابھرتی ہوئی موجوں کے ساتھ سب خوشی سے اچھل کود رہے تھے۔

بھارت........... بھارتیہ

پھول برسائے گئے اور ہار پہنائے گئے۔ بزرگوں نے سب کی پیشانیوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور دعائیں دیں، ہم عمروں نے ہاتھ ملائے۔

اپنا دیش...... اپنے ہم وطن...... اپنے بھائی...... اپنے دوست، ہم انھیں کے لیے تو لڑنے گئے تھے۔ یہ جانتے ہیں، انھیں یاد بھی ہے، ان کی محبت اور احسان مندی بتا رہی ہے کہ یہ ہماری قربانیوں سے کس قدر خوش ہیں۔

عمر رسیدہ خواتین آنکھوں میں آنسو بھرے نہایت شفقت سے اپنے سپاہیوں کے

سروں پر ہاتھ رکھ کر انھیں دعائیں دے رہی تھیں، شاید ان کے حصے کی بھی جو اس جنگ سے واپس نہیں لوٹ سکے۔

ان سب نے، سارے ملک نے ان جانبازوں کے لوٹنے کا انتظار کیا تھا۔ پورے ایک سال ان اَن جان سپاہیوں کے واپسی کے منتظر رہے تھے۔ یہی اَن جان سپاہی، جنھوں نے ان تک ایک بھی دشمن پھٹکنے نہیں دیا تھا، جنھوں نے ان کے جان و مال، ان کی عزت آبرو کی حفاظت کی تھی......مگر ان دیش واسیوں نے بھی اپنے فوجیوں کی قربانیاں یاد رکھیں۔ انھیں سراہا اور ان کے آنے کے انتظار کرتے رہے۔

اونچے برفیلے پہاڑوں پر تعیناتی، آسام کے جنگلوں میں پڑے رہنے کی مشکلات، کشمیر میں دہشت گردوں سے بھڑے رہنے کی محنت، دشمن جیل کی پریشانیاں اور ذلالتیں۔ جنگی قربانیاں۔ یہ سب منظور ہے اپنے ہم وطنوں کے لیے ان دوستوں بزرگوں عورتوں اور بچوں کے لیے جنھوں نے ان فوجیوں کو یاد رکھا، ان کی قربانیوں کی تعظیم کی۔

تھوڑی دیر میں دوشیزاؤں کی ایک ٹولی، مادرِ وطن کے گیت گاتے ہوئے وارد ہوئی۔ گلاب کی پنکھڑیاں پھینکتی اور شرم سے کچھ جھکی جھکی آنکھوں سے استقبال کرتی ہوئی......

نوجوان بھارت......مستقبل کا بھارت۔

دولت کی ہوڑ اور عوامی اقتدار کے نشے نے فوجی ملازمت کے افتخار نوجوان بھارت.......
مستقبل کا بھارت کو حقارت سے ہی چاہے کیوں نہ دیکھا ہو۔ چاہے خون اور پسینے سے حاصل کی گئی جنگی کامیابیاں گنوادی گئی ہوں۔ چاہے دشمن جیل میں ایک سال تک سڑنے کی وجہ سیاسی رہنماؤں کی پژمردگی ہی کیوں نہ رہی ہو لیکن قربانیوں، زخم اور مشکلیں جو کچھ بھی ہیں سب اپنے ملک کے لیے، ہندستان کے لیے اور ہندستانیوں کے لیے ہی تھیں۔

کیوں کہ ملک نے، ملک والوں نے اپنے فوجیوں کو آواز دی تھی......اور آئندہ بھی جب جب یہ پکاریں گے تب تب ایسا ہی ہوگا...... پھر بہت سے ہیری اور ملند، سنتا اور پرسی، وکرم اور برٹی، آدتیہ، اور تیمل منوہر اور گیری، کیمی اور شیٹی اپنے اپنے سروں پر کفن باندھ کر نکل پڑیں گے اور اپنی ایک ایک سانس مادرِ وطن کی عظمتوں کے نام کر دیں گے۔

—